پراسرار نمبر

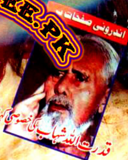
دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ

سچی کہانیاں

OCTOBER
2012



اس شمارے میں

☆ جنوں، بھوتوں، ارواح خبیثہ کی 20 سے زائد اسرار بھری کہانیاں

☆ "آتش جنوں" سلیم فاروقی کے قلم سے

☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل



آگ

کراچی کی ایک فیکٹری میں آگ لگی اور تقریباً تین سو انسان زندگی کی بازی ہار گئے۔ اس آگ میں بے شمار ماں، باپ، بہن بھائی، بیٹوں، بیٹیوں، بیویوں اور بچوں کے ارمان اور مستقبل کے لیے دیکھے خواب جل کر بھسم ہوگئے۔ بہت دنوں، مہینوں اور سالوں سے ہمیں ایک آگ کا سامنا ہے۔ ہم نفرت، تعصب، فرقہ پرستی، ظلم، بربریت، دہشت گردی کی آگ میں جل رہے ہیں اور ہمیں یہاں زمین پر اپنی حکومت، ادارے اور خود ہم سمیت بچانے والا کوئی نہیں ہے اور ''وہ'' جو تمام جہانوں کا رب ہے اسے ناراض کرنے والے کام کر رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ شکوہ بھی کہ وہ رحم کرنے میں دیر کر رہا ہے جبکہ سچی بات تو یہی ہے کہ وہ بڑا غفور الرحیم اور کریم ہے اسی لیے تو ہم اپنی تمام خطاؤں، گناہوں اور اس کی حکم عدولی کے باوجود زندہ ہیں۔ ہم پر اور گناہ گار حکم عدولی کرنے والی قوموں کی طرح اس کا عذاب نہیں آیا ہے تو پھر ہمارے حق میں بہتر تو یہی ہے کہ ہم ''سنبھل'' جائیں، سدھر جائیں ورنہ دوسری صورت میں تو اس دنیا کی ''آگ'' سے بڑی، بہت بڑی آگ ''اُس'' دنیا میں بھی ہماری منتظر ہے!!

ناصر رضا

احوال

منزہ سہام مرزا قارئین کے درمیان

عزیز احوالیو......! خوش رہیے! پچھلے کچھ دن بہت مصروف گزرے' وجہ اپنی پہلی کتاب کی اشاعت اور تقریب اجرا تھی جو اللہ کا شکر ہے' بخیر و خوبی انجام پائی۔ تقریب بہت شاندار رہی حالانکہ شہر کراچی کے حالات اُس دن بہت کشیدہ تھے مگر واہ ہے میرے تمام مہمانوں پر جو وقت پر ہال میں موجود تھے۔ فنکشن وقت پر شروع ہوا اور بہت وقت پر ختم ہوا' سب بہت اچھا رہا۔ بہر حال میں نے اپنے احوالیوں کی کمی بہت محسوس کی۔ آیئے اب پہلے خط کی طرف چلتے ہیں۔

✉ عکاشہ سحر' ملتان سے رقم طراز ہیں۔ "السلام علیکم! محترمہ منزہ صاحبہ! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ خداوند عالم آپ اور آپ سے منسلک تمام تر رشتوں کو اپنی خاص امان میں رکھے۔ (آمین!) ماہِ ستمبر کا شمارہ اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ہمراہ نظر نواز ہوا۔ احوال میں تمام دوستوں کے خطوط اچھے تھے۔ عبدالعزیز جی آ صاحب کا خط پڑھ کے مجھے بھی محفلِ دوستاں کی رونق یاد آ گئی۔ کیا اچھا اور منفرد سلسلہ تھا' بے پناہ مقبولیت کے باوجود اگر وہ سلسلہ بند کیا گیا ہے تو شاید کوئی خاص وجہ ہو۔ گزارش ہے کہ اس سلسلے کو بحال کیا جائے کیونکہ لکھاریوں کے آپس کے میل جول کا' گپ شپ کا وہی ایک سلسلہ تھا اور اس بات کا برملا اعتراف ہے کہ پہلے خطوط لکھنے کی مضبوط ترین وجہ محفلِ دوستاں ہی تھا۔ بہر حال نئے سلسلے بھی اچھے ہیں۔ راجہ محمود صاحب خصوصی مبارک باد کے مستحق ہیں' خاصا تحقیق طلب اور دشوار ترین کام ہے۔ ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ کے نام اور کام سے پہلے بھی واقفیت ہے مگر اس قدر تفصیل سے اُن کے بارے میں پڑھنا اچھا لگا۔ آگہی کا ایک لمحہ' اچھی تحریر تھی۔ عبدالعزیز جی آ کی تحریر عشق نہ پُچھے ذات' آنکھوں کو نم کر گئی۔ اس شمارے میں شامل زیادہ تر تحریریں معاشرتی مسائل سے جڑی ہوئی تھیں۔ سفر کہانی میں ارم زہرا کا سفرِ زیارات دل سے پڑھا۔ میرا اسلام اُن پاک ہستیوں پر جن کے درِ اقدس پر ارم زہرا کو حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ میں جیسے جیسے پڑھتی جا رہی تھی' آنسو ورق ورق گیلا کرتے چلے گئے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں وہاں حاضری کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ واقعۂ کربلا ایک بار پھر دل و نگاہ میں زندہ ہو گیا ہے اور اپنی محرومی کا احساس مزید گہرا ہو گیا ہے۔ آنسو ہیں کہ رکتے ہی نہیں۔ سفرِ زیارات کی روداد پڑھوں یا مکہ و مدینہ کا سفر احوال' دل کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ تہران' ایران' عراق' شام میرے دل میں بستے ہیں لیکن کربلا آنکھوں میں۔ یا ابوالفضل عباس علیہ السلام! میرا اسلام آپ پر۔ ارم زہرا' آپ سلامت رہیں' آپ کے قلم سے نکلے حرف بہت قیمتی ہیں۔ مولا توفیقات میں برکت عطا فرمائے۔ یادوں کے اوراق کا مطالعہ بھی اداس کر گیا۔ خیال آرائی میں اس بار متاثر کن خیالات تھے۔ پسند اپنی اپنی میں عرفان ستار کا شعر بہت اچھا لگا۔ وہ غزل کے بہت اعلیٰ شاعر ہیں' واہ' کیا عمدہ شعر ہے۔

وہ ایک پل ہی سہی جس میں تم میسر ہو
اُس ایک پل سے زیادہ تو زندگی بھی نہیں

تمام لکھنے والوں کو سلام! دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔"

✦ اچھی سی عکاشہ......! خوش رہو! تمہارے خط کا انتظار تھا۔ یار' کوئی نئی بات کرو۔ احوال کو ہی رنگین بناؤ' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہاں مگر دو' دو وضاحت کے خط لگانا یقیناً تم اس بات کو سمجھو گی اور پھر ذاتی طور پر مجھے خط تحریر کر کے ایک دوسرے کے بارے میں شکایت کرنا' نازیبا الزام لگانا کچھ مناسب بات تو نہیں ہے ناں؟

✉ عبدالعزیز جی آ' چکوال سے لکھتے ہیں۔ ''سچی کہانیاں'' عین عیدالفطر کی صبح ہمارے ہاتھوں میں پہنچا تو عید کی خوشی دوبالا ہوگئی۔ اتنی کوئیک سروس پر ہم آپ کو اور تمام جملہ اسٹاف کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ناصر بھائی کوزے میں دریا بند کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ کیا خوبصورت اداریہ لکھا جیسے حقیقت کی انگوٹھی میں سچا نگینہ جڑ دیا ہو۔ بھئی واہ! احوال میں شامل قارئین نے اپنی اپنی سوچ اور خیال کے مطابق بہتر سے بہتر خط لکھنے کی کوشش کی۔ تمام خطوط دل کی آنکھ سے پڑھے۔ تشنہ روح سیراب ہوئی۔ راجہ محمود صاحب' جس ملک میں مائیں پاکیزہ خیالات' تربیت یافتہ ہوں اور اچھے اخلاق و سلیقہ والی ہوں' وہاں کے انسان اختیار بیگ جیسے باعمل اور فرض شناس ہوتے ہیں۔ پلیز' اُن گمنام Genius پر بھی قلم اٹھائیں جو گدڑی میں لعل پڑے ہیں۔ سچی کہانیاں میں کہانیوں کی ابتدا آپ کی کہانی سے ہوتی ہے۔ اچھا لکھتے ہو' ویل ڈن۔ سلمیٰ غزل میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ کہانی کی تعریف میں ان کا نام ہی کافی ہے۔ آ گہی کا لمحہ' بہت پسند آئی۔ مون شاہ بخاری' میری گڑیا رانی' لفظوں کی کشیدہ کاری خوب ہے لیکن ٹانکا ابھی کچا ہے' کوشش جاری رکھو' شاباش۔ شہید کی ڈائری' منزہ' خلیل جبران کا افسانوی' اصلاحی انداز' شہید کی ڈائری مختصر مگر جامع' چھوٹی سی بات میں پنہاں بہت بڑی بات' بہت خوب' مینا تاج' نان بائی نے بالکل متاثر نہ کیا' کیا تبصرہ کروں؟ سیدہ تبسم زہرہ رضوی نے کہانی شروع سے آخر تک بڑی محنت سے لکھی۔ خدا زورِ قلم اور زیادہ کرے۔ شہلا سراج' ایمان کو تازہ کرنے والی کتھا زبردست رہی' ویل ڈن۔ عشق نہ پچھے ذات' ناصر بھائی' بہت مشکور ہوں آپ نے مجھ حقیر و فقیر کو اس قابل سمجھا کہ مدتوں بعد اپنی کسی داستان کو ان صفحات پر پایا۔ آپ کی محبت میرے لیے تختِ سلیمان سے بڑھ کر سعید و عظیم ہے۔ کہانی میں صفحہ نمبر 129 پر کتابت کی غلطی درست فرمالیں۔ ''کہتا تھا' رختو' تو بھابھی ہی نہیں' میری چھوٹی بہن ہے۔'' رختو کی جگہ فجلی پڑھا جائے' شکریہ۔ قرۃ العین زینب' سچی کہانیاں میں واپسی وہ بھی ایک خوبصورت سبق آموز کہانی کے ساتھ' بہت اچھا لگا۔ سچ بتاؤں تو احوال کی محفل میں اپنے پرانے ساتھیوں کو پاکر ضبط کا یارا نہ رہا۔ ایامِ رفتہ کی یادوں نے اشکبار کردیا۔ دُعا ہے' قلم کی ریاضت آپ کو نیلے آسمان پہ چمکتا ہوا ستارہ بنادے۔ پلیز' اب غیر حاضری نہ کرنا۔ نذیر لغاری کی کہانی پڑھ کر دکھی ہوگیا۔ اولاد کا دکھ ہر صاحب اولاد کے لیے سانجھا ہوتا ہے۔ اللہ بچوں کی مغفرت فرمائے اور آپ سب اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین!) حنیف سحر صاحب' آپ میرے فیورٹ رائٹر ہیں۔ کہانی کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کوشش کیجیے' قسط وار کہانیوں کی بجائے یک نشستی تحریریں لکھیں۔ خلیل جبار' جن کے اپنے ذہن پراگندہ ہوتے ہیں' وہ دوسروں کو بھی غلط سمجھتے ہیں۔ اللہ ہمیں اچھی سوچ اور فکر عطا فرمائے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق بھی۔ کہانی خوب ہے' جیتے رہو۔ ثمینہ یاسمین' پراسرار کہانی پڑھ کر ہم اصرار کرتے ہیں کہ جن بھوتوں کو اپنی دنیا میں سکون سے رہنے دو۔ اس چار روزہ حقیقی زندگی پر کچھ لکھو کہ یاد رہے۔ ارم زہرا' سچ بتاؤں تو آپ ایک تاریخ رقم کررہی ہیں۔ کبھی آپ کورنگی کی وسیع آبادیوں میں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے محوِ سفر ہیں اور کبھی اورنگی ٹاؤن' کٹی پہاڑی کی وحشتوں میں سچائیوں کی تلاش میں سرگرداں۔ وقت کی قدر کرنے والے لوگ مجھے بہت پسند ہیں۔ ایدھی ہوم سے جو کہانی آپ نے ہماری بصارتوں کی نذر کی' ہر لحاظ سے پسندیدہ و اعلیٰ ہے۔ جیتی رہو۔ اقبال زمان صاحب' جرم و سزا پہ مبنی کہانیوں کا سلسلہ اچھا جارہا ہے' گڈ۔ عزت مآب رخسانہ سہام مرزا صاحبہ' محبت' عقیدت اور عظمتوں کے جذبوں میں گندھی ہوئی داستانِ حیات کی تیسری قسط بھی بہت پسند آئی۔ دوستوں اور رفیقوں کی جدائی سوہانِ روح ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کو بچھڑے ایک مدت ہوئی لیکن آپ کی کہانی کے لفظ لفظ سے حزن و ملال جھلکتا ہے۔ چوتھی قسط کا انتظار ہے۔ آپ کی ڈائری' خیال آرائی' نظم' غزل اور آخر میں ہماری رائٹر ساتھی عکاشہ سحر کا کتابی تبصرہ سب کے لیے بہت پیار' محبت اور خلوص اس لیے کہ خط واقعی بہت طویل ہوگیا ہے۔ جاتے جاتے ایک ٹپ سب کی نذر۔ دو دن کی زندگی ہے' اسے دو ہی اصولوں پہ گزارو۔ ''رہو تو پھولوں کی طرح' بکھرو تو خوشبو کی طرح۔'' نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت نامہ بند کرتا ہوں۔ ہر یاد کرنے والے کو میرا سلام!''

بھائی عزیز......! درست کہتے ہیں' رہو تو پھولوں کی طرح' بکھرو تو خوشبو کی طرح' زندگی واقعی میں دو دن کی ہے۔

✉ قرۃ العین زینب' ملتان سے رقم طراز ہیں۔ ''اچھی منزہ جی' السلام علیکم! پوری امید ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گی۔ اس بار کی عید ماشاء اللہ' بہت ساری خوشیاں لائی اور سچی کہانیاں میں اپنی کہانی دیکھ کر خوشیاں دوگنی ہوگئیں۔ ٹائٹل

اچھا تھا اور بالکل عید کی مناسبت سے تھا۔ احوال سے پہلے پراسرار کہانی نمبر 11 کا اشتہار دیکھا' اب اس کا انتظار ہے۔ احوال میں پرانے لکھاریوں کو دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ عبدالرؤف عدم بھائی' عمران مظہر' عبدالعزیز بھائی' آپ سب کا شکریہ کہ آپ نے یاد رکھا۔ اللہ آپ کو صحت و خوشیاں عطا کرے۔ (آمین!) اور باقی پرانے رائٹرز سے بھی گزارش ہے کہ

رنجش ہی سہی' دل ہی دکھانے کے لیے آ

آگے کچھ نہیں کہوں گی کہ چھوڑ کر جانا وفاداروں کا شیوہ نہیں۔ یہ جو نیا ایک سلسلہ شروع کیا ہے کہ زندہ اہم شخصیات کی زندگی کے واقعات اور کہانیاں بیان کی جائیں' بہت اچھا ہے کیونکہ پذیرائی کی ضرورت زندہ انسانوں کو بھی ہے مگر ہم نے اس کو صرف خالقِ حقیقی سے جا ملنے والوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے مگر ایک چیز جو میں بہ ذاتِ خود بہت miss کرتی ہوں' وہ منورہ نوری خلیق کی تحریریں ہیں۔ اُن کی دینی و اصلاحی تحریر پڑھ کر رسالے کی باقی کہانیوں کی ابتدا کرنا میری تو عادت بن گئی تھی۔ کبھی کبھار اُن کی تحریر کو بھی جگہ دے دیا کریں تو بہت اچھا ہوگا۔ آگہی کا ایک لمحہ' کہانی کم اور ناولٹ زیادہ لگا۔ یہ سچی کہانیاں کا مزاج تو نہیں تھا؟ میری گڑیا رانی' اچھی کہانی تھی۔ اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہے کوئی عورت' سوچ کر ہی ڈر لگا۔ شہید کی ڈائری پڑھ کر ایک بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اگر ماں باشعور ہو تو پھر اس کی گود سے ہیرے نکلتے ہیں اور بچوں کے لیے ماں کی باتیں مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہیں۔ سڑک کہانی بہت زبردست سلسلہ ہے۔ نان بائی' موچی' خاکروب وغیرہ ایسے لوگ ہیں جن سے بعض جہلا کا بڑا تحکمانہ انداز گفتگو ہوتا ہے حالانکہ محنت کر کے کمانے والے سے افضل شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ آتشِ جنوں اور جن آنکھوں میں خواب بسے تھے' دونوں سلسلے ہی زبردست جا رہے ہیں۔ لونگ چڑے' پڑھ کر احساس ہو گیا کہ مال بہت بڑی آزمائش ہے' دماغ' دل' جذبات سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور سازشیں اور خود غرضی سانپ کی طرح پھن پھیلا لیتی ہے۔ اللہ کے دوست' بہت اچھی کہانی تھی' نیک نیت والوں کی اللہ ضرور مدد کرتا ہے۔ عشق نہ پچھے ذات' تکونی پیار کی کہانی تھی اور انجام بھی روایتی محبت کی داستانوں جیسا ہی تھا۔ بہر حال انداز بیاں اچھا تھا۔ باقی کچھ کہانیاں رہ گئی ہیں۔ عکاشہ سحر کے تبصرے بہت سیر حاصل اور اچھے ہوتے ہیں۔ اب اجازت چاہوں گی' کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ آپ سب کی صحت و خوشیوں کے لیے ڈھیر ساری دُعائیں۔ اس شعر کے ساتھ اجازت مطلوب ہے۔

یقیں اس کو نہیں آتا' وضاحت ہم نہیں کرتے
گزر جائے گی ساری عمر شاید امتحانوں میں"

٭ قرۃ العین زینب! یار' شعر بہت اچھا ہے اور ہم اسی بات کے قائل بھی ہیں جب وضاحتیں ہی دینا ٹھہرا تو پھر رشتہ کیسا؟ باقی تمہیں کہانیاں پسند آئیں' ہماری محنت وصول ہوئی۔

✉ تاثیر حیدری' بہاول پور سے لکھتے ہیں۔ "محترمہ منزہ سہام مرزا صاحبہ! السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں گی۔ یہ احوال میں میرا دوسرا خط ہے' پہلا خط چند دن قبل ارسال کر چکا ہوں مگر غلطی سے کوپن ارسال کرنا بھول گیا۔ موجودہ خط کوپن کے ہمراہ ارسالِ خدمت ہے۔ امید واثق ہے کہ احوال میں ضرور جگہ ملے گی۔ گزشتہ کئی سال سے سچی کہانیاں کا خاموش قاری ہوں۔ پاپولر فکشن نے ہمارے ملک میں اپنا ایک وسیع حلقہ اثر قائم کر رکھا ہے۔ سچی کہانیاں ایک منفرد اور نرالی شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ نوجوان رائٹرز کی تحریروں سے آراستہ یہ رسالہ قارئین کا ایک محبوب ترین پرچہ ہے۔ اکثر نئے نئے ادبی دنیا میں قدم رکھنے والے لکھاریوں کو سب سے بڑی شکایت ہی یہی ہوتی ہے کہ ان کو لفٹ نہیں کرائی جاتی اور یوں وہ اپنی صلاحیتوں کے مناسب اظہار سے محروم رہتے ہوئے گمنامی کی دلدل میں اتر جاتے ہیں۔ لائقِ صد ستائش ہے آپ کے والد گرامی کا جذبہ کہ جنہوں نے رسالے کے خود ساختہ معیار کو قربان کرتے ہوئے نوجوانوں اور نئے رائٹرز کو آگے آنے کا موقع دیا اور پھر چشمِ فلک نے بہت حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ معیار کا خیال رکھ کر نئے لکھاریوں کو نظر انداز کرنے والے منہ دیکھتے رہ گئے اور سچی کہانیاں نے اپنا منفرد مقام بنا لیا جو خود ساختہ معیار سے بدرجہا بہتر تھا جس پر قارئین کی محبوبیت کی مہر ثبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں اپنی سلور جوبلی پوری کر چکا ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت کی خوشبو پھیلتی ہی چلی جا رہی ہے۔ آپ کے والد جو

یادگار چھوڑ گئے تھے اس کو ان کی لائق اولاد نے بحسن وخوبی سنبھالا اور آگے بڑھایا۔ یہ چند جملے میرے سچے جذبات کے عکاس ہیں۔ اللہ کرے زورِ سخن اور زیادہ۔ میں بھی لکھنے لکھانے کی علت کا شکار ہوں' بچوں کی کہانیاں اور اخباری کالم لکھتا رہا ہوں لیکن کسی ڈائجسٹ میں طبع آزمائی کی کبھی ہمت نہ ہوئی کہ نئے لکھنے والوں کو گھاس ہی کب ڈالی جاتی ہے۔ میرا یہ خوف بہت عرصہ مجھ پر غالب رہا اور میں نے سچی کہانیاں میں بھی کوئی تحریر بھیجنے کی کوئی کاوش کبھی نہ کی لیکن نجانے کیسے اس بار ہمت کر کے آپ کو مخاطب کرتے ہوئی خاموشی کا قفل توڑ ڈالا ہے۔ اب پتہ نہیں کیا رسپانس ملتا ہے؟ اب آتے ہیں سچی کہانیاں کے مستقل سلسلوں کی جانب۔ میری نظر میں اس رسالہ کی جان احوال کی محفل ہے جس میں مختلف قارئین اپنی اپنی آراء کا پوری آزادی کے ساتھ اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں اور یہ دیکھ کر تو اور بھی خوشی ملتی ہے کہ یہ محفل تہذیب و تمدن کا شاہکار دکھائی دیتی ہے اور اس میں اخلاقی قدروں کی پوری طرح پاسداری کی جاتی ہے۔ ماشاء اللہ! دیگر سلسلوں میں ناقابلِ یقین کہانیاں' مسئلہ یہ ہے' پسند اپنی اپنی' زندہ کہانی' تبصرہ اور تذکرہ' موبائل کہانی بھی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ آج کل سچی کہانیاں میں چار سلسلہ وار کہانیاں شائع ہو رہی ہیں جو کہ میرے خیال میں نامناسب بات ہے۔ ہر شمارے میں دو سلسلہ وار ناول اور دو مکمل ناول شامل ہونے چاہئیں اور باقی جگہ ناولٹ' افسانوں اور دیگر سلسلوں کے لیے ہونی چاہیے۔ ہومیو کلینک کا سلسلہ بھی شروع ہونا چاہیے۔ زندہ کہانی کا سلسلہ نہایت شاندار ہے جس میں اہم شخصیات اور کامیاب لوگوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کو جاری رہنا چاہیے۔ میری خواہش ہے کہ ادارہ کو قارئین کی طرف سے جو کہانیاں موصول ہوتی ہیں' ان کا نام اور ماہ اشاعت ضرور تحریر کر دیا کریں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ ان کی کہانی کب شائع ہوگی اور قابلِ اشاعت ہے بھی یا نہیں؟ انعامی کہانیوں کا سلسلہ بہت لاجواب ہے۔ یہ لکھاریوں کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنتا ہے۔ میری ایک تجویز یہ بھی ہے کہ جس بھی لکھاری کی تحریر رسالہ میں شائع ہو' اسے اس ماہ کا شمارہ اعزازی طور پر ارسال کیا جائے۔ ہر ماہ کم از کم ایک کہانی مزاحیہ طرز کی ضرور شامل کی جائے تاکہ شمارہ ورسٹائل نظر آئے۔ ہر ماہ کسی لکھاری کا تعارف اور سوال و جواب کا سلسلہ بھی جاری کیا جائے جو پہلے سچی کہانیاں میں ہوا کرتا تھا۔ ایک سلسلہ پیغام کے نام سے شروع کیا جائے جس میں قارئین ایک دوسرے سے حال چال پوچھ سکیں اور آپس میں ایک قلمی رشتہ قائم کر پائیں جو اسی رسالے کے اسی سلسلہ کی معرفت ہو۔ حاصلِ مطالعہ کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا جائے جس میں قارئین مختلف کتابوں سے اپنی پسند کے اقتباسات ارسال کر سکیں۔ ان چند تجاویز کے ساتھ ہی اب آتے ہیں اس ماہ کے شمارہ کی طرف' ابھی منی میگ اور اسرارِ پاکستان (ممتاز مفتی) ہی پڑھ پایا ہوں۔ ابھی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ 12 تاریخ کو شمارہ ملا ہے۔ (کیونکہ ہمارے شہر میں نہیں آتا۔ بہاول پور سے منگوانے میں دیر ہو گئی۔) نہیں جانتا کہ خط کس تاریخ تک بھجوا دینا ضروری ہوتا ہے؟ اس لیے فوری طور پر تبصرہ بھجوا رہا ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ ماہ سے مکمل تبصرہ بھیجا کروں گا۔ پیاری بہن! ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ کوئی تحریر اگر بھیجی جائے تو وہ کتنے عرصہ میں شائع ہو جاتی ہے؟ جیسا کہ شروع میں ذکر کر چکا ہوں کہ مجھے بھی لکھنے کا شوق ہے تو کیا آپ میری تحریروں کو اپنے شمارہ میں جگہ دیں گی؟ اپنی پہلی تحریر چارہ دل سوائے صبر نہیں' جلد ہی ارسال کر دوں گا۔ اگر آپ نے حوصلہ افزائی کی تو انشاء اللہ' یہ سلسلہ ضرور بالضرور جاری رکھوں گا۔ اب بال آپ کے کورٹ میں ہے۔ نجانے آپ میری تحریروں سے کیا سلوک کرتی ہیں؟ آپ کے ادارے کے اسٹاف اور قارئین کو سلام اور دُعا!''

بھائی تاثیر......! خوش رہیے! آپ کی تجاویز پر ضرور غور کریں گے۔ کچھ پر تو پہلے ہی سے عمل ہو رہا ہے۔ کہانی ضرور لکھیے' اب یہ آپ کے ناصر بھائی پر منحصر ہے کہ وہ کب آپ کو شمارے میں جگہ دیں۔

✉ ام مناہل' ایبٹ آباد سے تحریر کرتی ہیں۔ ''پیاری منزہ باجی! السلام علیکم! بہت عرصے بعد احوال میں حاضر ہو رہی ہوں۔ امید ہے' سب خیریت ہوگی۔ رخسانہ آنٹی کی زندگی کے حالات بدستور موصول ہو رہے ہیں۔ بچپن کی بہت پیاری باتوں کو یادوں کی صورت میں جان کر اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے جو کہ رخسانہ آنٹی کے بچپن کی طرح تو نہ تھا مگر آج کے دور کے حساب سے بہت اچھا تھا۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد پاک ہے۔ ''ہر آنے والا دور' جانے والے دور کے مقابلے میں بدتر ہوگا۔'' ہمارے بچوں کا دور' ہمارے مقابلے میں ہمارا دور' ہمارے والدین کے مقابلے میں بدتر ہے۔ شہید کی ڈائری پڑھ کر

کانچ کی عورت



منزہ سہام مرزا تقریب کے صدر مرزا اختیار بیگ کو اپنی کتاب پیش کرتے ہوئے، تقریب کے مہمانِ خصوصی مسعود حامد اور سردار مقبول زمان کو آرڈی نیٹر وزیرِ اعظم آزاد کشمیر ساتھ موجود ہیں

گزشتہ دنوں پرل کانٹی نینٹل کے کانفرنس ہال میں ادارہ پرل پبلی کیشنز کی مدیرہ اعلیٰ منزہ سہام مرزا کے پہلے افسانوی مجموعے کی نہایت شاندار تقریب اجرا منعقد ہوئی، جس کی صدارت محترم ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ (وفاقی مشیر برائے ٹیکسٹائل حکومت پاکستان) نے کی۔ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی محترم مسعود حامد جنرل سیکریٹری A.P.N.S تھے، جب کہ تقریب کی نظامت کے فرائض وسعت اللہ صاحب نے انجام دیے۔ اس تقریب میں شہر کراچی کی معروف ادبی اور سماجی شخصیات نے شرکت کی...... اس تقریب اجرا کی دلچسپ تصویری رپورٹ ماہنامہ ''دوشیزہ'' کے شمارہ اکتوبر میں شائل ہوگی۔



منزہ سہام، مسعود حامد، ڈاکٹر اختیار بیگ اور سلیم بٹ آزاد کشمیر کے وزیر برائے کھیل، امور نوجوانان وثقافت خوشگوار موڈ میں



صاحب کتاب کا مہمانوں کے ساتھ ایک یادگار گروپ

احساس ہوتا ہے‘ ہماری افواج میں آج بھی وہی جذبہ ہے جو 1965ء میں تھا چاہے وہ گیاری ہو‘ سیاچن یا پھر کارگل کا محاذ۔ ہماری تازہ دم افواج ہر موقع پر اپنی جان نثار کرتی رہی ہے مگر شاید ان کی قربانیوں کو عوام دل سے قبول کرنا بھول چکے ہیں کیونکہ عوام میں نہ ہی 65ء والا جذبہ ہے نہ 47ء والا جوش۔ راجہ محمود اور ارم زہرا‘ منورہ آنٹی کے بعد وہ رائٹر ہیں جن کی کہانیاں تقریباً ہر شمارے میں نظر آتی ہیں۔ اس حسنِ کارکردگی پر تو انہیں ڈبل ایوارڈ ملنا چاہیے‘ ایک ایوارڈ اچھی کہانیوں پر اور ایک مسلسل کہانیوں پر کیونکہ راجہ محمود کے پاس بہت پرانی معلومات کا خزانہ ہے اور ارم زہرا جیسی ایک لڑکی کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر حساس علاقوں سے معلومات جمع کرنا اور پھر مہینے کے اندر کہانی لکھنا آسان بات نہیں۔ آپ کو ایک کہانی بھیج رہی ہوں‘ پڑھ کر بتایئے گا‘ کیسی ہے؟‘‘

٭ام مناہل! تمہاری تحریر تمہارے نام کی طرح خوبصورت ہے۔ احوال میں آتی رہا کرو۔

☒ اشفاق احمد عباسی‘ کراچی سے لکھتے ہیں۔ ’’پیاری منزہ بجو……! آداب! میں سچی کہانیاں کا ایک پرانا احوالی ہوں‘ شاید ہی آپ کو یاد ہوں۔ کافی طویل عرصے کے بعد احوال کی محفل میں حاضر خدمت ہوں۔ ستمبر کا شمارہ عید کے ٹھیک ایک ہفتے بعد ملا‘ سرورق پر نظر پڑی۔ محترمہ کی آنکھوں میں کافی غرور دکھائی دیا۔ احوال میں آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے مگر ناصر بھائی اور ان کا پیار بھلائے نہیں بھولتا۔ آپ سے بھی امید ہے کہ اسی خلوص سے نوازیں گی۔ آپ بھی احوال کی محفل خوب جما رہی ہیں۔ اللہ آپ کو صحت وتندرستی عطا کرے۔ آپ کی کتاب کا بے صبری سے انتظار ہے۔ امید ہے کہ اس تحفے سے جلد نوازیں گی۔ اب آتے ہیں شمارے کی طرف‘ سب سے پہلے ناصر بھائی کا اداریہ حقیقت پڑھا جو لکھا‘ بالکل ٹھیک لکھا۔ یہ سب موجودہ دور کی عکاسی ہے۔ احوال کی محفل میں سب کو سلام بالخصوص ہمارے پرانے ساتھی جن میں تحسین جونیجو‘ اشعر بھائی‘ صفیہ کنول شاہ‘ عبدالرؤف عدم اور عبدالعزیز جی آ‘ تحاریر میں سب سے پہلے راجہ محمود صاحب کی تحریر پڑھی۔ انہوں نے ڈاکٹر اختیار بیگ کے سفرِ زندگی کا احوال خوب لکھا پھر سلمٰی صاحبہ کی تحریر آگہی کا لمحہ‘ نظر سے گزری جس پر ہماری رائے تو یہی کہتی ہے کہ عائزہ نے ٹھیک فیصلہ کیا آریان کے ساتھ سفرِ زندگی دوبارہ جوڑ کر۔ آپ کے قلم سے رقم شہید کی کہانی کا اگلا سلسلہ پڑھا‘ بہت خوب لکھا آپ نے۔ مینا صاحبہ‘ مون شاہ بخاری اور ظہیر مرزا کی تحریریں شاندار تھیں۔ شہلا سراج کی تحریر اللہ کے دوست بہت پسند آئی۔ بے شک اللہ اپنے نیک بندوں کے صدقے معجزے ضرور دکھاتا ہے اور یہی نعیم صاحب کو مذہب کی جانب راغب کرنے کا ذریعہ بنا۔ عبدالعزیز جی آ کی تحریر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ انہوں نے بڑے خوبصورت انداز سے ظالم سماج کی بھینٹ چڑھنے والے دو پریمیوں کی کتھا لکھی۔ قرۃ العین آپی ایک اچھے موضوع پر سچی کہانی لے کر آئیں۔ اس سے وہ لوگ استفادہ حاصل کر سکتے ہیں جو کہ محض صرف افواہ پر کان دھر کے اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہیں لیکن اس کے برعکس ملائکہ کی پاکبازی اور بے گناہی نے اس کے کچے کان کے شکی شوہر کو ہرا دیا اور اس منافق شخص کو بھی اس کے کیے کی سزا ملی۔ ثمینہ یاسمین کی تحریر ٹیڑھی انگلی نے ڈرا دیا لیکن کہانی بہت خوب تھی۔ سر خلیل جبار ایک نادان عورت کی موبائل کہانی لے کر آئے جس نے محض اپنی بے وقوفی اور نادانی کے سبب سب کچھ کھو دیا۔ عندلیب سلمٰی کی تحریر بھی زبردست رہی۔ نذیر لغاری اور اقبال زمان کی تحریریں پڑھی۔ انہوں نے جو واقعات تحریر کیے‘ یہ تو ہمارے ملک میں روز کا معمول ہیں جن کو حل کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ رخسانہ آنٹی کا لکھا یادوں کے اوراق بہت زبردست جا رہا ہے۔ سلسلہ وار کہانیوں میں حنیف سحر‘ فاطمہ بلگرامی اور سلیم فاروقی کی تحریریں زبردست جا رہی ہیں۔ شازلی صاحبہ‘ ناشون کی اسراریت کب ختم ہوگی؟ منزہ آپی‘ قارئین کے لیے منی میگ کا سلسلہ بہت خوب ہے۔ ایک تحریر ارسال کی ہے‘ کیسی لگی‘ ضرور بتایئے گا۔ اجازت اس دُعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی ٹیم کو مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ آخر میں ناصر بھائی اور کاشی بھائی کو بہت بہت سلام۔‘‘

٭اشفاق بھائی! احوال میں ویل کم۔ آپ نے ہم سب کو یاد رکھا اور پھر محبت سے خط لکھا‘ شکریہ۔ شمارہ اچھا لگا‘ ہمیں یہ جان کر اچھا لگا۔ آیندہ بھی آتے رہیے گا۔

☒ رضوانہ کوثر‘ لاہور سے تحریر کرتی ہیں۔ ’’پیاری منزہ! سدا خوش رہو! ستمبر کا سچی کہانیاں ملا‘ سرورق اچھا ہے۔ اشتہارات سے تیز قدموں سے گزرے۔ کانچ کی عورت سے تصور میں ملاقات کی آپ کو مبارکباد دیتے ہوئے۔ ناصر

رضا کے اداریے نے دل و دماغ دونوں پر اثر کیا۔ احوال میں تبصروں کے ساتھ ساتھیوں کی خیریت سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے اور اب آپ کی خبر کے ذریعے سے بھی۔ رابعہ محمود کا مشہور شخصیات سے جڑا سلسلہ بہترین ہے۔ سلسلے وار کہانیوں کے لیے میری بھی وہی رائے ہے جو عبدالعزیز جی آ کی ہے۔ منزہ سہام کی شہید کی ڈائری اور رخسانہ بھابھی کی یادوں کے اوراق پسندیدہ ہیں۔ قرۃ العین زینب کی کہانی الجھا ہوا سا مجھ میں معاشرے کی حقیقتوں کے در کھولتی نظر آئی۔ مون شاہ بخاری نے سوتیلی ماں کے ظلم کا نتیجہ قتل تک سے گریز نہ کیا۔ تبسم زہرہ اور جب چھپر پھٹا' اللہ کے کرم اور نوازنے کا ثبوت جو نامساعد حالات میں صبر کے گھونٹ پینے والی عورت نے دکھ جھیلنے کا انعام پایا۔ خلیل جبار کی انجام یہی ہونا تھا' اہم موضوع پر بہترین موبائل کہانی تھی۔ ارم زہرا بہترین موضوعات پر حقیقی واقعات ہم تک پہنچاتی ہیں۔ بہت خوب ارم' یہ دلچسپ اور بہترین سلسلہ ہے اور آپ کا زیارات کا سفر بھی خوب رہا۔ ظہیر مرزا کی لونگ چڑے' شہلا سراج کی اللہ کے دوست' عبدالعزیز جی آ کی عشق نہ پچھے ذات' عندلیب سلمٰی کی اب حوصلہ نہیں رہا۔ نذیر لغاری' ثمینہ یاسمین' اقبال زمان' سلمٰی غزل' سب نے تقریباً اچھا لکھا۔ تلخ سچائیوں سے پردہ اٹھایا۔ مینا نے نان بائی لکھ کر' عکاشہ سحر شعراء کو بڑی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے لکھ اور نبھا رہی ہیں۔ غزلیں بھی معیاری تھیں۔ علی رضا عمرانی کے والد کا دلی دکھ ہوا۔ اللہ' عبدالعزیز بھائی کو صحت سے نوازے اور احمد واصفی کے والد کے لیے دعائیں۔ انور فرہاد' فریدہ خانم' فریدہ جاوید فری' احمد واصفی' عنبرین حسیب' ناہید شیروانی' رضا جعفری کو کتابوں کی اشاعت پر' سویرا فلک کو بیٹی کی مبارک ہو۔ ایڈیسن' اللہ آپ کو مکمل صحت دے۔ سب ساتھیوں کے لیے دعائیں۔ بھائی ناصر رضا' دانیال' بشریٰ حفیظ' عاتکہ حفیظ' رامیس اور عبدالرحمان' کاشی' آپ سب کو اکتوبر میں میری دلی دعاؤں کے ساتھ سالگرہ مبارک۔ اللہ سب کو خوش رکھے۔ (آمین!) نوٹ۔ ناصر بھائی' بانو قدسیہ والے مختصر مکالمے اور میری غزل کا کیا ہوا؟''

٭ ڈیئر رضوانہ! دانیال تو بہت حیران ہوا کہ آپ کو اس کی سالگرہ یاد ہے۔ شکریہ کہہ رہا ہے۔ ناصر بھائی سے فون کر کے ذرا دو دو ہاتھ کرلیں۔ ابھی تو کھڑکی کے پاس کھڑے بارش سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

✉ مور شاہد حسین وفا' کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''ہر دلعزیز آنٹی منزہ سہام' سلام قبول ہو۔ دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کو' سچی کہانیاں کی پوری ٹیم' سارے لکھاریوں اور قارئین حضرات کو ہر آئے دن کامیابی عطا فرمائے۔ (آمین!) اگست کا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ اپنی شاعری ''سچی کہانیاں'' کے اوراق پر دیکھی' بہت بہت شکریہ۔ کچھ دنوں سے میری طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے جس کی وجہ سے شمارہ بہت مختصر پڑھا ہے۔ التجا ہے کہ میری مکمل صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ سچی کہانیاں کی جتنی تعریف کریں' اتنی ہی کم ہے۔ سچی کہانیاں میں شامل تمام کہانیاں حقیقت کا عکس ہیں جن سے بہت اچھا سبق ملتا ہے۔ شہید کی ڈائری بہت بہت اچھا سلسلہ ہے' باقی تمام سلسلے اور کہانیاں بھی بے حد پسند ہیں۔ اشعر جواد' شعبان کھوسہ' محمد راشد فرہاد' غیاث الدین غیاث' شاہد فراز' صفیہ سلطانہ مغل' ارشد علی ارشد' علی شاہ' ادریس کاوش' انکل فہیم اور ارم زہرا کی شاعری بہت پسند آئی۔ خاص طور پر شعبان کھوسہ اور شاہد فراز کی نظم۔ شاہد فراز بھائی' کیسے ہو؟ آنٹی' آپ نے پچھلے ماہ بتایا تھا کہ میری کہانی دو تین ماہ میں شائع ہوگی۔ میری موبائل کہانی کیسی ہے؟ میری دونوں کہانیاں کب شائع ہوں گی' پلیز' بتا دیجیے گا۔ بے چینی سے منتظر ہوں۔ اب اجازت اس دعا کے ساتھ۔ یا اللہ! پوری دنیا میں جتنے بھی مسلمان بیمار ہیں' پریشان ہیں' ان کو اپنے فضل و کرم سے شفا اور آسانی عطا فرما۔ (آمین!)''

٭ بھائی وفا! اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ اپنا خیال رکھا کریں۔ کہانیوں کے بارے میں ناصر بھائی سے پوچھا تھا' جواباً بولے۔ ''جلد چھپیں گی۔'' بس اس سے زیادہ پوچھنے کی ہماری بھی ہمت نہ تھی۔ کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔

✉ عائشہ خورشید' کراچی سے تحریر کرتی ہیں۔ ''پیاری آپی! آداب! ستمبر کا شمارہ شدت کے انتظار کے بعد ہاتھ آیا۔ احوال میں اپنا خط پا کر دل باغ باغ ہوگیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ' رسالہ میری نظر میں شروع سے اچھا ہے اور اچھا رہے گا کیونکہ یہی ایک رسالہ میرے زیر مطالعہ رہتا ہے اس لیے میرا اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سب لکھنے والے میرے پسندیدہ ہیں۔ منورہ نوری خلیق صاحبہ کا سلسلہ کہانی پھر شروع کریں اور جن بھوتوں والا سلسلہ بھی بند مت کیجیے گا۔''

٭ پیاری عائشہ! تمہاری خواہش کے باوجود ہم منورہ نوری کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکے۔ پچھلے دنوں میری بہت ہی

پیاری آنٹی خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں کہ میں اپنا دکھ بیان کرسکوں۔ دوشیزہ پہلی بار 73ء میں شائع ہوا اور تب سے منورہ آنٹی سے ادارے کا تعلق تھا۔ میں بھی انہیں اپنے بچپن سے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ نہیں ہیں، بہت عجیب لگ رہا ہے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین!)

✉ فرحت صدیقی، لاہور سے رقم طراز ہیں۔ ”پیاری منزہ سہام مرزا! السلام علیکم! اللہ کرے، خیریت سے ملو۔ کل پاکستان واپس آئی ہوں۔ ایک سچی کہانی لندن میں لکھی تھی۔ سچی کہانیاں کے لیے بھیج رہی ہوں۔ امید ہے، پسند آئے گی۔ میری طرف سے سب کو آداب!“

✍ بہت ہی پیاری فرحت! کہانی اچھی ہے، جلد شائع ہوگی۔ آپ بتایئے، آپ کیسی ہیں؟ بہت دنوں میں خط لکھتی ہیں اور وہ بھی اس قدر مختصر۔

✉ صفیہ نگل شاہ، لاہور سے تحریر کرتی ہیں۔ ”السلام علیکم! منزہ آپی! کیسی ہیں آپ؟ امید ہے کہ آپ اور تمام اہلِ ادارہ عافیت سے ہوں گے۔ آپ سب کی صحت وسلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ منزہ آپی! پہلی بار آپ سے مخاطب ہوں مگر سچی کہانیاں میرے لیے نیا نہیں۔ میری حاضری خطوط و کہانیوں کی صورت اس میں باقاعدہ لگتی رہی ہے۔ ہاں، درمیان میں تھوڑا وقفہ آ گیا جس کی وجہ میرے امتحانات تھے مگر اب پہلے کی طرح ریگولر رہنے کا پکا ارادہ ہے۔ ”سچی کہانیاں“ میں بہت سی تبدیلیاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ اس بار ٹائٹل بس کام چلاؤ تھا۔ ناصر انکل کی ”حقیقت“ سے آشنا ہوتے ہوئے حال احوال معلوم کرنے پہنچی۔ عبدالرؤف عدم، تحسین جو۔نجو، عمران مظہر اور خلیل جبار کے تبصرہ جات اچھے تھے۔ اسی طرح تاثیر حیدری کا خط بھی پسند آیا، خصوصی خط کسی بھرپور تبصرہ والے خط کو ہونا چاہیے جیسے اس بار خلیل جبار کا تھا۔ شگفتہ شفیق، رضوانہ کوثر اور نسیم نیازی کو بہت سلام۔ عبدالرؤف آپ نے پکارا اور میں چلی آئی۔ اتنے ماہ بعد بھی یاد رکھنے کا شکریہ۔ عبدالعزیز جی آ انکل کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔ کہانیوں میں آگہی کا ایک لمحہ میں سلمیٰ غزل نے ایک حقیقی کہانی کو افسانوی رنگ میں کامیابی سے پیش کیا۔ اختتام منطقی تھا۔ سلسلے وار کہانیاں بھی دلچسپ اور بہترین ہیں۔ تاشون ہمیشہ میں شوق سے پڑھتی ہوں۔ علمِ اسرار کے بارے میں جاننا مجھے ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ جن آنکھوں میں خواب بسے تھے، اور آتشِ جنوں سسپنس اور تجسس سے بھرپور اچھے سلسلے ہیں۔ موبائل کہانی یہی انجام ہونا تھا، اس ایجاد سے جڑی معاشرے کے مخصوص ناسور پر نشتر لگاتی خلیل جبار کی اچھی تحریر تھی۔ پلاٹ کی عمدہ بُنت کے ساتھ ساتھ اختر کے دہرے منافقہ کردار کو خوبصورتی سے اجاگر کیا گیا۔ عشق نہ پوچھے ذات، رومانوی فلموں کا عکس لگی جو روایتی عشق، معشوق اور سماج کی مثلث پر مشتمل ہے۔ جی آ انکل نے فطری مناظر کو شاعرانہ رنگ میں خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اب حوصلہ نہیں رہا، عندلیب کلیمی کی تحریر دکھی کرگئی۔ اس دہشت گردی کی آگ نے کتنے ہی پہاڑ صفت حوصلوں کو شکست خوردہ بنا دیا ہے۔ فسانۂ زندگی کے حقیقی کرداروں سے روشناس کرواتا سلسلہ سڑک کہانی قابلِ قدر اضافہ ہے۔ قرۃ العین زینب کی تحریر الجھا ہوا سا مجھ میں، ہمارے معاشرے کے ایک خاموش زہریلے رویئے بہتان طرازی پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ ایسی پوشیدہ چنگاری ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے گھروں کو جلا کر خاکستر کردیتی ہے۔ مناسب لفظوں کا انتخاب ان کی تحریروں کو پختگی عطا کرتا ہے۔ ارم زہرا میرے شہر کی کہانی میں ہمیشہ منفرد اور تلخ حقیقتوں کو شکر میں لپیٹ کر لاتی ہیں۔ ان کا اسلوب ان کی تحریروں کی جان ہوتا ہے اور یہی رنگ سفرِ زیارات میں بھی نظر آتا ہے۔ میڑھی انگلی بھی عمدہ کاوش رہی مگر اسے مزید دلچسپ اور نکھار دیا جاسکتا تھا۔ شہید کی ڈائری میں کس کے ہاتھ پہ لہو تلاش کروں؟ نان بائی بھی مختصر مگر سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبی اچھی تحریریں رہیں۔ رخسانہ سہام اپنی یادوں کے اوراق بڑے دھیمے اور میٹھے انداز میں سانجھے کررہی ہیں۔ ورق ورق مہکتی شاعری کی تعداد کافی کم ہوگئی ہے، وجہ؟ نسیم نیازی، پریم اور میجر احمد نواز کی شاعری من کو بھائی۔ پسند اپنی اپنی میں علی فراز، ذیشان بخاری اور شائلہ اختر کے انتخاب اچھے لگے۔ لیجیے تبصرہ تو ہوگیا لیکن ڈر ہے کہ میرے اس نامۂ محبت کے ساتھ اب کیا سلوک ہوتا ہے؟ پہلے تو بے دھڑک لکھا کرتے تھے، اب دیکھیے، کہیں میرے اس شیر کو بکری بنا دیا جاتا ہے یا بالکل ہی چیونٹی؟ اگر قطع و برید سے محفوظ رہا تو امید ہے کہ میرا خط خصوصی بن جائے مگر خصوصی کا کیا معیار ہے، ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں پائی۔ آخر میں ناصر انکل کو بہت بہت سلام اور آپ سب کے لیے دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔“

☜ بہت ہی پیاری صفیہ! دیکھو تمہارا محبت نامہ پورا پورا شائع کر دیا۔ تبصرہ اچھا تھا لہٰذا قینچی چلانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ امید ہے ہر ماہ پابندی سے محفل میں شرکت کرو گی۔

✉ محمد سلیم اختر' راولپنڈی سے لکھتے ہیں۔ ''عزیز منزہ بہن! السلام علیکم! خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ میری ایک جاننے والی خاتون جو سچی کہانیاں کی خاموش قاری ہیں' کی آپ بیتی اجلے لوگ اُن ہی کے نام سے ارسال کر رہا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ کہانی اُن ہی کے نام سے اور جلدی شائع کریں۔ ممنون ہوں گا۔ کہانی سچی اور طویل ہے' ملنے پر sms کر دینا' شکریہ۔ تمام اسٹاف والوں کو سلام اور دعائیں۔ اہلِ خانہ کو بھی آداب!''

☜ سلیم بھائی! اللہ اللہ کر کے آپ کی خاموشی تو ٹوٹی۔ کہانی تو ارسال کر دیتے ہیں مگر ایک جملہ بھی احوال کے لیے نہیں لکھتے' یہ تو زیادتی ہے۔ آپ کی ارسال کردہ کہانی اجلے لوگ جلد سچی کہانیاں کے صفحات پر ہوگی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ تحسین جونیجو' خیر پور ناتھن شاہ سے تحریر کرتی ہیں۔ ''پیاری آپی جی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ پرخلوص دعائیں آپ کے نام۔ خوش رہیں' آباد رہیں' اپنے پیاروں کے درمیان۔ (آمین! ثم آمین!) آپ کا عید گفٹ سچی کہانیاں عید بعد موصول ہوا۔ خوشی ہوئی۔ آپی! ایک درخواست ہے کہ احوال میں جو لوگ ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہیں تو پلیز' وہ لائنز قینچی کی نذر نہ ہونے دیں۔ عبدالرؤف عدم اچھے بھیا! ہم تو امتحان میں امتیازی نمبروں سے پاس ہو گئے ہیں اور B.A. میں بھی سیکنڈ پوزیشن حاصل کی ہے۔ خود ہی منہ میٹھا کر لیں۔ اب بات ہو جائے شمارے کی۔ اب تو سلسلے وار کہانیاں دیکھ کے اکتا گئے ہیں۔ چار عدد کہانیاں ایک ساتھ چل رہی ہیں' مزید ستم یہ کہ 6,7 سلسلے مختصر کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔ نام لے کر کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔ مختلف لکھاریوں کی رائے سے اندازہ رہا ہو گا کہ آگے مظلوم عوام جو چیخ رہی ہے وہ بے جا نہیں۔ پلیز' غور فرمائیں۔ اگر ہر کہانی پر مکمل یا طویل تبصرہ کرتے ہیں تو آپ کی قینچی صاحبہ خوبصورت نظروں سے وار کرتی ہے کہ خبردار جو آگے کچھ بولا تو چلو جی' سادہ سے انداز میں کسی کو اچھا لگے یا برا' مختصر لفظوں میں یہی لکھا جا سکتا ہے اور کسی کا ٹائم بھی برباد نہ ہو۔ سفر زیارات ارم زہرا کا نہایت عمدہ سفر رہا۔ اللہ کے دوست شہلا سراج بہت لاجواب۔ خلیل جبار کی موبائل کہانی میں یقیناً شادی شدہ عورت کے ایسے کارناموں کا تو یہی انجام ہونا تھا۔ "The Genius" راجہ محمود صاحب کی بہت معلوماتی ' خوبصورت کہانی خوب رہی۔ میں کس کے ہاتھ پہ' نذیر لغاری کی بے حد غم زدہ کہانی تھی۔ قرۃ العین آپی کی الجھا ہوا سا مجھ میں' بہت پیاری' سبق آموز کہانی۔ مزید عندلیب سلمیٰ اب حوصلہ نہیں رہا' ٹیڑھی انگلی' ثمینہ یاسمین' لوٹنگ چڑے' ظہیر مرزا' قاتل کون' اقبال زمان کی' میری گڑیا رانی' مون شاہ بخاری اور سب نے بہت محبت و محنت سے خوب لکھا۔ ناصر رضا انکل کو 16 اکتوبر کو سالگرہ مبارک۔ آخر میں کوثر سعید آپی اور مستقیم نوشاہی بھائی کے نام سلام و دعائیں۔''

☜ تحسین بیٹا! یہ بتاؤ' اگر قینچی نہیں چلے گی تو بہت سارے لوگوں کو احوال کے صفحات پر جگہ کیسے ملے گی؟ رسالے پر تو سب کا حق ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہر احوالی کو جگہ بھی ملے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے' جو کہو گی' مان لیں گے۔

✉ ارشد ملک' راولپنڈی سے لکھتے ہیں۔ ''منزہ سہام صاحبہ! امید ہے' آپ سب خیریت سے ہوں گے اور آپ کا ماہِ مبارک بھی خوبصورت گزر رہا ہو گا یقیناً مصروفیت بھی ہو گی لیکن جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں تو ہمیں بھی ان پر سعید ساعتوں میں یاد رکھا کریں۔ میں اور میری جملہ ٹیم آپ کے دن دگنی' رات چوگنی ترقی کے لیے دعا گو ہیں۔ فی الوقت میں اپنی ایک غزل ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے' آپ اسے اگلے شمارے کی زینت بنا کر میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔''

☜ بھائی ارشد! خوش رہیے! آپ ہماری دعاؤں میں شامل ہیں۔ ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

✉ محمد راشد فرہاد' سکھر سے لکھتے ہیں۔ ''منزہ سہام صاحبہ' السلام علیکم! امید کرتا ہوں' آپ خیریت سے ہوں گی۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ستمبر کے شمارے میں میرا خط شامل نہیں کیا گیا' بس مخصوص لوگوں کے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔''

☜ بھائی راشد! یقین کیجیے' احوال کے صفحات پر تمام لوگوں کا حق ہے' بس جو لوگ پابندی سے لکھتے رہتے ہیں' انہیں تاریخوں کا اندازہ ہوتا ہے اور کوئی بات نہیں۔ اب بھی ہر ماہ کی 12 تاریخ تک خط لکھ دیا کریں' ہم ضرور شائع کریں گے۔

⊠ سمی غزالہ نیہاں' کراچی سے تحریر کرتی ہیں۔ ''ایڈیٹر صاحبہ! السلام علیکم! امید ہے' آپ خیریت سے ہوں گی۔ پچھلے مہینے سچی کہانیاں میں اپنے خط کا جواب پا کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ جس خلوص' اپنائیت اور بے تکلفی سے آپ نے مجھے مخاطب کیا تھا' اس کے سحر سے ابھی تک نہیں نکلی ہوں پھر میری کہانی انجانی سوتن کی رسید بھی دی تھی آپ نے جس سے خوامخواہ خوش فہمی ہوگئی تھی کہ میری کہانی ضرور شاملِ اشاعت ہوگی۔ چلیں' کوئی بات نہیں' کہانی نہیں چھپی لیکن آپ کے الفاظوں کی جادوگری مایوس نہیں ہونے دے رہی ہے۔ اس مہینے میں یعنی اگست کی کہانیوں کو ابھی تک تفصیل سے نہیں پڑھ سکی ہوں مگر شازی سعید مغل کی نا شون ہزار مصروفیت کے بعد بھی پوری توجہ سے پڑھتی ہوں۔ اس ماہ میں انہوں نے چند بیماریوں کا ذکر کیا ہے جو چیچک اور کینسر کے بارے میں ہے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ یہ دونوں بیماریاں وجود رکھتی ہیں۔ یہ زندہ وجود ہیں اور میرا ان سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ اتفاق سے دونوں بیماریوں یا بلاؤں کو میں نے ان کے وجود میں دیکھا ہے۔ کسی وقت تفصیل سے لکھوں گی۔ کچھ خاندان اور دوستوں میں سے دنیا سے چلے گئے ہیں۔ کچھ ننھے وجود کی آمد ہوئی ہے۔ (ابھی اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہے' شکر ہے۔) اور میرے اپنے گھر میں پانچ سال کے لگاتار دکھ اور پریشانیوں کے بعد کچھ خوشیاں ملنے والی ہیں۔ اپنی خوشی میں آپ کو بھی شریک کروں گی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ!) اور ہاں' ایک نظم ''ممتا'' ارسالِ خدمت ہے۔ خط بہت طویل ہوگیا ہے' اب اجازت۔''

☚ ڈیئر سمیں......! امید ہے کہ تمہاری شکایت دور ہوگئی ہوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ سب کو محفوظ رکھے اور بے شمار خوشیاں عطا فرمائے۔ دل سے دعا ہے کہ کوئی بھی دکھ نہ دیکھے۔

⊠ نسیم سکینہ صدف' ڈسکہ سے تحریر کرتی ہیں۔ ''منزہ جی! السلام علیکم! بڑے عرصے کے بعد پھر ''سچی کہانیاں'' کی طرف آئی ہوں' تھوڑا غصہ بھی تھا جو کہانیاں بھیجی ہیں' جانے الماری کے کن خانوں میں ان کو دیمک چاٹ رہی ہے اور ہم ادھر انتظار میں بوڑھے ہورہے ہیں۔ ہم لکھنے والے تو اتنے پرانے نہیں مگر پڑھنے والے پرانے ضرور ہیں۔ پلیز' ذرا الماری کی صفائی کروائی جائے اور ہماری کہانیاں نکال کر سچی کہانیاں میں لگائی جائیں۔ منزہ' آپ سنائیں' کیسی ہیں آپ؟ اللہ تعالیٰ آپ کو سچی خوشیاں عطا فرمائے اور سارے عملے کو میرا اسلام کہیے گا' شکریہ۔''

☚ پیاری نسیم......! دیکھو' یہ مت لکھو کہ کہانیوں کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی ہوں' یار' خاتون کبھی بوڑھی ہو ہی نہیں سکتیں' یہ حقیقت ہے۔ اب تمہارے کہنے پر ناصر بھائی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی الماری کی صفائی کریں اور زیادہ ظالم و جابر نہ بنیں۔ ہم تو اپنے لکھنے والوں کے ساتھ ہیں جن کی کہانیاں نا قابلِ اشاعت ہوں اور جو قابلِ اشاعت ہوں' دونوں کے نام شائع ہونے چاہئیں۔

⊠ شگفتہ شفیق' کراچی سے رقم طراز ہیں۔ ''بہت پیاری منزہ! السلام علیکم! ہمیشہ خوش رہو! کیا حال ہے؟ اس بار سچی کہانیاں ہم سے دور دور ہے' وجہ ہماری مصروفیت ہے۔ جس دن جیرا اڈ جانا ہوا' اپنے تمام میگزین یعنی سچی کہانیاں' دوشیزہ لے کر آؤں گی۔ تم سب کو یہاں بہت مس کر رہی ہوں۔ یہاں پر 19 اگست کو ہمارے اعزاز میں اور سیما جبار جو کہ انگلینڈ سے آئی ہوئی تھیں' کے لیے اعزازیہ استقبالیہ دیا گیا تھا' ساتھ ہی مشاعرے اور کھانے پینے کا انتظام تھا اور 26 اگست کو میری کتاب ''یاد آتی ہے'' کا شاندار اجراء کیا گیا۔ TV کے دو پروگرام بھی کو ہوسٹ کیے۔ ایک میں زلفی صاحب نے سوال کیا کہ جب آپ پہلے پاکستان واپس گئی تھیں تو آپ کی کیسی پذیرائی ہوئی؟ تو ہم نے بتایا کہ وہاں پذیرائی سے زیادہ تجسس پایا جاتا ہے کہ آپ کیوں گئیں؟ کس طرح گئیں؟ کیا کیا پروگرام ہوئے؟ میں نے اپنے کچھ پروگرام تو یوٹیوب پر ڈال دیے ہیں' کچھ تھوڑے دن کے بعد ڈالوں گی۔ یہاں آج کل خوبصورت موسم ہے' کبھی رم جھم بارش ہے تو کبھی صاف چمکیلی دھوپ ہے۔ اپنا گھر' بچے اور سب لوگ بے حد یاد آتے ہیں۔ اس دفعہ زندگی کی پہلی عید تھی جس میں ہم نے مہندی نہیں لگائی نہیں تو چاند نظر آتے ہی پارلر کی طرف بھاگتے ہیں کہ مہندی لگانی ہے۔ بہرحال یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔ میرے تمام پیارے پاکستان میں رہنے بسنے والوں کو بہت بہت پرخلوص سلام۔ اب اجازت' اللہ حافظ!''

☚ میری بہت ہی پیاری شگفتہ! خوش رہو۔ بہت شدت سے انتظار کر رہی ہوں کہ میری کتاب کی رونمائی میں پہنچو۔ اس بار تو کراچی والوں نے بھی بہت رم جھم انجوائے کی۔ بس یار' جلدی سے لوٹ آؤ۔

⊠ نائلہ شکین' چکوال سے رقم طراز ہیں۔ ''نہایت قابلِ احترام منزہ سہام صاحبہ! السلام علیکم! یہ میری کسی رسالہ کے لیے پہلی کوشش ہے جو کہ اپنے ہردلعزیز رسالہ کے (شہید کی ڈائری) کے لیے ایک شہید کی کہانی (بعنوان' غازی مرید حسین شہید) کے نام سے اس امید سے ارسال کر رہی ہوں جو کہ بالکل ہی سچی کہانی ہے کہ آپ اس کہانی کو اپنے رسالہ کی زینت بنا کر ضرور حوصلہ افزائی کریں گی اور مجھے شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔ یہ کہانی میرے شہر چکوال کے قریبی قصبہ بھلہ کی ہے۔ کہانی میں ضرورتاً کاٹ چھانٹ اگر آپ مناسب جانیں تو ضرور کیجیے گا۔ یہ کہانی شائع ہونے پر آپ کو اپنی نگارشات وغیرہ مزید بھی ارسال کرتی رہوں گی۔ امید ہے' آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔''

☚ بہت ہی سویٹ! تمہاری کہانی ایڈیٹر صاحب کے حوالے کردی ہے۔ دیکھو' وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ بہرحال مزید کہانیاں بھی بھیجو اور احوال میں شرکت ضرور کیا کرو۔

⊠ ایم سعید انور سعید' شاد باغ' لاہور سے رقم طراز ہیں۔ ''السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ امید کرتا ہوں سب خیریت سے ہوں گے۔ اس مرتبہ ستمبر کا شمارہ عید کے دنوں میں ہی مل گیا تھا جسے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی جس سے عید کا مزہ دوبالا ہوگیا تھا۔ اب یہ پرچہ کچھ ماہ سے تو جلد ہی مل جاتا ہے' بہت دیر بعد خط لکھنے پر معذرت مگر ہم آپ کا شمارہ باقاعدگی سے پڑھتے رہے ہیں اور آپ کی تمام کہانیاں بہت زبردست ہیں۔ کالم ''آپ کی خبر'' میں عبدالعزیز جی آ کی بیماری کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو صحت اور تندرستی دے اور ان کی کہانی ''عشق نہ پوچھے ذات'' اور دیگر کہانیاں قاتل کون' انجام یہی ہونا تھا' گردش رنگ چمن اور یہ زندگی کے راستے اور ''میری گڑیا رانی'' بہت پسند آئیں اور شاعری کا کالم بھی بہت زبردست چل رہا ہے اور ناصر رضا کا اداریہ ''حقیقت'' بھی بہت اچھا لگا۔ ''میری کہانی' میری زبانی'' میں رخسانہ سہام مرزا کی تحریر ''یادوں کے اوراق'' کی تیسری قسط پڑھی اور اب چوتھی قسط کا انتظار ہے۔ آپ کی خبر میں ہمارے دوست شاعر اور قاری علی رضا کے والد خیر محمد عمرانی کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا اور اللہ ان کے اہلِ خانہ کو صبر کرنے کی توفیق دے۔ ہم رسالہ سچی کہانیاں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو اور ترقی دے۔''

☚ بھائی سعید انور! سچی کہانیاں سے محبت کرنے کا بہت شکریہ۔ یہ آپ کا اپنا رسالہ ہے' محفل میں آتے رہیے گا۔ انتظار رہے گا۔

⊠ سدرہ انور علی' جھنگ سے تحریر کرتی ہیں۔ ''قابلِ احترام عزیز از جان آنٹی' السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بالکل خیریت سے ہوں گی۔ تمام پڑھنے والوں کو میری طرف سے دل کی آخری نکڑ سے محبتوں بھرا سلام۔ ستمبر کا شمارہ جو کہ عید گفٹ تھا جس کی وجہ سے ہمارا خط شائع نہ ہوا۔ سرورق بہت پسند آیا۔ احوال میں تمام لوگوں کے خطوط اچھے تھے۔ بھیا عبدالرؤف کا خط ''محفلِ دوستاں'' کی یاد دلا دیتا ہے اور عزیز انکل کا خصوصی خط تو بہت ہی پسند آیا۔ یہ پہلا خط ہے جو مجھے واقعی خاص لگا۔ انکل ناصر رضا کا اداریہ ''حقیقت'' اگر ہم ہر مسلمان اپنے خول میں خود کو سیدھا کرلیں تو ہمارا کوئی بھی دشمن نہیں۔ ناصر انکل کو سلام کہیے گا۔ ''زندہ کہانی'' میں راجہ محمود' ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ کی زندگی کا احوال لے کر آئے' بہت پسند آئی تحریر۔ سلمیٰ غزل کی کہانی آگہی کا ایک لمحہ' عائزہ کا دکھ اپنا دکھ لگا۔ کہانی دل کو غمگین کرگئی۔ مون شاہ کی میری گڑیا' سوتیلی ماں کے ظلم و ستم پڑھ کر دل کانپ گیا لیکن کیا کریں کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنی سوتیلی ماں کی شان میں بھی برے کلمات زبان سے نہ نکالو کیونکہ وہ تمہارے باپ کی زوجہ ہے۔ آنٹی منزہ کی ''شہید کی ڈائری'' پسند آئی۔ ''سڑک کہانی'' مینا تاج کی نان بائی بہت دلچسپ لگ رہی ہے اور آنٹی' پلیز' آتش جنوں کے صفحات بڑھائے جائیں۔ ظہیر مرزا کی ''لونگ چڑے'' بس ٹھیک ہی لگی۔ ''اللہ کے دوست'' بہت اچھی لگی جو لوگ اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑ لیتے ہیں پھر اللہ ان کا ہی بن جاتا ہے۔ قرۃ العین زینب ''الجھا ہوا سا مجھ میں'' بدگمانی اور شک ایسی چنگاریاں ہیں جو ہنستے مسکراتے دلوں کو پل بھر میں بھسم کردیتی ہیں۔ نذیر لغاری ''میں کس کے ہاتھ پہ'' پڑھ کر دل بہت نم ناک ہوا۔ موبائل کہانیاں میں ''انجام یہی ہونا تھا'' پسند آئی۔ ''میرے شہر کی کہانی'' ارم زہرا کی ''زندگی کے راستے' دکھ سکھ' رنج و الم کا نام ہی زندگی ہے۔ سفر کہانی میں ارم زہرا کا سفرِ زیارت پسند آیا۔ آنٹی محترم رخسانہ سہام کی زندگی کی کہانی کا جواب نہیں ہے۔''

☚ سدرہ......! تمہارا خط کچھ کاٹ چھانٹ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ محفل میں آتی رہا کرو۔

✉ کوثر سعید' شادباغ' لاہور سے تحریر کرتی ہیں۔ ''محترمہ منزہ سہام مرزا! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ سب بخیریت ہوں گے۔ ستمبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا تھا۔ ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ ناصر بھائی کی تحریر ''حقیقت'' بھی بہت دلچسپ تھی۔ آپی رضوانہ کوثر اور شائستہ جبیں اور تحسین جوئیجو اور رابیل خان عطاری کو بھی سلام و دعا۔ کالم آپ کی خبر' آپ کی ڈائری' خیال آرائی اور پسند اپنی اپنی بہت اچھے جارہے ہیں۔ راجہ محمود کی تحریر "The Genius" جو کہ ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ کے سفر زندگی پر مشتمل تھا' پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مون شاہ بخاری کی تحریر میری گڑیا رانی' عبدالعزیز بھائی کی عشق نہ پوچھے ذات اور ارم زہرا کی یہ زندگی کے راستے اور ثمینہ یاسمین کی تحریر ٹیڑھی انگلی اور منزہ سہام کی تحریر شہید کی ڈائری بہت اچھی لگی۔ شاعری کا کالم بہت زبردست چل رہا ہے۔ سچی کہانیاں تو لاجواب ہے اور مسئلہ تو یہ ہے میں بابا جی جو لوگوں کے بہت سے مسائل کا حل ڈھونڈتے ہیں اور منزہ سہام آپ بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل رہی ہیں۔ آخر میں سچی کہانیاں کے تمام لکھاری' بہن بھائیوں کو سلام اور اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کو بہت ترقی دے۔ (آمین!)''

✍ ڈیئر کوثر......! خوش رہو! کہانیاں اچھی لگیں' بہت شکریہ۔

✉ خلیل جبار' حیدرآباد سے لکھتے ہیں۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ! السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ ستمبر کا سچی کہانیاں ملا۔ عید کے شمارے کے بیک گراؤنڈ میں کالا پن دینے سے ایسا لگ رہا تھا کہ شمارہ عید کا نہیں محرم کا ہے۔ ٹائٹل پر مہندی کے رنگ' رنگ برنگ چوڑیاں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ عید کی مناسبت سے بیک گراؤنڈ پر شوخ رنگ ہونے چاہیے تھے۔ ستمبر کے شمارے پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں یہ عرض کرتا چلوں کہ میں اگر کسی کہانی یا ایڈیٹنگ کے حوالے سے بات کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ میں کسی کی صلاحیت کو چیلنج کر رہا ہوں بلکہ میرے نزدیک پرچے کا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ جو غلطی چل گئی ہے تنقید کرنے سے آئندہ وہ غلطی دوبارہ نہیں ہوگی اور پرچے کے معیار میں بہتری بھی آتی ہے۔ کوئی میری کہانی پر تنقید کرتا ہے تو میں خوش ہوتا ہوں اور اسے اپنا دشمن نہیں' دوست سمجھتا ہوں۔ تنقید سے رائٹر کو اپنی خامیوں کا پتا چلتا ہے اور وہ آئندہ ان غلطیوں کو نہیں دہراتا۔ سچی کہانیاں کے صفحہ نمبر 7 پر ''حقیقت'' کے نام سے اداریہ تھا۔ اداریے میں ناصر رضا صاحب نے اس حقیقت کو بہت خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے کہ ہم مسلمان خود اپنے بڑے دشمن ہیں۔ "The Genius" میں ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ کا سفر زندگی اور ان کی زندگی کی جدوجہد کی کہانی پڑھ کر مزا آگیا۔ خصوصی کہانیوں میں سلمیٰ غزل کی آگہی کا ایک لمحہ عمدہ کہانی تھی جبکہ مون شاہ بخاری کی میری گڑیا رانی بھی اچھی رہی۔ شہید کی ڈائری حسب معمول متاثر کن تھی۔ سڑک کہانی میں مینا اس بار نان بائی کے ساتھ حاضر تھیں۔ اس کردار کو بھی انہوں نے خوب پیش کیا۔ آتشِ جنوں اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں ہے۔ آپ بیتیوں میں ظہیر مرزا کی لونگ چڑے اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد رہی اور سیدہ تبسم زہرہ رضوی کی اور جب چھپر چھتا بھی خوب تھی۔ شہلا سراج کی اللہ کے دوست بزرگانِ دین کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ جگ بیتیوں میں عبدالعزیز جی آ کی عشق نہ پوچھے ذات منفرد رہی۔ یہ الگ ہی ٹیسٹ کی کہانی تھی۔ قرۃ العین زینب کی الجھا ہوا سا مجھ میں خوبصورت تحریر تھی۔ عندلیب سلمیٰ کی اب حوصلہ نہیں رہا بھی مناسب رہی۔ پراسرار کہانیوں میں ٹیڑھی انگلی اچھی تحریر تھی۔ میرے شہر کی کہانی میں اس بار بھی ارم زہرا اچھی تحریر کے ساتھ حاضر تھیں جبکہ اقبال زمان کی کہانی حسب معمول فیچر رپورٹ اچھی تھی۔ ارم زہرا کا سفرنامہ بھی زبردست رہا۔ یادوں کے اوراق بہت خوبصورت انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ڈیل ڈن رخسانہ سہام صاحبہ' شازلی سعید مغل کی تاشون زبردست جارہی ہے۔ جیتی جاگتی تحریروں میں معروف صحافی نذیر لغاری کی کہانی نے دل ہلا دیا۔ اکتوبر کے پراسرار نمبر کے لیے پراسرار موبائل کہانی ''قاتل روح'' کی دھمکی بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ پسند آئے گی۔''

✍ خلیل بھائی......! آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تنقید ہمیں پسند نہیں۔ ظاہر ہے' آپ لوگ ہی بتائیں گے کہ کیا اچھا لگا اور کیا برا اور ہم اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے جو کچھ کر سکے' وہ کریں گے۔ جمہوریت کی یہی تو خوبصورتی ہے کہ اختیارات تقسیم ہوتے ہیں' کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ادارتی بورڈ کی رائے بہت ضروری ہوتی ہے۔ امید ہے' آپ سمجھ رہے ہوں گے۔

اس ماہ کا خصوصی خط

✉ عمران مظہر' ژوب سے لکھتے ہیں۔ ''ڈیئر منزہ آپی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ' سر ناصر رضا اور تمام اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ ستمبر کے شمارے کا سرورق ٹھیک رہا۔ گریٹ سر ناصر رضا کا اداریہ ''حقیقت'' اس حقیقت کو بخوبی بیان کرتا ہے کہ آج کا انسان خود اپنا دشمن ہے' ویسے ناصر سر' ایک بات تو بتایئے۔ (آپ پوچھ لیجیے۔) ''عید نمبر'' میں میری کہانی کہاں ہے؟ چلیں خیر' امید ہے' جلد شائع ہوگی۔ انشاء اللہ! احوال میں عبدالعزیز جی آ کا خط پڑھ کر عجیب لگا۔ کیا ہم حسنِ اخلاق سے اپنی بات نہیں کہہ سکتے؟ اور منزہ آپی! آپ بھی منزہ آپی ہی ہیں۔ جی آ صاحب کو خصوصی خطوط میں کچھ خاص نظر نہیں آتا اور آپ نے اُن کے ہی خط کو خصوصی بنا ڈالا؟ راجہ محمود صاحب کی "The Genius" پڑھ کر مرزا اختیار بیگ کو جاننے کا موقع ملا۔ راجہ صاحب کا انداز تحریر واقعی نیچرل ہے۔ سلمیٰ غزل کی ''آگہی کا ایک لمحہ'' بہترین تحریر رہی لیکن کہانی کی کچھ سطور میں مردوں کے لیے جو طنزیہ جملے لکھے گئے' حیرت ہوئی۔ حقیقت یہی ہے کہ ہر عورت کے لیے اس کا باپ' بھائی اور شوہر بہت زیادہ اہم اور قابلِ احترام ہوتا ہے یقیناً سلمیٰ صاحبہ کے لیے بھی ہوں گے تو یہ قلمی تضاد کیوں؟ مجھے صرف یہ سوچ اور حقیقت کا فرق لگتا ہے اور کچھ نہیں۔ مون شاہ بخاری نے ''میری گڑیا رانی'' کے انداز بیان پر گرفت مضبوط رکھی۔ اچھی تحریر رہی۔ شہید کی ڈائری کے لیے بس یہی کہوں گا۔ "Always well!" مینا کی نان بائی ان کی پچھلی کہانیوں سے مکمل لگی۔ بلوچستان میں واقعی نسل در نسل دشمنی کا خطرناک سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ منزہ جی! مینا اور مینا تاج کے درمیان فرق واضح کیجیے؟ سلیم فاروقی اور فاطمہ بلگرامی دونوں کی قسط وار کہانیاں اچھی جارہی ہیں۔ سیدہ تبسم زہرہ کی ''اور جب چھپر پھٹا'' خدا پر ایمان کے نظریے کو تقویت دیتی ہے۔ بلاشبہ اچھی تحریر ہے۔ شہلا سراج کی ''اللہ کے دوست'' ایمان کو جلا بخشتی ہے۔ قرۃ العین زینب ''الجھا ہوا سا مجھ میں'' کے عنوان سے بہترین طرز تحریر کی حامل تحریر لیکر آئیں۔ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے' سوچ کر رہ گیا۔ عندلیب سلمیٰ کی ''اب حوصلہ نہیں رہا'' مختصر اور پراثر تحریر رہی۔ نذیر لغاری صاحب کی ''میں کس کے ہاتھ پہ'' زندگی کی کڑوی سچائی بیان کرتی نظر آئی۔ نذیر صاحب کے پوچھے گئے سوالوں کا جواب آج کے بے حس معاشرے میں شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ خلیل جبار کی ''انجام یہی ہونا تھا'' موبائل کہانی کے لحاظ سے اچھی تحریر رہی۔ سائنس کی اس ایجاد کے فائدے کم اور نقصان زیادہ نظر آرہے ہیں۔ ثمینہ یاسمین کی ''ٹیڑھی انگلی'' بہترین پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ طرز تحریر کی وجہ سے حقیقت کا گمان زیادہ ہوتا ہے۔ ارم زہرا کی ''یہ زندگی کے راستے'' دلچسپ رہی کسی فلمی کہانی کی طرح۔ اقبال زمان کی ''قاتل کون؟'' تشنہ تشنہ لگی۔ اقبال زمان صاحب! کبھی فون بھی attend کرلیا کیجیے۔ منزہ آپی! میں نے سچی کہانیاں اور دوشیزہ دونوں کے لیے منی آرڈر بھجوادیا تھا سالانہ خریداری کے لیے۔ امید ہے' مل گیا ہوگا تو رسالوں کا سلسلہ شروع کردیجیے جلد از جلد۔ رخسانہ سہام مرزا کا ''یادوں کے اوراق'' پڑھ کر چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ منزہ آپی! میرا اگلا سوال...... رعنا صاحبہ! تابندہ صاحبہ کیا کرتی ہیں؟ آپ لوگ ٹوٹل کتنے بہن بھائی ہیں؟ مسئلہ یہ ہے' ہمیشہ کی طرح بہترین۔ عکاشہ سحر صاحبہ کا خلیق الرحمان کے کلام پر تبصرہ زبردست رہا۔ بازگشت ہمیشہ یہی رہے گی۔ آخر میں آپ سب کے لیے صحت' ایمان' سلامتی کی دعائیں۔ جہاں رہیے' خوش رہیے۔ کچھ غلط کہہ دیا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ ناصر سر کو سلام!''

✍ بھائی عمران......! بہت جامع اور خوبصورت خط لکھا خاص طور سے مجھے یہ جملہ بہت ہی اچھا لگا۔ ''منزہ آپی......! آپ بھی منزہ آپی ہی ہیں۔'' امید ہے کہ اب دونوں شمارے آپ کو گھر بیٹھے ہی مل رہے ہوں گے۔ اقبال صاحب کی تو کیا بات ہے' ہمیں بھی اُن سے یہی شکایت ہے کہ فون نہیں اٹھاتے۔ پتہ نہیں' رکھتے کیوں ہیں؟ بھائی' ہم تین بہنیں ہیں اور رعنا اور تابندہ امریکہ میں رہتی ہیں۔

پھر ملیں گے گر خدا لایا

منزہ سہام مرزا





راجہ محمود

بھوت بنگلہ

الماری کے ہینڈل سے لپٹا ہوا ایک باریک سانپ بل کھاتا ہوا اچھل کر میرے پاؤں پر آ گرا۔ ساتھ ہی الماری میں رکھے ہوئے چینی کے برتن کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اُڑن طشتریوں کی طرح......

قدرت اللہ شہاب کی زندگی سے جڑے پراسرار واقعات مصنف کے مختصر تعارف کے ہمراہ

گلگت کے برف پوش پہاڑوں کے درمیان آنکھ کھولنے والے قدرت اللہ 26 فروری 1917ء کو اس جہان میں وارد ہوئے۔ والد محمد عبداللہ اس وقت کے گریجویٹ تھے۔ وہ سرکاری ملازمت کے دوران ریاست جموں و کشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ مہتر چترال کے دربار میں انہیں اعلیٰ عہدہ ملا اور وہ گلگت کے گورنر بھی رہے۔ قدرت اللہ کی والدہ کا نام کریماں بی بی تھا۔





قدرت اللہ کا بچپن گلگت اور چترال کے حسین مناظر کے درمیان گزرا۔

ان کی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ مقامی اسکولوں میں جاری رہا۔ ابھی بچپن سے نکل کر لڑکپن میں داخل ہوئے تھے کہ ان دنوں چترال میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی جس میں زیادہ تر بچے اور نوعمر لقمۂ اجل بن رہے تھے۔ والدین کو قدرت اللہ کی فکر دامن گیر ہوئی تو انہیں چمکور، ضلع انبالہ بھیج دیا گیا جہاں انہیں بابا اجیت سنگھ خالصہ ہائی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔

اسی اسکول سے قدرت اللہ نے میٹرک کیا اور پھر پرنس آف ویلز کالج، جموں میں داخلہ لیا جہاں سے ایف ایس سی اور بی ایس سی کے امتحانات پاس کیے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے ان کی تعلیم کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ایم اے کرنے کے دوران لاہور میں قیام کیا اور گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ 1941ء میں انڈین سول سروس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا مگر جب تربیت حاصل کرنے کے لیے سول سروس اکیڈمی، دیرہ دون گئے تو انہیں ادراک ہوا کہ وہ اس ماحول میں یکسر اجنبی ہیں۔ ان میں وہ تمام خصائل یکسر مفقود تھے جو ایک سرکاری افسر میں لازمی ہونا چاہئیں۔ چنانچہ جب تربیت کے بعد ان کی ابتدائی خفیہ رپورٹ لکھی گئی تو اس میں خاص طور پر تحریر کیا گیا تھا کہ یہ شخص اس سروس کے لیے مس فٹ ہے۔ بہر حال اس رپورٹ کے باوجود وہ افسر شاہی کے نظام کا حصہ بن گئے۔ قیامِ پاکستان سے قبل وہ بطور آئی سی ایس افسر اڑیسہ، بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز رہے۔

قدرت اللہ کی ادبی زندگی کی شروعات شعر گوئی سے ہوئی۔ ابتدا میں رونق اور جعفر کے تخلص کے ساتھ لکھتے رہے۔ آخر کار شہاب کا تخلص حتمی ٹھہرا۔

ابھی سول سروس میں خدمات انجام دے رہے تھے کہ پاکستان کا ظہور عمل میں آیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ انہیں فیصلہ کرنا تھا، آیا انڈین سول سروس کا حصہ رہیں یا پاکستان ہجرت کر جائیں؟ تاہم انہوں نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی چونکہ نووارد ملک کو حکومتی مشینری چلانے کے لیے ان جیسے افراد کی ضرورت تھی لہٰذا قدرت اللہ نے اپنی خدمات حکومتِ پاکستان کے لیے وقف کر دیں۔

پاکستان میں وہ غلام محمد، میجر جنرل سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان کے سیکریٹری، وفاقی سیکریٹری برائے اطلاعات ونشریات اور وفاقی سیکریٹری تعلیم رہے۔ جب وہ ایوب خان کے پرسنل سیکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے تو ان ہی دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی اور یوں کاپی رائٹ ایکٹ منظور کرایا۔ انہوں نے تین برس ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

1969ء میں جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کے فوراً بعد سرکٹ ہاؤس میں ہونے والے وفاقی سیکریٹریوں کے اجلاس میں بطور وفاقی سیکریٹری اطلاعات ونشریات کے عہدے سے مستعفی ہو گئے، تاہم ذوالفقار بھٹو کے دور میں دوبارہ وفاقی سیکریٹری تعلیم ہوئے مگر جب جون 1974ء میں اُن کی بیگم ڈاکٹر عفت کی وفات ہوئی تو اس صدمے سے انہیں جیسے چپ سی لگ گئی۔ دنیا سے اُن کا دل اچاٹ ہو گیا اور محض دو برس بعد انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی۔

شہاب انتہائی کم گو اور مردم بے زار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے متعلق لوگوں کی مختلف آراء تھیں، کوئی انہیں پہنچا ہوا ولی اللہ سمجھتا تھا۔ کسی کو شبہ تھا کہ وہ سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں، کچھ انہیں پاپی بیوروکریٹ کے نام سے یاد کرتے تھے، تاہم اپنے بارے میں خود انہوں نے زندگی کے آخری ایام میں

لکھا اور خوب کھل کر اپنی زندگی کے خفیہ گوشے عیاں کیے۔ اُن کی خودنوشت سوانح حیات ''شہاب نامہ'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آئی جسے عام حلقوں میں پسندیدگی کی سند حاصل ہوئی۔ اُن کے قلمی آثار میں ''یا خدا!'' (ناولٹ) ''نفسانے''...... ''ماں جی'' ''سرخ فیتہ''...... ''شہاب نامہ'' (آپ بیتی) سفرنامے اور رپورتاژ بھی شامل ہیں۔

24 جولائی 1986ء کو اسلام آباد میں یہ نادرِ روزگار ادیب ملکِ عدم کوچ کر گئے۔

انڈین سول سروس میں سرکاری خدمات کی انجام دہی کے دوران اُن کا تبادلہ انڈیا کے دور دراز علاقوں میں کیا جاتا تھا جو کہ سرکاری نوکری کا حصہ ہوتا ہے۔ ایک بار سزا کے طور پر اُن کا تبادلہ کٹک کر دیا گیا۔ دراصل انہوں نے جنگ کے زمانے میں سرکاری گودام کا تالہ توڑ کر چار من دھان بھوکے افراد میں مفت تقسیم کر دیا تھا۔ اسی جرم کی پاداش میں انہیں کٹک بھیجا گیا تھا۔ کٹک میں جس کوٹھی میں انہیں رہائش فراہم کی گئی اس میں شہاب کے ساتھ کچھ عجیب وغریب غیر معمولی قسم کے واقعات پیش آئے تھے جنہیں انہوں نے خود قلم بند کیا ہے۔ اُن کی یہ تحریر اُن ہی کے الفاظ میں قارئین کے لیے پیشِ خدمت ہے۔

....

کٹک میں سرکاری اقامت گاہوں کی قلت تھی، خصوصاً غیر شادی شدہ افسروں کے لیے سرکاری مکان ملنا محال تھا اس لیے میں کافی عرصہ کٹک کلب کے ایک کمرے میں مقیم رہا۔ چند ماہ بعد جب صوبے میں کانگریس کی وزارت برسرِ اقتدار آئی تو شری ہری کرشن مہتاب چیف منسٹر مقرر ہوئے۔ باقی کئی محکموں کے علاوہ ہوم ڈیپارٹمنٹ بھی ان کے چارج میں تھا۔

شری ہری کرشن مہتاب بڑے خوش مزاج اور خوش اطوار وزیر اعلیٰ تھے اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے ذاتی مسائل میں بھی گہری دلچسپی لیا کرتے تھے۔ ایک روز میں چند فائلیں لے کر ان کے پاس گیا تو انہوں نے میرے مکان کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ کٹک کی سول لائنز میں ایک کوٹھی ہے جو سالہا سال سے غیر آباد چلی آ رہی ہے۔ جب کبھی کوئی کوٹھی میں رہائش اختیار کرتا ہے تو چند ہی روز میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے کیونکہ اس گھر کے متعلق مشہور ہے کہ یہ آسیب زدہ ہے۔ مہتاب صاحب نے کہا کہ اگر تم وہمی طبیعت کے مالک نہیں ہو تو بڑی خوشی سے اس بنگلے کو آزما کر دیکھ لو۔

میں کلب میں ایک کمرے کی گھٹن سے تنگ آیا ہوا تھا اس لیے میں نے فوراً حامی بھر لی اور سول لائنز کی کوٹھی نمبر اٹھارہ میرے نام الاٹ ہو گئی۔

یہ ایک ہلکے زرد رنگ کی چھوٹی سی خوش نما کوٹھی تھی جس کے گرد ڈیڑھ دو ایکڑ کا وسیع وعریض لان پھیلا ہوا تھا۔ لان میں گھٹنوں گھٹنوں تک اونچی گھاس اگی ہوئی تھی اور چاروں طرف سوکھے ہوئے کالے پیلے پتوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جابجا سوکھے ہوئے اور تازہ گوبر پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک طرف جامن اور آم کے کچھ پیڑ تھے جن کے نیچے بلیاں اور کتے وقتاً فوقتاً اپنی مخصوص آواز میں رویا کرتے تھے۔ دوسری طرف پیپل کا پرانا درخت تھا جس کی شاخوں سے بے شمار کالی کالی، بھوری بھوری چمگادڑیں الٹی ٹنگی رہتی تھیں۔ کوٹھی کے عقب میں ایک کچا تالاب تھا جس کے پانی پر سبز کائی کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی اور کناروں پر مینڈکوں، جھینگروں اور دوسرے کیڑوں مکوڑوں کا جمِ غفیر موجود رہتا تھا۔

کوٹھی سے کوئی ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر

باورچی خانہ تھا۔ اسی کے ساتھ دو سرونٹ کوارٹر تھے جن میں میرا کشمیری خانساماں رمضان اور بنگالی ڈرائیور روز محمد رہتے تھے۔

اٹھارہ سول لائنز میں ایک ڈرائنگ روم' ایک ڈائننگ روم اور تین بیڈروم تھے۔ میں نے اپنے استعمال کے لیے جو بیڈروم منتخب کیا' اس کا ایک دروازہ ڈائننگ روم کی طرف کھلتا تھا۔ دوسرا دروازہ اور ایک کھڑکی برآمدے میں کھلتے تھے جس کے سامنے عقبی لان کا وسیع پھیلاؤ تھا۔ اس بیڈروم کے ساتھ ایک ڈریسنگ روم اور غسل خانہ بھی ملحق تھا۔

ایک رات میں سب دروازے اور کھڑکیاں بند کرکے بستر پر لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرے پاس کوئی ٹیبل لیمپ نہ تھا اور بجلی کا سوئچ پلنگ سے دور والی دیوار پر لگا ہوا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب میں نے کتاب بند کرکے تپائی پر رکھ دی اور بجلی بجھانے کے لیے اٹھنے لگا تھا کہ پیتل کا سوئچ کھٹاک سے بجا اور بجلی اپنے آپ بجھ گئی۔ میں نے سوچا کہ سوئچ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہوگا اس لیے اس کا بٹن اپنے آپ ہل گیا ہے لیکن پھر خیال آیا کہ بجلی آف کرنے کے لیے سوئچ کا بٹن کافی زور سے اوپر کی طرف گھمایا جاتا ہے۔ اگر وہ ڈھیلا ہو گیا ہے تو اسے نیچے کی طرف گرنا چاہیے تھا۔ وہ خود بخود اوپر کی طرف کیسے اٹھ سکتا ہے؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سوئچ پھر کھٹ سے بجا اور بجلی آن ہو گئی۔ ساتھ ہی ڈرائنگ روم والے بند دروازے پر تین بار دھیمی سی دستک ہوئی جیسے کوئی انگلی بند کرکے اس کے جوڑ سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ڈرائنگ روم بالکل خالی تھا البتہ صوفے کے قریب سفید دھوئیں کا ایک چھلا ضرور نظر آیا جو دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں تحلیل ہو گیا۔ اس چھلے کی ہیئت کچھ اس طرح کی تھی جس طرح کے سگریٹ کا کش لے کر دھوئیں کے رنگ بنائے جا[تے] ہیں۔ جس جگہ یہ چھلا ہوا میں معلق تھا وہاں انگریزی سینٹ اور حنا کے عطر کی ملی جلی خوشبو پھیل[ی] ہوئی تھی۔

اب یہ روز کا معمول ہو گیا' ادھر میں کتاب بند کرتا تھا' ادھر بجلی خود بخود کھٹ سے بجھ جاتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن دروازے پر دستک بھی بدستور ہوتی تھی اور ہر بار دھوئیں کا چھلا پہلے کی نسبت بڑ[ا] نظر آتا تھا اور زیادہ دیر تک قائم رہتا تھا۔ ایک رات میں اپنے بیڈروم میں آیا تو میرے سلیپر غائب تھے۔ کافی دیر ڈھونڈتا رہا لیکن کہیں نہ ملے لیکن جب میں بستر پر لیٹا تو تکیے سے چرمر چرمر کی آواز آئی۔ اٹھ کر دیکھا تو دونوں سلیپر تکیے کے غلاف کے اندر پڑے تھے۔ سلیپر پہن کر منہ ہاتھ دھونے باتھ روم گیا تو صابن دانی غائب پائی۔ واپس آکر بستر پر لیٹا تو وہ بھی تکیے کے غلاف سے برآمد ہوئی۔ صابن دانی غسل خانے میں رکھ کر دوبارہ کمرے میں آیا تو تکیے پر بسکٹوں کا ڈبہ کھلا پڑا تھا جو میرے بیڈروم کی الماری میں رکھا رہتا تھا۔ دو تین بسکٹ باہر گرے ہوئے تھے۔ میں نے ان بسکٹوں کو اٹھا کر کھایا اور ڈبا الماری میں رکھ کر پلنگ کی طرف مڑا تو دیکھا کہ تکیے پر سگریٹ کیس کھلا ہوا رکھا ہے جو ڈرائنگ روم کی میز پر مہمانوں کے لیے پڑا رہتا تھا۔ اپنی آٹو میٹک سروس ایجنسی کی اس دل لگی پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں سگریٹ پیتا تو نہ تھا لیکن سوچا کہ اپنے نادیدہ بامذاق خدمت گزار کا دل خوش کرنے کے لیے آج سگریٹ نوشی میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ میں نے ایک سگریٹ منہ میں رکھا اور ماچس جلائی ہی تھی کہ دیا سلائی کا شعلہ سگریٹ میرے ہونٹوں سے کھینچ کر دور جا پڑا۔ ساتھ ہی ڈرائنگ روم والے دروازے پر وہی مخصوص دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو قریب

ہی ریشم کے کپڑے کی سرسراہٹ سنائی دی پھر سفید دھوئیں کا حلقہ تقریباً نصف کمرے میں پھیل گیا۔ سارے کمرے میں بھینی بھینی خوشبو کی پھوار سی برس رہی تھی اور فضا میں کچھ اس طرح کا ارتعاش لرزاں تھا جیسا کہ فوارہ چلنے سے محسوس ہوتا ہے۔ اُن دنوں مجھے موسیقی کا شوق تھا اور اسراج بجانے میں کچھ ریاض بھی کیا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم کی بتی جلائی تو میری اسراج صوفے کے قریب قالین پر یوں پڑی تھی جیسے ابھی ابھی کسی نے وہاں لاکر رکھی ہو۔ میں بغیر سوچے سمجھے فرش پر بیٹھ گیا اور اسراج بجانے لگا لیکن تار بالکل dead تھے۔ ان سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ چند لمحے ایک عجیب سا بولتا ہوا سناٹا رہا پھر اچانک ایک زور کا دھماکہ ہوا جیسے کمرے میں بارود سے بھرا ہوا گولہ پھٹ گیا ہو۔ سفید دھوئیں کا حلقہ مکڑی کے جالے کے تاروں کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا اور اس کے ٹکڑے ہوا میں اس طرح کپکپانے لگے جس طرح بادل کی لڑی کا عکس پانی کی متلاطم لہروں میں ٹوٹ ٹوٹ کر لہراتا ہے۔ ساتھ ہی بالکل بند کمرے میں چاروں طرف سے پتھروں اور اینٹوں کی بارش شروع ہوگئی۔ اب میں جہاں کہیں بھی بیٹھتا تھا' میرے آگے پیچھے' دائیں بائیں پتھر ہی پتھر برستے تھے۔ بستر پر لیٹتا تو پلنگ کے اردگرد سنگ و خشت کا انبار لگ گیا۔ ایک پتھر جو پلنگ کے اوپر میرے عین قریب آ کے گرا' اس کا وزن کئی سیر تھا۔ کمروں کے روشن دان' کھڑکیاں' دروازے سب بند تھے لیکن پتھر بڑے زور سے سنسناتے ہوئے آتے تھے اور میرے بالکل قریب زمین پر گر جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے کوئی پتھر مجھے لگتا نہ تھا ورنہ ان میں کچھ اتنے وزنی اور نوکدار ہوتے تھے کہ چند ہی ضربوں میں انسان کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کے لیے کافی تھے۔

اس واقعے کے ساتھ ہی اگلے چند ماہ کے لیے میری زندگی کا ڈھرا بالکل تبدیل ہوگیا۔ آٹو میٹک سروس کی پرلطف آنکھ مچولی بند ہوگئی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ایک جانی پہچانی شائستہ اور معطر سی دستک بھی موقوف ہوگئی۔ اس غیر مرئی سے ماحول میں ایک عجیب قسم کی لطافت' رفاقت اور ادراک کی اشتراک کا جو عنصر تھا' اس جگہ اب مافوق الفطرت' پراسرار اور ہیبت ناک واقعات کا ایسا تسلسل شروع ہوگیا جسے پوری تفصیل سے بیان کرنا آسان نہیں اس لیے نمونے کے طور پر فقط چند چیدہ چیدہ اور نسبتاً اہم واقعات ہی درج ذیل کرتا ہوں۔

میرا کشمیری ملازم اور بنگالی ڈرائیور روز محمد عموماً رات کے دس ساڑھے دس بجے کام کاج سے فارغ ہوکر اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے تھے جو کچن کے ساتھ کوٹھی سے دو سو گز کے فاصلے پر واقع تھے۔ ان کے جاتے ہی کارروائی کا آغاز اینٹوں اور پتھروں سے شروع ہو جاتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور کمرے کے اندر جو اینٹیں اور پتھر برس رہے ہیں' وہ بالکل خشک ہیں۔ صبح سویرے منہ اندھیرے میں اس ملبے کو ٹوکروں کے حساب سے سمیٹ کر لان کے تالاب میں پھینک آتا تھا تاکہ اس ماجرے کی خبر پا کر رمضان اور ڈرائیور خوفزدہ نہ ہوں۔ کارروائی روزمرہ کا دستور تھی۔ اینٹوں کی بارش کے بعد گھر کے سب دروازے' کھڑکیاں اور روشن دان کھٹ کھٹ کر کے خود بخود کھل جاتے تھے اور اپنے آپ بند ہو جاتے تھے۔ بند ہوتے وقت دروازوں اور کھڑکیوں کے پٹ ایک دوسرے سے اس زور سے ٹکراتے تھے جیسے شدید آندھی آئی ہوئی ہو۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ عمل کئی مرتبہ دہرایا جاتا تھا۔ گھر کی سب بجلیاں بھی اسی رفتار سے جلتی اور بجھتی رہتی تھیں۔ کبھی کسی

کھلے دروازے کو بند کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بند نہ ہوتا تھا اور اگر بند دروازے کو کھولنا چاہتا تو وہ کھلتا نہ تھا۔ ایک بند دروازے کو کھولنے کے لیے ذرا زیادہ زور لگایا تو اس کی چوکھٹ اکھڑ کر دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ خود بخود اچھل کر اپنی جگہ فٹ ہو گئی۔

آدھی رات کے قریب میرے ڈرائنگ روم کی چھت چرچرا کر اس طرح بولنے لگتی تھی جیسے اس پر بے حد وزنی بوجھ ڈالا جا رہا ہو۔ کبھی تو یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ اس بوجھ کے تلے چھت ٹوٹ کر نیچے آ پڑے گی پھر چھت پر ایسی آوازیں ابھرتیں جیسے بہت سے لوگ لکڑی کی کھڑاویں پہنے اچھل کود رہے ہوں، ساتھ ہی بڑے بڑے ڈھول دھما دھم اتنے زور سے بجنے لگتے کہ ان کی دھمک سے میرا کمرا گونج اٹھتا۔ ڈھول کے ساتھ کئی دوسرے ساز بھی بجنا شروع ہو جاتے تھے جن میں طبلہ، چمٹا، ستار، نفیری اور شہنائی کی آواز خاص طور پر نمایاں ہوتی تھی پھر یکایک سنکھ بجنے لگتا اور دیر تک لگاتار بجتا رہتا۔ رفتہ رفتہ سنکھ کی دلخراش گونج باقی سب آوازوں پر پوری طرح غالب آ جاتی۔

میرے بیڈروم کے ساتھ عقبی لان کی طرف برآمدہ تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی اور دروازہ برآمدے میں کھلتے تھے۔ رات کے وقت میں دونوں کو بند کر کے اندر سے کنڈی لگا لیتا تھا۔ ایک روز چھت پر سنکھ کی آواز بلند ہوئی تو یوں سنائی دینے لگا جیسے برآمدے کے پکے فرش پر بہت سے شہ زور گھوڑے بیک وقت سرپٹ بھاگ رہے ہوں۔ سموں کے ٹاپوں کی آواز کے ساتھ ان کی دم کے بالوں کی سرسراہٹ اور نتھنوں سے زور زور سے سانس لینے کی پھڑپھڑاہٹ بھی واضح طور پر سنائی دیتی تھی۔ یہ آوازیں بڑی دیر تک جاری رہیں تو میں نے کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھول کر برآمدے میں جھانکا، وہاں پر گھوڑا تو کوئی نہ تھا البتہ لال لال انگارہ سی آنکھوں والا الو کی شکل و صورت کا ایک بھاری بھرکم پرندہ پر پھیلائے ہوا میں معلق ہو کر اس طرح ہچکولے کھا رہا تھا جیسے وہ واقعی بھاگتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو۔ میرے جھانکتے ہی وہ اس قدر زور سے چیخا کہ میں نے فوراً کھڑکی بند کر لی۔ کافی دیر تک وہ چیخ برآمدے میں سائرن کی طرح بجتی رہی اور اس کے بعد کچھ عرصہ یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ عجیب الخلقت پرندہ اپنے پنجوں سے کھڑکی کو کرید کرید کر توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ان دنوں میرے پاس ساگوان کی لکڑی کا بہت بڑا ڈائننگ ٹیبل تھا جس کا وزن ڈیڑھ دو من ہوگا۔ ایک رات کوئی چیز لینے کے لیے میں نے ڈائننگ روم کی الماری کھولی تو ہینڈل سے لپٹا ہوا ایک باریک سانپ بل کھاتا ہوا اچھل کر میرے پاؤں پر آ گرا۔ ساتھ ہی الماری میں رکھے ہوئے چینی کے برتن کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اڑن طشتریوں کی طرح میز پر آ جمع ہوئے۔ اس کے بعد ڈائننگ ٹیبل آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھنا شروع ہوا اور اس قدر بلند ہو گیا کہ اس کے اوپر پڑے ہوئے چینی کے برتن ٹن ٹن کر کے بجلی کے پنکھے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ پنکھے کو چھو کر میز یکلخت دھڑام کر کے فرش پر واپس آ گیا۔ اس کا ایک پایہ میرے بائیں پاؤں کے انگوٹھے پر اس قدر زور سے لگا کہ انگوٹھے کا کچھ حصہ آج تک بالکل بے حس ہے۔

ایک رات میرے کمرے میں اینٹوں اور پتھروں کی جگہ مردار ہڈیاں برسنے لگیں۔ ہڈیوں میں چند انسانی کھوپڑیاں بھی تھیں۔ جا بجا بکھرا ہوا ہڈیوں اور کھوپڑیوں کا یہ انبار اتنا کریہہ المنظر تھا کہ صبح کا انتظار کیے بغیر میں نے انہیں اکٹھا کر کے ایک چادر میں باندھا اور انہیں تالاب میں پھینکنے کے لیے باہر لان میں نکل آیا۔ لان میں پہنچتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زنجیروں کے لچھے سے میرے دونوں ٹخنوں پر پے در پے زور زور کی ضربیں لگ رہی ہیں۔ تالاب سے اس قسم کی آواز برآمد ہوئی جیسے کوئی غوطہ خور پانی سے باہر ابھرتا ہے۔ ساتھ ہی تالاب کے کنارے سبز کائی میں لپٹا ہوا ایک کالا سیاہ سایہ سا نمودار ہوا اور خوں خوں کرتا ہوا گوریلے کی طرح میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے ہڈیوں کا گٹھا وہیں پھینکا اور پیٹھ پھیر کر اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ بھاگتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں رسیوں کے تانے بانے میں الجھ گئے ہیں۔ برآمدے کے قریب پہنچ کر میں بری طرح لڑکھڑایا اور منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اب کھڑے ہونے کی سکت باقی نہ تھی اس لیے میں پیٹ کے بل رینگتا رینگتا بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ میرے ٹخنوں میں شدید سوزش اور جلن ہو رہی تھی، گھٹنے بری طرح چھل گئے تھے اور منہ کے بل گرنے کے باعث ٹھوڑی سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے میں نے جا کر واش بیسن کا نلکا کھولا تو کچھ دیر سوں سوں کی آواز آتی رہی۔ اس کے بعد یکایک غٹ غٹ کر کے نلکے سے گرم گرم گاڑھے گاڑھے خون کی دھار بہنے لگی۔

ایک رات ہڈیوں کی بوچھار کے بعد یکایک سارے گھر میں ایسا بدبودار تعفن پھیل گیا جیسے غلاظت سے بھرا ہوا گٹر پھٹ گیا ہو۔ کبھی ہوا میں پسی ہوئی مرچوں کی دھانس اٹھنے لگتی تھی۔ کبھی سوجی بھوننے اور ہلدی جلنے کی بو آنے لگتی تھی۔ کبھی سڑی ہوئی مچھلی کی بساند پھیل جاتی تھی۔

ایک بار دن ہو یا رات، میں جو کھانے پینے کی چیز منہ میں ڈالتا تھا، اس میں کنکر، مٹی اور ریت کی ملاوٹ ہوتی تھی۔ پھلوں کے اندر بھی کنکر ملتے تھے۔ میں نے ایک کیلا چھیل کر درمیان سے توڑا تو اس کے اندر سے جو سیون سی ہوتی ہے، اس میں بھی ریت اس طرح جمی ہوئی تھی جیسے تھرمامیٹر کی نالی میں پارہ بھرا ہوا ہوتا ہے۔

ایک روز آدھی رات کے بعد ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ڈرائنگ روم میں جانے کے لیے میں نے دروازہ کھولا تو وہ آدھا کھل کر زور سے بند ہو گیا۔ میں جتنا زور لگاتا تھا، دروازہ تھوڑا سا کھلتا تھا اور پھر لوہے کے اسپرنگ کی طرح اچٹ کر بند ہو جاتا تھا۔ آخر میں نے اپنا کندھا دروازے کے ساتھ جوڑ کر پوری قوت سے زور لگایا تو میرا دباؤ پڑنے سے پہلے ہی دونوں پٹ آرام سے وا ہو گئے اور میں زور میں بھرا ہوا لڑکھڑاتا ہوا پہلے ایک کرسی سے ٹکرایا اور پھر دھڑام سے قالین پر جا گرا۔ قالین پر سفید چادر میں لپٹی ہوئی انسانی جسم کی طرح کوئی چیز لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کو چھوتے ہی میں تڑپ کر اٹھا اور بیڈروم میں واپس آ کر دروازہ بند کر لیا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی ڈیڑھ دو گھنٹے تک متواتر بجتی رہی۔

ایک روز تیز بارش ہو رہی تھی، رات کے دو بجے میرے بیڈروم کے باہر لان میں بائیسکل کی گھنٹی بجی اور پھر آواز آئی۔ ”تار والا، تار والا، تار والا۔“ میں نے دروازے کی دراڑ سے جھانکا تو واقعی باہر تار والا کھڑا تھا۔ اس نے خاکی وردی پہنی ہوئی تھی، سر پر جھالر والی خاکی پگڑی تھی، گلے میں چمڑے کا تھیلا لٹکا ہوا تھا اور وہ سرخ مڈگارڈ والی بائیسکل کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس ماحول میں ایک جیتے جاگتے انسان کو اپنے لان میں دیکھ کر میرا دل بڑا مطمئن ہوا۔ میں خوشی خوشی دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گیا۔ تار والے نے مجھے سلام کیا۔ اپنی پگڑی میں

کان کے اوپر ٹھونسی ہوئی پنسل نکالی اور تھیلے سے تار کی رسید کا فارم نکال کر مجھے دیا۔ میں نے فارم پر دستخط کر کے واپس کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو میرے سامنے تار والے کی جگہ انسانی ہڈیوں کا ایک خوفناک ڈھانچہ کھڑا تھا۔ لمبے لمبے ناخنوں والی انگلیوں کی ہڈیوں نے کاغذ اور پنسل میرے ہاتھ سے جھٹکا دے کر کھینچ لیے اور ڈھانچے کا جبڑا کٹ کٹ کٹ کر کے اس طرح دانت بجانے لگا جیسے زور زور سے ہنسنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک برآمدے کے پکے فرش پر ہڈیوں کے کھنکنے اور دروازے پر ناخنوں سے کھرونچے مارنے کی آواز آتی رہی۔

اس قسم کے کچھ کہے اور بہت سے اَن کہے واقعات رات کو ساڑھے دس یا گیارہ بجے شروع ہوتے تھے اور صبح کے ٹھیک تین بجے خود بخود بند ہو جاتے تھے۔ میرے طویل و عریض لان کی گھاس میں بے شمار مینڈکوں اور جھینگروں کا بسیرا تھا۔ شام پڑتے ہی ان کے ٹرانے کی آواز اور پیپل کے درخت پر الٹی لٹکی ہوئی چمگادڑوں کی چیخ و پکار آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی لیکن جیسے ہی واقعات کا تسلسل شروع ہوتا تھا، پورے لان پر مکمل سکوت چھا جاتا تھا۔ تین بجے کے قریب جب پہلے مینڈک یا جھینگر یا چمگادڑ کی آواز کان میں پڑتی تھی تو میں بھی سکھ کا سانس لیتا تھا کہ چلیے، آج کی رات کی منزل بھی طے ہوئی لیکن رات کے یہ چار، ساڑھے چار گھنٹے تن تنہا گزارنا بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ میں بڑی آسانی سے وہ گھر کسی وقت بھی چھوڑ سکتا تھا یا ڈرائیور اور خانساماں کو کوٹھی کے اندر سلا سکتا تھا یا اپنے دوست احباب میں سے کسی کو ہمراز بنا کر اس تجربے میں شریک کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا کوئی اقدام نہ کیا اور اپنی ذات کو جان بوجھ کر تن تنہا کئی مہینے لگاتار اس کربناک عذاب میں مبتلا رکھا۔ آج چونتیس پینتیس برس گزرنے کے بعد بھی مجھے اپنے اس غیر منطقی رویے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ غالباً یہ میری انا کی احمقانہ ضد تھی جس نے ان عجیب و غریب واقعات کے چیلنج کو قبول کرنے پر اصرار کیا۔ تفتیش و تجسس کے اس خارزار میں میری تنہاروی محض شوقیہ ہی نہ تھی بلکہ اس کی تہہ میں غالباً یہ خطرہ بھی کارفرما تھا کہ کسی دوسرے کی شراکت سے کہیں بھان متی کا یہ سارا کھیل بالکل ٹھپ ہی نہ ہو جائے۔ اس کا بین ثبوت یہ تھا کہ جب تک میرا ملازم اور ڈرائیور کوٹھی کے اندر موجود رہتے تھے، کسی قسم کا کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہ ہوتا تھا۔ کارروائی کا آغاز ہی اس وقت ہوتا تھا جب دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے تھے۔

اس سارے عرصے میں میرا کشمیری ملازم رمضان اور بنگالی ڈرائیور روز محمد مجموعی طور پر ہر طرح کی ابتلا سے محفوظ رہے۔ فقط دو تین بار ان کے ساتھ کچھ ہلکی سی چھیڑ خانی ہوئی۔ ایک رات رمضان اپنے کوارٹر کی کنڈی چڑھا کر اندر سویا ہوا تھا تو کسی نے اس کی چارپائی الٹ دی۔ ان دنوں بنگال، بہار کے کچھ حصوں میں بڑے شدید ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے۔ رمضان نے یہ سمجھا کہ یہ کسی ہندو کی شرارت ہے۔ اپنے حملہ آور کا تعاقب کرنے وہ باہر کی طرف بھاگا تو اندھیرے میں اس کا منہ کھٹاک سے دروازے کے ساتھ ٹکرا گیا کیونکہ کنڈی بدستور اندر سے بند تھی۔

”اگر وہ ہندو باہر سے آیا تھا تو دروازے کی کنڈی کس طرح بند ہو گئی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”صاحب، یہ قوم بڑی چالاک ہے۔“ رمضان نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”اس میں بھی سالے ہندوؤں کی کوئی چال ہو گی۔“

روز محمد ڈرائیور کے کوارٹر میں کبھی کبھار مختلف قسم کی ہڈیاں پڑی ملتی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سب آوارہ بلیوں اور کتوں کی کارستانی ہے جو دن بھر کوٹھی کے لان میں آزادانہ منڈلاتے رہتے تھے۔ روز محمد اپنے کوارٹر کا دروازہ احتیاط سے بند کر کے رکھا کرتا تھا۔ اس کے سیدھے سادے دماغ کو اس تشویش نے کبھی پریشان نہ کیا تھا کہ بلیاں اور کتے بند دروازے سے گزر کر اس کے کمرے میں ہڈیاں کس طرح ڈال آتے ہیں؟

اس ساری ہنگامہ آرائی کا اصلی ہدف صرف اٹھارہ نمبر کا بنگلا تھا۔ رات ڈھلتے ہی یہ کوٹھی میرے لیے خوف و ہراس، عذاب و عتاب کا جہنم بن جاتی تھی۔ ہر نئے واقعے میں میں اپنی قسم کی دہشت، اپنی قسم کا ہول، اپنی قسم کی وحشت سمائی ہوتی تھی۔ ”پتا کھڑکا، دل دھڑکا“ والا مقولہ مجھ پر حرف بہ حرف صادق آتا تھا۔ یوں تو رات بھر ڈر کے مارے میں بار بار پسینے میں شرابور ہوتا ہی رہتا تھا لیکن کبھی کبھی میرے تن بدن پر خوف و ہیبت کی ایسی تھرتھری، کپکپی اور بدحواسی چھا جاتی تھی کہ نبضیں ڈوبنے لگتی تھیں، دل دھڑکنے لگتا تھا اور دم گھٹ کر گلے میں کانٹے کی طرح پھنس جاتا تھا۔ اس وحشت ناک اور لرزہ خیز ماحول میں میرے پاس خود حفاظتی کا ایک اور صرف ایک ہتھیار تھا، وہ ہتھیار کلمۂ طیبہ تھا لا اِلٰہ اِلا اللّٰہ محمدُالرسولُ اللّٰہ. اگر سو برس کا کافر اپنے آخری سانس میں ایمان لا کر صرف ایک بار یہ کلمہ پڑھ لے تو دوزخ کی آگ سے نجات مل جاتی ہے۔ میری مصیبت تو دوزخ کے عذاب سے کہیں کم تھی۔ مشکل صرف یہ تھی کہ اب تک یہ کلمہ میں نے صرف حلق سے پڑھا تھا، دل سے پڑھنے کی نہ کبھی توفیق نصیب ہوئی تھی نہ ضرورت پیش آئی تھی لیکن خوف و ہراس کی شدت میں بڑا مجبور کن اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اب جو بے کسی و بے بسی کے عالم میں کبھی مجھ پر سانپ گرتا تھا، کبھی میرے پاؤں کا انگوٹھا بھاری میز کے پائے تلے کچلا جاتا تھا، کبھی پتھر آتے تھے، کبھی اینٹیں برستی تھیں، کبھی انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ سامنے کھڑا ہو کر کٹ کٹ دانت بجاتا تھا۔ اس طرح کے خوف کے دباؤ میں آ کر صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ کبھی کبھی دل سے بھی کلمۂ طیبہ کا وِرد ہو جاتا تھا۔

اُن دنوں میرے پاس ایک چھوٹا سا جاپانی گراموفون تھا جو چابی چڑھا کر بجایا جاتا تھا۔ ایک رات میں نے سہگل کا ایک پسندیدہ ریکارڈ سننے کے لیے گراموفون کو چابی دی تو وہ آگے کی طرف گھومنے کی بجائے اسپرنگ کی طرح لپک کر پیچھے کی جانب

امید

خستہ سفینہ!
دور ہے منزل
کھٹن ہے رستہ
وہ منزل تک
کیسے پہنچے
لیکن
دھن کا
بہت ہے
پکا
کھٹن رستے پر
چل
تو پڑا ہے!

نکہت اکرم

لوٹ آئی۔ چابی خود ہی اپنے آپ پہلے سے چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے گراموفون پر ریکارڈ رکھ کر چلایا تو اس میں سے کے۔ ایل سہگل کے گانے کی جگہ عجیب وغریب خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ کچھ آوازیں ایسی تھیں جیسے کسی کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔ بیچ بیچ میں عورت کی سسکیاں سنائی دینے لگتی تھیں، کبھی کبھی ننھے سے بچے کے رونے کی آواز بھی آتی تھی۔ میں نے ایک کاغذ پر کلمۂ طیبہ لکھ کر گراموفون پر رکھا تو فوراً یہ آوازیں بند ہوگئیں اور ریکارڈ کا اصلی گانا بجنے لگا۔ اب میں کاغذ اٹھاتا تھا تو خوفناک آوازیں شروع ہو جاتی تھیں، واپس رکھتا تھا تو اصلی گانا بجنے لگتا تھا۔ تجربے کے طور پر میں نے کلمۂ طیبہ کا اُردو ترجمہ لکھ کر گراموفون پر رکھا تو کوئی اثر نہ ہوا۔ کلمے کے الفاظ کو رومن حروف میں لکھ کر رکھا تو پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ کلمۂ طیبہ کی یہ تاثیر صرف عربی زبان میں پائی۔

کلمۂ طیبہ کے علاوہ میں اپنی تقویت کے لیے آیت الکرسی، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کا ورد بھی اکثر کرتا رہتا تھا۔ ایک رات میرے گردوپیش ہول وہیبت کی فضا اپنے نکتۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ انتہائی شکستگی، مایوسی، اضطراب اور اضطرار کے عالم میں، میں نے قرآن شریف کھولا تو سورۃ الصّٰفّٰت نکلی۔ اس کی ایک سو بیاسی آیات کا ایک ایک حرف میرے لیے آبِ حیات کا گھونٹ ثابت ہوا۔ خوف وہراس کے ماحول میں جب کبھی میں نے اس سورۃ کی تلاوت کی، ہر بار تازہ زندگی اور تابندگی پائی۔

کئی ماہ کی لگاتار ہیبت، وحشت اور آسیبیت کی تہہ میں انجام کار یہ راز کھلا کہ اٹھارہ، بیس برس پہلے اس گھر میں آئی سی ایس کا ایک اوباش افسر رہا کرتا تھا۔ شادی کا جھانسہ دے کر اس نے الہٰ آباد میں کالج کی ایک طالبہ بملا کماری کو ورغلایا اور خفیہ طور پر اسے اپنے ساتھ کٹک لے آیا۔ شادی اس نے کرنا تھی نہ کی۔ سات، آٹھ ماہ بعد جب بملا ماں بننے کے قریب ہوئی تو ظالم نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور لاش کو ڈرائنگ روم کے جنوب مشرقی کونے میں دفن کر دیا۔ اس وقت سے بملا کی نحیف ونزار ماں الہٰ آباد میں بیٹھی بڑی شدت سے اپنی بیٹی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی وقت سے بملا کماری بھی اس کوشش میں سرگرداں تھی کہ کسی طرح وہ اپنی ماں تک صحیح صورتِ حال کی خبر پہنچا دے تاکہ انتظار کے اس کربناک عذاب سے اسے نجات حاصل ہو۔ اس کے علاوہ اس کی اپنی خواہش بھی تھی کہ اس کی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھود کر باہر نکالا جائے۔ اس کے دھرم کے مطابق اس کا کریا کرم کیا جائے۔ اس عرصے میں قاتل خود بھی مر چکا تھا اور اب بملا کی طرف سے پیغام رسانی کی ہر کوشش کو ناکام کرنے میں سرگرم عمل تھا۔

جس روز بملا کی ماں کو اصل صورتِ حال کی خبر ملی اور بملا کی بوسیدہ لاش کو چتا میں رکھ کر جلا دیا گیا، اُسی روز اٹھارہ سول لائنز کے در و دیوار، سقف وفرش سے آسیب کا سایہ اس طرح اٹھ گیا جیسے آسمان پر چھائے ہوئے بادل یکایک چھٹ جاتے ہیں۔ اُس رات نہ مینڈکوں کا ٹرانا بند ہوا نہ جھینگروں کی آواز خاموش ہوئی نہ پیپل کے درخت سے لٹکی ہوئی چمگادڑوں کا شور کم ہوا۔

صبح تین بجے کے قریب اچانک فضا میں لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ کی بے حد خوش الحان صدا بلند ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ مشرق کے اُفق سے ابھرتی ہے اٹھارہ سول لائنز کے اوپر قوس بناتی ہوئی گزرتی ہے اور مغرب کے اُفق کو جا کر چھوتی ہے۔



◆ اس ماہ کی خاص کہانی — یہ کہانی اس شمارے کا خصوصی حصہ ہے ◆

مریم شاہ

وفا ہم نبھائیں گے

آدھی رات کے وقت وہ خاموشی سے گھر سے نکلی اور قبرستان جانے والی سڑک پر چلنے لگی۔ اس کا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔
ابھی وہ جھونپڑی سے قدرے دور تھی کہ ایک سایہ......

وہ پری چہرہ ایک شیطان کو مطلوب تھی مگر کوئی اس کا محافظ تھا

وہ دسمبر کی ایک سرد رات تھی، سرِ شام سے ہی گاؤں میں سناٹا چھا گیا تھا۔ گاؤں والے اپنے اپنے گھروں میں نرم گرم بستروں میں دبکے گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کے تیرتے ٹکڑے چمکتے ستاروں کو کبھی اپنے پیچھے چھپا لیتے تو کبھی ظاہر کر دیتے۔ تیز سرسراتی ہوئی سرد



ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ ہر سو ہو کا عالم تھا۔ کبھی کبھار کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سے اس خاموشی میں ارتعاش پیدا ہو جاتا یا کوئی گیدڑ کھیتوں سے نکل کر اپنی منحوس آواز سے اس سکوت میں ہلچل مچا دیتا۔

ایسے میں رحمت اللہ کھوکھر کے گھر میں اس کی اٹھارہ سالہ لڑکی سردی کی پروا کیے بغیر صحن میں بے قراری سے چکرا رہی تھی' یوں لگتا تھا جیسے وہ کہیں جانے کے لیے بے چین ہو۔ آخر کچھ دیر یوں ٹہلنے کے بعد وہ خاموشی سے گھر سے نکل گئی اور قبرستان کی طرف جانے والی کچی پگڈنڈی پر تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ دونوں طرف لگے ہوئے قد آور درخت رات کی اس تاریکی میں کسی دیو کی مانند لگ رہے تھے لیکن وہ اردگرد سے بے نیاز' بے خوف و خطر قبرستان کی جانب بڑھی چلی جا رہی تھی۔ سرد ہوا میں شدت آ گئی تھی۔ اس نے اپنے گرد لپیٹی سیاہ چادر کو اور بھی سختی سے خود پہ لپیٹ لیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ قبرستان کے آخری کونے پہ بنی جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔

جھونپڑی میں موجود بدہیئت شکل والے آدمی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ زمین پہ چوکڑی مارے بیٹھا ہاتھ میں پکڑی موٹے اور رنگ دار دانوں والی تسبیح کو تیزی سے گھما رہا تھا۔ اسی طرح کی کئی مالائیں اس کے گلے میں بھی تھیں۔ وہ اپنے حلیے اور انداز سے کوئی سادھو لگ رہا تھا۔

''آؤ...... آؤ...... ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔''

لڑکی کو دیکھ کر اس کی لال لال موٹی آنکھوں میں چمک ابھری اور بڑی بڑی مونچھوں تلے لبوں پہ پراسرار مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔ لڑکی سر جھکائے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''ہمیں معلوم ہے' تم کس لیے آئی ہو؟'' سادھو کی رعب دار آواز جھونپڑی میں گونجی۔

''آپ آنکھوں والے ہیں' سب سمجھ سکتے ہیں۔ میری کیا مجال جو آپ کے سامنے بول سکوں۔'' لڑکی کے انداز میں عقیدت در آئی۔

''ہوں...... تمہارا کام ہو جائے گا لیکن......'' وہ بولتے بولتے رکا۔

''لیکن کیا مہاراج؟'' وہ بے چینی سے بولی۔

''تمہیں ہمارے پاس روز آنا ہو گا۔'' سادھو کی بات پر وہ پریشان ہو گئی۔

''نہیں مہاراج...... میں روز نہیں آ سکتی۔'' اس کے انکار پر سادھو سوچ میں ڈوب گیا اور کچھ دیر بعد سر اٹھا کر بولا۔

''ہر مہینے کی نوچندی اتوار کی رات۔''

''ہر مہینے لیکن کیوں مہاراج؟ کیا عمل زیادہ لمبا ہے؟''

لڑکی کے استفسار پر سادھو پرجلال لہجے میں بولا۔ ''بس زیادہ سوال مت کر' اگر کام کروانا ہے تو آ جا ورنہ......''

''ناراض مت ہو مہاراج...... میں آ جایا کروں گی۔''

''ٹھیک ہے' اب تم جاؤ۔'' سادھو نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور تیزی سے تسبیح گھمانے لگا۔ وہ لڑکی اٹھی اور بڑی عقیدت سے سادھو کے ہاتھ کو چوم کر باہر نکل آئی۔ اب اس کے قدم واپس گھر کی جانب تھے۔

•......•......•......•

''بانو...... بانو...... اٹھ جا...... سویر ہو گئی اے۔'' بانو کی اماں حمیداں اسے جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے سستی سے اوں کہہ کر دوبارہ سے لحاف اوپر لے لیا۔ ''اماں......! سونے دے ناں۔''

''چل ہٹ...... اتنی دیر سونا اچھا نہیں' اٹھ جا' تیرا ابا تجھے بلا رہا ہے بانو پتر!'' حمیداں نے اسے اٹھانے کی آخری کوشش کی تھی لیکن وہ پھر سے کروٹ بدل کر سوتی بن گئی۔ حمیداں اسے گھورتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی اور چھوٹے سے باورچی خانے میں آ کے ناشتہ بنانے لگی۔

''شکر ہے' دھوپ نکل آئی' کتنے دنوں بعد سورج نے اپنی شکل دکھائی ہے۔'' رحمت آسمان کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا اور حمیداں کے پاس پیڑھا کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ''بانو دھی نہیں اٹھی؟'' اس کے لہجے میں بیٹی کے لیے محبت تھی۔

''نہیں...... ایک نمبر کی ڈھیٹ ہے یہ لڑکی۔'' حمیداں توے پہ سینکی روٹی پہ دیسی گھی لگاتے ہوئے بولی تو رحمت ہنس دیا۔

''ارے' چھڈ غصہ' بچی ہے اور فیر اکو اک دھی ہے ہماری۔ لاڈ تو دکھائے گی ناں۔''

''رہن دے توں رحمت' بچی ماشاء اللہ' جوان ہو گئی ہے۔ تیرے لاڈوں نے بگاڑا ہے اسے۔'' حمیداں نے اس کے آگے روٹی اور سالن رکھتے ہوئے کہا۔

''لے' نرا میں نے ہی تو نہیں بگاڑا اسے' آخر تیری بھی تو دھی ہے۔'' رحمت روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے بولا۔

''ہاں' میری بھی دھی ہے' میں انکاری تھوڑی آں' بس یہ کہتی ہوں کہ کچھ گھر داری سیکھ لے' آخر کل کلاں اس کا ویاہ بھی تو کرنا ہے نا۔ رَب جانے' اس کے نصیبوں میں کیا لکھا ہے؟ ڈر لگتا ہے دھیوں کے مقدر سے رحمت' ہور گل کوئی نہیں۔'' حمیداں فکرمندی سے بولی تو کچھ دیر کے لیے رحمت بھی خاموش سا ہو گیا۔

پھر سر جھٹک کر بولا۔ ''جھلی ناں ہوئے تے۔ نہ پریشان ہوا کر' بس اللہ اگے دُعا کیا کر کہ وہ ہماری دھی ہی نہیں بلکہ سب کی دھیوں کے نصیب اچھے کرے۔'' حمیداں نے زیرلب ''آمین!'' کہا اور اپنے دل میں آنے والے وسوسوں کو جھٹکنے کی کوشش کرنے لگی۔

القرآن

اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو' بے شک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

(سورہ یوسف' آیت: ۸۷)

•......•......•......•

''اماں! میں پانی لینے کھوہ پہ جا رہی ہوں۔'' شام ہو چکی تھی۔ بانو نے گھڑا اٹھایا اور اماں کو گویا اطلاع دیتی ہوئی جھپاک سے باہر نکل آئی۔ حمیداں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ بانو یہ واحد کام بڑی تندہی سے انجام دیتی تھی۔ حمیداں کے لیے یہ بھی غنیمت تھا کیونکہ اس کی ہڈیوں میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ دور پرانے کھوہ سے پانی لا سکے۔ وہ تو بانو کے جانے پہ راضی نہ تھی لیکن مجبوری تھی' گھر میں کوئی کوئی اور تھا بھی تو نہیں' رحمت تو سارا دن چوہدریوں کے کام کرتا تھا۔

بانو نے کھوہ کی طرف جانے والے رستے پہ قدم بڑھائے ہی تھے کہ اس کی سہیلی زلیخا بھی آ گئی۔ دونوں سہیلیاں باتیں کرتے ہوئے چل پڑیں۔

''بانو! تیرا کیا خیال ہے' وہ تجھ سے ملنے آئے گا؟''

''ہاں' کیوں نہیں' وہ ضرور آئے گا۔'' بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا جی' اتنا یقین' وہ بھی ایک اجنبی پر؟'' زلیخا نے شرارت اور شوخی سے کہا۔

''ہاں اور سن تو اسے اجنبی تو مت بول' جو دل

میں بس جاتا ہے ناں' وہ پھر اجنبی نہیں رہتا' اپنا ہو جاتا ہے' ویسے بھی کیا تو نہیں جانتی' وہ قول کا کتنا پکا اور سچا ہے؟'' بانو کے لہجے میں یقین تھا۔

''ہاں' یہ تو ہے' جب سے وہ اس گاؤں میں آیا ہے' ہر طرف اس کے اخلاق اور کردار کا چرچا ہے' پر......'' زلیخا نے بات ادھوری چھوڑی۔ بانو نے الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

''پر کیا زلیخا؟''

''پتہ نہیں' وہ کون ہے' اس کا تو کوئی آگے پیچھے بھی نہیں' نہ ذات پات کا پتہ اور پھر نہ جانے وہ......'' زلیخا کہتے کہتے رکی۔ بانو اس کی بات کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

''دیکھ' اسے غلط مت کہو' اس کے بارے میں ایک بھی غلط حرف نہ سنوں گی' سمجھی تو؟ پیار ہے وہ میرا اور پھر پیار ذات پات' رنگ' نسل اور دولت کو دیکھ کر تھوڑی کیا جاتا ہے' پیار تو پیار ہووے ناں۔'' بانو کے چہرے پہ محبت کے تمام رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی موٹی موٹی سیاہ کاجل بھری آنکھیں کہیں کھو گئی تھیں۔ قدم بھی خود بخود تھم گئے۔

زلیخا نے رشک سے اسے دیکھا تھا۔ اگر پنڈ کا سوہنا گبھرو جوان اسے چاہتا تھا تو وہ خود کون سا کم تھی' سرخ و سفید رنگت' کھڑی ناک' احمریں سے لب اور ان کے پاس چھوٹا سا سیاہ تل' جب وہ مسکراتی تھی تو وہ تل بھی مسکرا اٹھتا' سیاہ لمبے بالوں کی چوٹی اس کی نازک سی پتلی کمر پر جھولتی تھی' اٹھارہ برس کی عمر میں اس پہ بھرپور جوانی چڑھ آئی تھی۔

کھوہ پہ پہنچ کر بانو برگد کے بڑے سے درخت کے نیچے جا بیٹھی جبکہ زلیخا کھوہ سے پانی بھرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ہی ایک خوبصورت نوجوان بانو کے پاس آ بیٹھا۔ بانو نے خفگی سے اسے دیکھا اور رخ موڑ لیا جبکہ اس کے خوبصورت ہونٹوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''معاف کر دو' تھوڑی دیر ہو گئی' ایک ضروری کام پڑ گیا تھا' ادھر دیکھو میری طرف۔'' نوجوان کے دھیمے دھیمے محبت بھرے لہجے میں نہ جانے کیسا جادو تھا کہ وہ بے اختیار اسے دیکھنے لگی۔

نوجوان کی نیلی آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی' اس کا خوبصورت سفید چہرہ سیاہ بالوں کے ہالے میں کسی چاند کی مانند دمکتا تھا' جب وہ مسکراتا تو اس کے سفید موتیوں جیسے دانتوں سے ایک روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوتی۔ اسے گاؤں میں آئے ایک سال ہونے کو تھا' کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا لیکن سبھی اس کے اخلاق کے دیوانے تھے۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار تھا۔

''یوں کیا دیکھ رہی ہو؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''پتہ ہے شہریار' تم بہت خوبصورت ہو۔ اگر تم لڑکی ہوتے ناں' اب تک گاؤں کے تمام لڑکے تمہارے پیچھے لگ چکے ہوتے اور کوئی نہ کوئی......'' اس نے شرارت سے بات ادھوری چھوڑی تو وہ ہنس دیا پھر سنجیدگی سے بولا۔

''بانو' اگر ہم دونوں ایک نہ ہو سکے تو......''

''تو میں اپنی جان دے دوں گی' سنا تو نے؟ نہیں رہ سکتی میں تیرے بغیر۔'' بانو نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''کتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟''

شہریار کے وجود سے اٹھتی مہک نے اسے مدہوش کر دیا۔ ''بہت زیادہ......'' بانو نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''سچ بانو......!'' اس نے یقین چاہا۔

''ہاں' بالکل سچ۔''

''تو پھر دنیا کی کوئی بھی طاقت ہمیں الگ نہیں کر سکتی۔'' شہریار نے بانو کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

دور کھڑی زلیخا نے اسی وقت ایک عجیب منظر دیکھا' اسے یوں محسوس ہوا جیسے برگد بھی ان کی محبت پہ جھوم رہا ہو' اسے برگد کے درخت کی شاخوں سے نیلی شعاعیں پھوٹتی محسوس ہوئی تھیں۔

•......•......•......•

وہ نوچندری اتوار کی رات تھی' ہلال پوری شدومد سے آسمان پر چمک رہا تھا۔ اماں' ابا اور بانو بڑی سی چارپائی پہ بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے بانو کا ذہن تو سادھو کی طرف تھا جس نے آج رات اسے بلایا تھا۔ تمام کام نبٹا کر اماں فارغ ہوئی تو رات کے نو بج رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں بے قراری سے اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہی تھی۔ اسی بے چینی میں وہ باہر نکلی تو سامنے ہی ابا کھڑا تھا۔

''دھیئے' کھڑکی اور دروازہ اچھی طرح بند کر لینا۔'' وہ جاتے جاتے پلٹا۔ ''اور تو کمرے سے باہر کیوں آئی؟''

''کچھ نہیں ابا' پیاس لگی تھی' پانی پینے آئی تھی۔''

''اچھا چل ٹھیک ہے' میں ادھر کھڑا ہوں' پانی پی آ۔'' وہ کچن کی طرف آئی' گھڑے سے پانی نکال کر پینے لگی۔ واپس آئی تو ابا اپنی جگہ موجود تھا۔

''ابا' اب تو جا کے سو جا۔'' اس نے کہا تو وہ کمرے میں چلا گیا۔

آدھی رات کے وقت وہ چارپائی سے اٹھی اور باہر آ کے اماں ابا کے سونے کا اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد وہ چپکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کا رخ قبرستان کی جانب تھا۔ رات بے حد تاریک اور سرد تھی۔ کچھ دیر پہلے تک تو چاند خوب چمک رہا تھا' اچانک ہی سیاہ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا اور تیز ہوا بھی چلنے لگی تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی جھونپڑی کے قریب آئی تو اگربتیوں کی تیز خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھونپڑی کے باہر ٹھہری اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ سادھو کے سامنے عقیدت سے دوزانو بیٹھ کر اس نے سلام کیا۔ اس نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

''مہاراج...... میرا کام؟'' وہ دھیرے سے بولی۔

''اتنی جلدی کیا ہے؟ تم پہ منحوس قسم کے اثرات ہیں جس کے لیے مجھے تین دن کا چلہ کاٹنا ہوگا۔''

''اثرات' کیسے اثرات؟'' وہ چونکی۔

''کالے جادو کے......'' سادھو نے پراسرار لہجے میں کہا۔

''کالا جادو؟ مجھ سے کسی کی بھلا کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟''

''ضروری نہیں' کوئی دشمن ہی وار کرے' کوئی عزیز' کوئی دوست حسد میں بھی ایسا کر سکتا ہے۔ تمہاری خوبصورتی سے جل کر یا پھر......'' سادھو نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑی۔

''یا پھر کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''یا پھر تمہاری عزیز از جان چیز حاصل کرنے کے لیے۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''لیکن تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں' سب ٹھیک ہو جائے گا' میں تمہیں دم کر دیتا ہوں جس سے کوئی تم پر کاری وار نہیں کر سکے گا۔ تم حفاظت میں رہو گی اور وہ تمہیں پہلے سے زیادہ چاہے گا اور ہاں' تمہارے ملن کی رکاوٹ دور کرنے کے لیے چلہ کرنا ضروری ہے۔ تم مستقل آتی رہنا بالکے۔'' وہ خاموشی سے سادھو کی باتیں سن رہی تھی۔

''ٹھیک ہے مہاراج......''

سادھو نے منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھا اور اس

پر پھونک دیا۔ ”جا اب تجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”شکریہ مہاراج......“ وہ عقیدت سے اٹھ کر جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔ دم ہونے پر وہ خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

•......•......•......•

بانو برگد کے درخت کے پاس کھڑی تھی‘ کچھ ہی فاصلے پر اس کا محبوب شہریار دوسرے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ آج اس کے محبوب کا رنگ پیلا ہو رہا تھا اور خلاف توقع وہ بہت خاموش اور کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔

”کیا بات ہے شہریار‘ تو ٹھیک نہیں لگ رہا؟“ بانو فکرمندی سے بولی۔

”ہوں......ٹھیک ہوں۔“

وہ اپنے محبوب کے نزدیک جانا چاہتی تھی مگر نہ جانے کون سی طاقت تھی جس نے اسے روک رکھا تھا۔

”بانو......کیا ہوا‘ میرے پاس آؤ۔“

”پتہ نہیں شہریار‘ کیا بات ہے؟ میں تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں مگر آ نہیں سکتی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”اچھا‘ میں آتا ہوں۔“ وہ نقاہت زدہ آواز میں کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا مگر جیسے ہی بانو کے قریب پہنچا‘ اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ اس کے چہرے پہ تفکرات کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس کی نیلی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

”بانو‘ جاؤ‘ گھر جاؤ۔“ وہ نڈھال سے انداز میں دوبارہ زمین پر بیٹھ گیا۔

”مگر......“

”میں نے کہا ناں‘ جاؤ۔“ وہ جانے کے لیے مڑی تو شہریار نے پکارا۔ ”سنو۔“ وہ اس کی طرف پلٹی۔ ”یہ لو‘ اسے گلے میں پہن لینا‘ تمہاری حفاظت کرے گا اور ہاں‘ ہو سکتا ہے‘ میں چند دنوں کے لیے گاؤں سے باہر چلا جاؤں‘ پریشان مت ہونا‘ جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔“ اس نے ایک تعویذ بانو کی طرف اچھال دیا۔ بانو نے اس تعویذ کو فوراً اٹھایا اور واپس گھر آ گئی۔ شہریار کا دیا ہوا تعویذ اس نے اپنے گلے میں ڈال کر اسے وارفتگی سے چوم لیا تھا۔

•......•......•......•

زلیخا اچانک ہی بیمار ہو گئی تھی۔ بانو کو پتہ چلا تو وہ دوڑی دوڑی اس کے پاس پہنچی۔

”زلیخا......!!“ چارپائی پہ لیٹی زلیخا کو دیکھ کر بانو حیرت سے چیخی۔ ”یہ...... یہ کیا ہوا؟“ دو دن کے بخار سے ہی زلیخا ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔

”پتہ نہیں بانو‘ اچانک ہی کمر میں درد اٹھا‘ اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہیں کیا ہوا‘ بس ایسا لگتا ہے‘ کوئی میرے جسم سے جان نکال رہا ہے۔“ وہ نقاہت سے بمشکل بول رہی تھی۔

”کچھ نہیں ہو گا تجھے۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے بولی۔ اس کی بات پر زلیخا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

”نہیں بانو‘ میرا کوئی پتہ نہیں‘ کب سانسیں رک جائیں‘ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“

”یہ کیسی باتیں کر رہی ہے تو؟“ بانو تڑپ کر بولی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی‘ زلیخا کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔

”زلیخا......زلیخا......“ بانو چیختی ہوئی چاچی‘ چاچا کو بلانے باہر بھاگی لیکن ان کے آنے تک زلیخا کی سانسیں تھم چکی تھیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنوں کو روتا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ جوان بیٹی کی موت پر ماں باپ نوحہ کناں تھے جبکہ بانو صدمے سے ساکت کھڑی تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن لگتا تھا جیسے اس کے آنسو خشک ہو گئے ہوں‘ پل کے پل میں سارا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا‘ ہر ایک اس جوان موت پہ افسردہ تھا۔

زلیخا کی اماں نے بانو کو جھنجھوڑ ڈالا۔ ”بانو پتر! زلیخا مر گئی‘ مر گئی زلیخا۔“ وہ بین کر رہی تھیں۔

”نہیں‘ نہیں‘ زلیخا نہیں مر سکتی۔“ اس کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی۔ ”مم......میری سہیلی......زلیخا......نہیں......“ اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ سب عورتیں اس کی طرف دوڑیں۔

”ہائے‘ بچپن کی سہیلی تھی‘ کتنا پیار تھا دونوں میں۔“ سب افسوس کر رہی تھیں۔

•......•......•......•

زلیخا کو دنیا سے گئے ہوئے ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا تھا۔ اس کا کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ راتوں کو سو نہ پاتی۔ اسے شہریار کی ضرورت تھی لیکن اس کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ کتنا تڑپ رہی تھی وہ زلیخا اور شہریار کے لیے مگر کچھ نہیں کر سکتی تھی‘ بس بے بسی سے آہ بھر کر رہ جاتی تھی۔

اس رات بانو جب سونے کے لیے لیٹی تو اسے یاد آیا کہ کافی دنوں سے وہ سادھو کے پاس بھی نہیں گئی لیکن اگلے لمحے ہی اس نے سر جھٹک کر سادھو کے خیال سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ نجانے کیوں اسے لگ رہا تھا‘ وہ سادھو اسے فریب دے رہا ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اس کے پاس نہیں جائے گی۔ اس نے سونے کے لیے آنکھیں بند کیں۔ ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے کمرے میں کوئی موجود ہے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس نے اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ سونا چاہا۔ اس بار کستوری اور لوبان کی خوشبو نے اسے چونکا دیا‘ تبھی اس کے کانوں میں سرسراہٹ نما سرگوشی گونجی۔

”بانو......بانو......“ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”کک......کک......کون؟“ اس نے ہراساں ہو کر پکارا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دوبارہ پکارا۔ ”کک......کون ہے؟“ پھر وہ کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی تھی۔

اس نے اماں‘ ابا کے کمرے کی طرف دیکھا‘ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا۔ ’کیوں نا‘ اماں کو اٹھاؤں مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور واپس کمرے میں آ گئی۔

”کیا ہو رہا ہے یہ؟“ وہ بڑبڑائی۔

اچانک اسے کسی چیز کا احساس ہوا۔ بے اختیار اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا تو اس پر انکشاف ہوا کہ گلے سے تعویذ غائب تھا۔ وہ سکتے میں رہ گئی‘ اس نے سارا کمرا چھان مارا‘ باہر صحن میں بھی دیکھ آئی لیکن تعویذ کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

اسے تعویذ کے گم ہو جانے کا بے حد دکھ تھا اسی لیے وہ دوسرے دن پرانے کھوہ کی طرف چلی آئی تھی۔ یہاں آ کر اس کی تمام یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔

”زلیخا......شہریار......“ اس کے لبوں سے سسکی سی نکلی اور ان دونوں کی یاد میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ چلتی ہوئی برگد کے درخت کے پاس آ گئی۔ یہ درخت زلیخا کی طرح اس کے بچپن کا ساتھی تھا۔ بانو اور زلیخا گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ یہیں کھیلا کرتی تھیں پھر شہریار بھی آ گیا‘ اس کا محبوب‘ اس کی باتیں اور یادیں‘ وہ تڑپ کر برگد کے درخت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اسے لگا‘ برگد کا درخت بھی اس کے غم میں رو رہا ہو۔ کافی دیر اپنا غم ہلکا کرنے کے بعد بانو گھر چلی آئی۔

بانو بے قراری سے آدھی رات کے بیتنے کا انتظار کر رہی تھی۔ نوچندی اتوار ابھی بہت دور تھی۔

’آج مجھے سادھو کے پاس جانا چاہیے۔‘ اس نے سوچا۔

"نہیں بانو' مت جانا۔" اسے اپنے قریب سے آواز آئی تو وہ چونک کر پلٹی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

آدھی رات ہوئی تو وہ خاموشی سے گھر سے نکلی اور قبرستان کی طرف جانے والی سڑک پر چلنے لگی۔ اس کا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا جیسے اسے کسی انہونی کے ہونے کا احساس دلا رہا ہو۔ وہ خوفزدہ سی تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ آج اسے اتنا خوف کیوں محسوس ہو رہا تھا؟ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ آج قبرستان کا رستہ بھی قدرے طویل ہو گیا تھا تبھی اس کی چھٹی حس نے باور کرایا کہ اس کے پیچھے کوئی آ رہا ہے' یکبارگی بانو نے پلٹ کر دیکھا لیکن دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ چند قدم بڑھی تو کوئی نرم سی شے اس کے پیروں سے ٹکرا کر گزر گئی۔ اس کے قدموں میں اور تیزی آ گئی۔ ابھی وہ جھونپڑی سے کچھ دور تھی کہ ایک سایہ سا تیزی سے اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل گیا۔ خوف اور گھبراہٹ کے عالم میں وہ جھونپڑی میں داخل ہو گئی لیکن اندر کے منظر نے اسے مزید زیادہ دہشت زدہ کر دیا۔ سادھو کسی نادیدہ قوت سے نبرد آزما تھا۔ سادھو کے سر سے خون بہہ رہا تھا' لگتا تھا جیسے اس کے سر میں کسی نے کوئی سخت شے دے ماری ہو۔ اچانک سادھو کی نظر بانو پہ پڑی۔

"تم......" وہ سب بھول گیا' لگتا تھا' وہ غیر مرئی شے چلی گئی ہو۔ بانو کا سفید رنگ دہشت سے پیلا پڑ چکا تھا۔

"آؤ......" وہ بارعب انداز میں بولا۔ اب وہ بالکل نارمل لگ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو بلکہ اس کے سر کا زخم بھی غائب ہو چکا تھا۔ وہ لرز گئی' تاہم کسی سحر کے زیر اثر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی سادھو کے قریب آنے لگی۔ اسی وقت وہی آواز اس کے کان میں گونجی۔

"بانو' بھاگ جاؤ۔" وہ جو کوئی بھی تھا' اس کا خیر خواہ تھا۔ اچانک بانو پلٹی اور باہر کی جانب بھاگی لیکن سادھو نے اسے قابو کر لیا۔

"کہاں چلی؟ اب میں تجھے نہیں جانے دوں گا' بہت صبر اور انتظار کیا ہے۔" وہ سفاکی سے بولتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔ بانو نے اپنی سانس روک لی۔ سادھو میں سے بدبو کے بھبکے نکل رہے تھے۔

"مجھے جانے دو......" وہ گڑگڑائی۔

"تجھے جانے دوں؟ بڑی مشکل سے تو ہاتھ لگی ہے۔ اچھا ہوا تو خود آ گئی ورنہ میں کوئی اور طریقہ اختیار کرتا۔" سادھو نے اسے دھکا دیا۔ بانو لڑکھڑا کر گر پڑی۔ وہ اس کے اوپر جھکا تو اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ سادھو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ تڑپ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے شیطانی منصوبے میں کامیاب ہوتا' کسی نے سادھو کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

"ذلیل...... کمینے...... تو باز نہیں آیا اپنے گندے ارادوں سے' آج تو نہیں بچے گا' زندہ نہیں چھوڑوں گا میں تجھے......" کسی نادیدہ وجود کی آواز گونجی' ساتھ ہی سادھو کے حلق سے دردناک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کی پشت پہ جلنے کا نشان ابھرا۔ بانو دم سادھے سب دیکھ رہی تھی۔

"رومان' چھوڑ مجھے' تجھے جلا کر بھسم کر دوں گا۔" سادھو چلایا لیکن دوسرے ہی پل پھر تڑپ گیا۔ رومان نامی اس نادیدہ شخص نے اس کی گردن دبائی تھی' تاہم سادھو خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا اور غصے میں چلایا۔

"میں کہتا ہوں' چلا جا یہاں سے۔" اس بار خاموشی چھا گئی۔ "ہاہاہا...... بس یہاں تک تیری طاقت تھی ہاہاہا......" وہ قہقہے لگاتا ہوا بانو کی طرف پلٹا۔ وہ گھبرا کر دروازے کی طرف سرک گئی۔ سادھو

نے اس کے قریب جانے کی کوشش کی تو ٹھٹک گیا۔

"تم پھر آ گئے؟" شاید رومان' بانو اور سادھو کے درمیان دیوار بن کر کھڑا تھا۔

"اب تم نہیں بچ سکتے شنکر مہاراج......" اس نے کہا اور دوسرے پل بجلی سی چمکی' سادھو کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ بانو خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

•......•......•......•

بانو نے آنکھ کھولی تو اس نے خود کو اپنے کمرے میں پایا۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔

"مم...... میں تو...... اف میرے خدا!...... کک...... کیا وہ کوئی خواب تھا؟ سادھو...... اندھیری رات...... اور وہ سب...... بہت برا ہوا' بہت برا' شنکر مہاراج' ہندو اور...... اور...... وہ نادیدہ شخص...... رومان...... اگر وہ نہ ہوتا تو......" وہ لرز گئی تھی۔ ابھی وہ ان گتھیوں میں الجھی ہوئی تھی کہ باہر سے ابا کے تیز تیز بولنے کی آواز آئی۔ بانو فوراً کمرے سے نکلی۔

"پتہ نہیں کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے اس گاؤں پہ؟ اللہ رحم کرے!" رحمت پریشانی سے بول رہا تھا۔

"ہوا کیا ہے بانو کے ابا؟" حمیداں نے فکرمندی سے پوچھا۔

"وہ...... قبرستان میں جو درویش نہیں رہتا تھا' اسے قتل کر دیا گیا ہے رات...... قاتل نے اس کا سر جسم سے الگ کر دیا ہے۔" رحمت نے بتایا تو بانو کی اماں کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"یہ کک...... کیا کہہ رہے ہو رحمت؟"

"صحیح کہہ رہا ہوں حمیداں' پولیس تفتیش کرتی پھر رہی ہے' کھوجی کو بلایا گیا ہے تاکہ وہ قاتل تک پہنچنے میں ان کی مدد کرے۔" رحمت نے مزید بتایا تو بانو کا دل کانپ کر رہ گیا کیونکہ وہ جانتی تھی' قاتل کون ہے؟

رات کے اس پہر وہ بھی وہاں موجود تھی اور اگر کھوجی نے کھرا نکال لیا تو؟ اس کے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ قاتل نہیں تھی لیکن اس کے دل میں چور تو تھا ناں' اگر اماں ابا کو پتہ چل گیا تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔ اس نے گھبرا کر ماں باپ کو دیکھا جو اپنی باتوں میں مگن تھے۔ وہ خاموشی سے دوبارہ کمرے میں آ کے لیٹ گئی۔

پولیس نے قاتل کو پکڑنے اور اس کا سراغ لگانے کا کام رمضان ماچھی کے حوالے کیا تھا۔ وہ گاؤں کا بڑا ماہر اور مشہور کھوجی تھا' آج تک کوئی قاتل اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا لیکن رمضان ماچھی کو اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب وہ سادھو کے قاتل کا سراغ لگانے قبرستان پہنچا کیونکہ وہاں کسی بھی قسم کا کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ اس نے چپہ چپہ چھان مارا' باریک بینی سے بار بار دیکھ لیا لیکن اسے سراغ نہ ملا۔ وہ حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔

ڈی ایس پی یاور حیات پریشانی سے اپنے دفتر میں ٹہل رہا تھا۔

"آخر قاتل کون ہے؟ اور پھر اتنا ماہر کہ سارے ثبوت بھی مٹا دیئے؟ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق سادھو کو تیز دھار آلے سے قتل کیا گیا تھا اور اس کے جسم پہ چوٹوں کے نشان بھی پائے گئے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ قتل ہونے سے پہلے قاتل کے ساتھ گتھم گتھا ہوا لیکن خود کو بچانے میں ناکام رہا اور قاتل نے اپنا کام کر دکھایا۔ وہ ان ہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ سنتری نے اسے بتایا کہ ایک نوجوان ملنا چاہتا ہے۔

"مجھ سے؟" ڈی ایس پی بڑبڑایا۔ "اچھا' بھیجو اندر۔" سنتری واپس مڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔

”السلام علیکم!“ اس نے اندر آتے ہی سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام!“ یاور حیات اسے دیکھ کر بے اختیار آگے بڑھا۔ دونوں بغل گیر ہوئے۔ ”کیسے ہو؟“ ڈی ایس پی نے اس سے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک۔“ نوجوان کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

”بیٹھو۔“ یاور حیات نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”ہاں بولو جناب شہریار صاحب‘ کہاں غائب تھے اتنے روز سے؟“ یاور نے اس سے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے یار‘ شہر گیا تھا کسی کام سے۔“ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

”اچھا بولو‘ کیا کھاؤ گے؟ ویسے تو میرا دل چائے پینے کو چاہ رہا ہے۔“ ڈی ایس پی یاور نے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

”تو منگوالو۔“

”تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ ڈی ایس پی نے شہریار کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں...... کچھ نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہوں۔“ شہریار کے چہرے پہ فکرمندی کی لکیریں ابھریں تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیوں؟“

”بتاتا ہوں‘ پہلے چائے تو منگواؤ۔“ شہریار نے کہا۔

”او کے باس......“ ساتھ ہی ڈی ایس پی نے فون اٹھایا اور چائے لانے کا کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دونوں چائے پی رہے تھے۔

”ہاں‘ اب بولو‘ کیا بات ہے؟“ یاور نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”یار‘ وہ جو قتل ہوا ہے ناں‘ اسی سلسلے میں تم سے کچھ کہنے آیا ہوں۔“ شہریار کی بات پر ڈی ایس پی نے چونک کر ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ میز پہ رکھ دیا۔

”مجھے اس قتل نے الجھنوں میں ڈال رکھا ہے یار‘ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کیس کا سرا کیسے ملے گا؟“ یاور پریشانی سے بولا۔

”اسی الجھن سے تو نکالنے آیا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ اس قتل کے پیچھے کون ہوسکتا ہے؟“ شہریار نے سوال کیا۔

”یار‘ یہی تو پتہ چلانا مشکل ہے۔“ یاور نے کہا اور ساتھ ہی مختصر لفظوں میں اسے واردات کے متعلق تفصیل سے آگاہ کیا۔

”ہوں...... میرے خیال میں یہ کام کسی نادیدہ ہستی کا ہوسکتا ہے ورنہ تم خود سوچو‘ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ قتل بھی کرے اور اپنا نام و نشان بھی نہ چھوڑے۔ میری معلومات کے مطابق‘ وہ سادھو کوئی چلہ بھی کاٹ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ چلہ الٹ ہوگیا ہو اور اس ماورائی شے نے جسے وہ قابو کرنے کے چکر میں تھا‘ اسے قتل کردیا ہو۔“

شہریار کی بات پر یاور اسے پرسوچ نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن مجھے یقین نہیں آرہا‘ اس کے جسم پہ چوٹوں کے نشان بھی ہیں۔“

”ارے بھئی‘ ان ان دیکھی طاقتوں کے اختیار میں سب کچھ ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے‘ اس کا مقابلہ کسی طاقت ور جن سے ہوا ہو اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ جن کسی بھی روپ میں آسکتا ہے خواہ وہ جانور کا روپ ہو یا پھر انسان کا‘ ویسے مقتول کی لاش کہاں ہے؟“ شہریار نے پوچھا۔

”وہ ابھی ہسپتال کے مردہ خانے میں ہی ہے۔“ یاور نے بتایا۔

”جتنی جلدی ہوسکے‘ اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دو بلکہ اسے جلا دو۔“ شہریار نے پراسرار لہجے میں کہا تو یاور نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم‘ اس کی لاش جلا دوں لیکن وہ تو مسلمان ہے ناں پھر کیوں؟“ وہ الجھ کر بولا۔

”سنو۔“ شہریار ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ”وہ مسلمان عامل نہیں تھا بلکہ ایک ہندو آدم خور شنکر تھا جو کالے جادو کا ماہر تھا اور بہروپ بھر کر اس گاؤں میں رہ رہا تھا اور مزید شکتیاں حاصل کرنے کے لیے وہ چلے کاٹنے میں مصروف تھا۔ وہ کالے شیطان دیوتا کا پجاری تھا۔ اسے خوش کرنے کے لیے ہر وہ گھناؤنا اور گندہ فعل کرتا تھا جس کی ہمارے اسلام میں سختی سے ممانعت ہے۔ اسے ہر وہ کام کرنا تھا جس سے شیطان دیوتا خوش ہوکر اپنی تمام پراسرار شکتیاں اسے سونپ دیتا۔ وہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے خوبصورت لڑکیوں کو اپنا شکار بناتا اور پھر انہیں شیطان دیوتا کے چرنوں میں جا کے ذبح کر کے اُن کا گوشت کھاتا اور خون پیتا تھا۔ اس نے تین ماہ تک یہ گھناؤنا کھیل یہاں سے چند میل کے فاصلے پہ واقع گاؤں میں کھیلا لیکن جلد ہی اس کا پول کھل گیا۔ وہاں سے وہ اپنی جان بچا کر بھاگ نکلا اور مختلف ٹھکانے بدلتا ہوا اس گاؤں میں آگیا مگر اس نے یہاں یہ حکمت عملی اختیار کی کہ وہ اپنا شکار گاؤں کی لڑکیوں کے بجائے آس پاس کے علاقوں سے حاصل کرتا۔ اس کی طاقتوں میں اضافہ ہوا تو اس نے اپنے استاد کے کہنے پہ ایسی لڑکی کی تلاش شروع کردی جس کا جنم اماوس کی تاریک رات میں ہوا ہو جس کا گوشت کھا کر اور خون پی کر وہ جادونگری کا بے تاج بادشاہ بن سکتا تھا۔ اماوس کی رات میں پیدا ہونے والی لڑکی کی نشانی یہ تھی کہ اس کے جسم یا گردن پہ کالا گہرا نشان ہوگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتا‘ اسے قتل کردیا گیا لیکن اصل کہانی تو اب شروع ہوگی۔ اگر اس کی لاش کو جلایا نہ گیا تو اس کا گرو اور اس کی غلام روحیں اسے نکال لے جائیں گی اور اس کا جو مقصد ادھورا رہ گیا ہے‘ وہ پورا کر کے اسے دوبارہ زندگی دے دیں گی پھر بہت تباہی مچے گی‘ جانے کتنی معصوم لڑکیاں اس شیطان کی ہوس کی بھینٹ چڑھیں گی؟ خون کی ہولی کھیلی جائے گی؟ پورے ملک پہ شیطانوں کا قبضہ ہوجائے گا۔“ شہریار خاموش ہوگیا جبکہ یاور حیات ساکت بیٹھا تھا۔

”او...... مائی گاڈ!“ اس کے لبوں سے نکلا۔ ”تت...... تم نے یہ سب معلومات کیسے اکٹھے کرلیں؟“

”میں اسی سلسلے میں گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا۔ دراصل مجھے اس پر بہت پہلے ہی شک ہوگیا تھا۔ میں نے چھپ کر اس کی نگرانی بھی کی تھی۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو جاؤ جا کے اس کی جھونپڑی کی تلاشی لو۔ تمہیں معلوم ہوجائے گا۔ میں تو اسے زندہ گرفتار کروا کے دنیا والوں کے لیے عبرت کا نشان بنانا چاہتا تھا لیکن افسوس‘ وہ میری غیر موجودگی میں قتل ہوگیا۔ اچھا‘ اب میں چلتا ہوں۔ تم اب ان معلومات کی روشنی میں اپنی تفتیش کو آگے بڑھاؤ۔ اللہ حافظ!“ شہریار تھانے سے نکل کر سیدھا برگد کے درخت کے پاس پہنچا جبکہ ڈی ایس پی یاور حیات نے فوراً کارروائی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شہریار جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ دونوں تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ وہ چار ماہ قبل شہر سے ٹرانسفر ہو کر ادھر نور پور آیا تھا جہاں اس کی اتنی جان پہچان نہ تھی لیکن یہ شہریار ہی تھا جس نے اس کی ہر قدم پہ مدد اور رہنمائی کی اور یوں وہ اس مختصر سے عرصے میں گاؤں کے سبھی لوگوں کو جان گیا تھا۔ چھوٹے موٹے کیسز میں بھی شہریار اکثر اس کی مدد کرتا تھا۔ یہ کیس ذرا مختلف نوعیت کا تھا اس لیے وہ سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ بہرحال جو بھی تھا‘ وہ اپنی اور شہریار کی دوستی پہ فخر کرتا تھا۔

•......•......•......•

بانو کو شہر یار کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ بھاگتی ہوئی پرانے کھوہ پہ آئی اور سیدھی برگد کے درخت کے پاس پہنچی۔ اپنے محبوب کو دیکھ کر اس کے قدم لڑکھڑائے' اس کا محبوب' اس کا پیار درخت کے تنے سے سر ٹکائے' آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ وہ اس کے قریب ہوئی تو شہر یار نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

''بانو......'' وہ پکارا۔

بانو بے قراری سے اس کے قریب آ گئی۔ شہر یار نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ اس کے اس قدر نزدیک ہوئی تھی۔ شہر یار کے سینے سے لگی وہ رو رہی تھی۔

''کہاں چلے گئے تھے تم؟ کیوں گئے تھے؟ پتہ تو تھا ناں' میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی' کیوں دور رہے مجھ سے؟ زلیخا بھی مجھے چھوڑ گئی' مر گئی وہ' میں کتنا روئی اور تڑپی لیکن تم نہیں آئے۔'' وہ سسک رہی تھی۔

شہر یار اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا پھر دھیرے سے اسے خود سے الگ کر کے اس کے آنسو صاف کیے۔

''چپ کرو' معاف کر دو' اب کہیں نہیں جاؤں گا' کبھی بھی نہیں' تمہارے پاس رہوں گا۔''

''وعدہ؟'' بانو نے اپنی ہتھیلی آگے کر دی تو شہر یار نے مسکرا کر اپنا ہاتھ اس کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔

''پکا وعدہ؟''

پھر دونوں ہنس دیے۔

اچانک شہر یار نے اس سے پوچھا۔

''ایک بات پوچھوں تم سے' برا تو نہیں مناؤ گی؟''

''لو بھلا میں کیوں تمہاری بات کا برا منانے لگی؟'' بانو نے محبت بھری نظروں سے شہر یار کو دیکھتے ہوئے کہا جبکہ شہر یار سنجیدہ تھا۔

''کہیں تم اس عامل کے پاس تو نہیں جاتی رہی جو قتل ہوا ہے؟''

بانو ایک دم گڑبڑا گئی پھر سنبھل کر بولی۔ ''نہ...... نہ...... نہیں...... م...... میں کیوں جاؤں گی اس کے پاس؟'' شہر یار نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا' اس نے نظریں چرا لی۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو' یہ دیکھو' تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سرخ اور سبز رنگ کی چوڑیاں بانو کی آنکھوں کے سامنے کر دیں۔

''ارے' یہ تو بہت پیاری ہیں۔'' وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔ ''لو پہنا دو۔'' اس نے فوراً اپنی کلائی اس کے سامنے کر دی۔ اسی وقت بانو کی چادر سرک کر نیچے گری۔ شہر یار نے چونک کر اس کی گردن کی طرف دیکھا۔

''یہ نشان......'' اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کے چہرے سے پریشانی جھلک اٹھی۔ بانو نے اپنی چادر درست کی۔

''کیا ہوا؟''

''آں ہاں' کچھ نہیں' لاؤ کلائی چوڑیاں پہناؤں۔'' بانو نے مسکرا کر اس کی طرف کلائی بڑھا دی۔

''بانو' اپنا خیال رکھا کرو اور ہاں' تنہا مت رہا کرو۔''

''کیوں؟'' وہ بھولپن سے بولی۔

''ارے' ویسے ہی کہہ رہا ہوں' اچھا' وہ تعویذ کدھر ہے؟'' شہر یار نے پوچھا۔

''تعویذ......'' بانو الجھن سے بولی اور پھر ساری بات شہر یار کو بتا دی۔

''یہ لو۔'' اس نے اپنے گلے سے تعویذ اتارا۔ ''اب اسے حفاظت سے رکھنا۔'' بانو نے اسی وقت تعویذ گلے میں پہن لیا۔

•......•......•......•

ڈی ایس پی یاور حیات نے ہسپتال فون کر کے سادھو کی لاش منگوانے کے لیے دو سپاہی ہسپتال روانہ کر دیے تھے اور اب بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی۔

''ہیلو' ڈی ایس پی یاور حیات اسپیکنگ۔''

دوسری جانب سے گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''سر' م...... میں ڈاکٹر احمد بول رہا ہوں۔''

''کیا ہوا' ڈاکٹر احمد! خیریت؟''

''خیریت نہیں ہے سر! اس سادھو کی لاش مردہ خانے سے غائب ہے۔''

''وہاٹ؟'' یہ خبر سنتے ہی اسے جھٹکا لگا تھا۔ ''لیکن یہ ہوا کیسے؟'' وہ فکرمندی سے بولا۔

''معلوم نہیں سر' حالانکہ یہاں کی سیکورٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ کوئی اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ سمجھ نہیں آتا' یہ سب کیسے ہوا؟ آج صبح تک تو وہ لاش موجود تھی لیکن جب آپ کے بندے پہنچے اور ہم وہاں گئے تو لاش غائب تھی؟'' ڈاکٹر احمد کی بات پر وہ پریشان ہو گیا۔

''آپ نے اچھی طرح چیک تو کیا ہے ناں؟''

''جی سر' مردہ خانے کا چپہ چپہ دیکھ لیا مگر سمجھ نہیں آتا کہ لاش کہاں گئی؟''

''ٹھیک ہے' بعد میں بات کرتا ہوں پھر بھی آپ دوبارہ چیک کریں۔''

''او کے سر......''

رابطہ منقطع ہوا تو یاور حیات نے فوراً ایک سپاہی بھیج کر شہر یار کو بلا بھیجا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں روبرو بیٹھے تھے۔

''میں سمجھ گیا ہوں' یقیناً یہ اس کے گرو اور غلام روحوں کا کام ہے' وہ اسے اپنے طلسماتی جنگل میں لے گئے ہوں گے جو یہاں سے شمال کی طرف ہے۔ انہوں نے اس کے جسم کو اپنے جادو کے ذریعے طلسماتی بنا دیا ہے۔ اس کے اندر کوئی بھی عام انسان داخل نہیں ہو سکتا جو بھی اس کے قریب جائے گا' جل کر بھسم ہو جائے گا۔'' شہر یار آنکھیں بند کیے بول رہا تھا۔

''ہوں' اس کا مطلب ہمیں سب سے پہلے ایسے شخص کو ڈھونڈنا ہے جو اس کا طلسم ختم کر سکے۔'' یاور حیات نے کہا تو شہر یار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بالکل' جتنی جلدی ہو سکے' ایسے شخص کو ڈھونڈو ورنہ بہت برا ہو گا کیونکہ ان کا ہدف اسی گاؤں میں موجود ہے اور مجھے یقین ہے' وہ اس پر ضرور حملہ کریں گے۔'' وہ بے قراری سے بولا۔

ڈی ایس پی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کون ہے وہ؟''

''بانو...... رحمت اللہ کھوکھر کی بیٹی۔''

•......•......•......•

رات گہری اور خاموش تھی۔ بانو اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ اسے لگا جیسے اس کی پائنتی کی طرف کوئی کھڑا ہوا ہے۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ اسے خوف محسوس ہوا تو وہ یہ سوچ کر دروازے کی طرف بڑھی کہ اماں ابا کو جگائی ہوں مگر جیسے ہی اس نے باہر قدم نکالا' دہشت سے گنگ رہ گئی۔ اس کے سامنے نہایت بھیانک اور بدشکل مخلوق کھڑی تھی۔

اس کا قد کھجور کے لمبے تنے کی مانند تھا' اس کا رنگ تارکول سے بھی زیادہ سیاہ تھا' چہرے پہ موٹی اور سرخ آنکھیں خون سے بھرے دو پیالے لگ رہی تھیں' اس کے دانت لمبے تھے جو منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے' اس کے چوڑے اور موٹے ہونٹ لٹک کر سینے تک آ رہے تھے' اس کے لٹکے ہوئے کانوں سے دھواں نکل رہا تھا اور پورے جسم پہ سیاہ بال تھے۔

اس مخلوق نے حرکت کی اور بانو کی طرف بڑھی۔ اس نے سہم کر اسے دیکھا اور اس کے لبوں سے زوردار چیخ نکلی اور وہ چکرا کر زمین پر گر گئی۔

اماں ابا چیخ سن کر بھاگتے ہوئے باہر آئے تھے جہاں بانو بے ہوش پڑی تھی۔

•......•......•......•

ڈی ایس پی یاور حیات اور شہریار دونوں کسی اچھے عامل باعمل کی تلاش میں تھے۔ بہت جلد ہی انہیں اپنے متصد میں کامیابی حاصل ہوگئی تھی اور وہ فوراً اس کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب وہ اس عامل کے حجرے کے پاس پہنچے تو شہریار کو اچانک ہی بے چینی ہونے لگی تھی۔

"یار یاور! ایسا کرو تم' اکیلے اندر چلے جاؤ۔ پتہ نہیں کیوں مجھے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی ہے۔" یاور نے شہریار کے چہرے کی طرف دیکھا جو کہ زرد ہورہا تھا۔

"ٹھیک ہے' تم میرا انتظار کرو' طبیعت زیادہ خراب ہے تو یہ لو گاڑی کی چابی' جا کے بیٹھ جاؤ۔" شہریار نے چابی لی اور فوراً گاڑی کی طرف چلا گیا۔

یاور حیات اندر داخل ہوا تو ایک نورانی صورت والے بزرگ بیٹھے نظر آئے۔ یاور نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا اور اپنے آنے کا مقصد بیان کرنے لگا تو بزرگ نے فوراً ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں بیٹا' سب جانتا ہوں۔ تم شنکر کی طرف سے پریشان ہو۔...... انشاء اللہ' وہ اپنے انجام کو پہنچے گا اور تمہارا دوسرا ساتھی اندر کیوں نہیں آیا؟" پیر صاحب نے میٹھے اور دھیمے لہجے میں سوال کیا تو یاور حیران رہ گیا۔

"بابا جی! جیسا آپ کے بارے میں سنا' ویسا ہی پایا۔" بابا جی کے چہرے پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"چلو پھر چلتے ہیں' نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" دونوں باہر آئے تو شہریار غائب تھا۔

"یہ کہاں چلا گیا؟" یاور پریشانی سے بولا تو بابا جی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"پریشان مت ہو' وہ جہاں بھی ہوگا' خیریت سے ہوگا۔"

"بابا جی' اس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ پتہ نہیں' کیسا ہے؟"

"میں نے کہا ناں' وہ ٹھیک ہے۔ تم چلو۔" انہوں نے شفقت سے کہا۔ یاور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جنگل کے رستے پر ڈال دی۔

بابا جی نے پہلی فرصت میں جنگل کے قریب ڈیرا لگایا پھر اپنا عمل شروع کیا۔ آدھی رات کے وقت انہوں نے مٹی کا تیل اور ماچس لی' چاروں طرف مٹی کا تیل چھڑک دیا' منہ ہی میں کچھ پڑھ کر وہ حصار بھی باندھ رہے تھے تاکہ کوئی بھی اس جنگل سے نکل نہ پائے۔ جب وہ تیل چھڑک کر فارغ ہوئے تو انہوں نے فوراً آگ لگا دی پھر تو انسانی چیخوں کا ایک شور بلند ہوا۔

"بچاؤ...... بچاؤ...... ہمیں معاف کردو۔" وہ رو رہے تھے' چلا رہے تھے' لمحوں میں آگ نے تمام جنگل جلا کر راکھ کردیا۔ اسی میں شنکر' گرو اور اس کی غلام روحیں بھی جل کر راکھ ہوگئیں۔ بابا جی نے فوراً تمام راکھ جمع کر کے دریا میں بہانے کا حکم دیا۔ ڈی ایس پی یاور نے فوراً اپنے بندوں کو حکم کی تعمیل کا کہا اور خود بابا جی کو لے کر چوہدری ضیغم کے ڈیرے پہ آ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ رحمت روتا ہوا آیا۔

"سرکار' میری مدد کریں' میری بچی کو بچالیں۔"

بابا جی فوراً اٹھے۔ "چلو۔" ان کے ساتھ چوہدری اور یاور بھی چل پڑے۔

بابا جی نے بانو کو دیکھا جو بے ہوش پڑی تھی۔ وہ مراقبے میں چلے گئے جبکہ وہاں پہ موجود افراد کے چہروں پہ پریشانی نمایاں تھی۔ کچھ دیر بعد بابا جی نے آنکھیں کھول دیں۔

"پریشانی والی کوئی بات نہیں' بچی بالکل ٹھیک ہے' بس خوف زدہ ہوگئی تھی۔ دراصل اس بچی کی پیدائش اماوس کی تاریک رات کو ہوئی ہے جس کی وجہ سے شیطانی قوتیں اس پہ اثر انداز ہونے کی کوشش کرتی رہیں جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوگئیں۔ یہی وجہ تھی کہ یہ سادھو شنکر کے جال میں پھنس گئی اور یہ اس کے پاس جانے لگی لیکن سادھو اس پہ وار نہ کرسکا کیونکہ یہ سخت حفاظتی حصار میں رہی' ہر بار اسے کوئی بچاتا رہا۔ کل رات بھی سادھو کی غلام روحیں اسے لینے آئی تھیں جنہیں دیکھ کر یہ بے ہوش ہوگئی۔ وہ روح اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی کیونکہ اس کے گلے میں تعویذ تھا جو اس کی حفاظت کررہا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس بچی کا محافظ وہ ہے جس نے اسے یہ تعویذ دیا ہے۔"

"لیکن بابا جی' آخر وہ کون ہے جو بانو کی حفاظت کررہا ہے؟" حمیداں نے بے چینی سے پوچھا۔

وہ بزرگ مسکرادیئے۔ "وہ اس کا بچپن کا ساتھی اور عاشق ہے۔"

سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے۔

"عاشق!!!"

"ہاں' جو صرف اس کے لیے سب چھوڑ کر آیا ہے۔ تم لوگ اسے اچھی طرح جانتے ہو اور پہچانتے بھی ہو۔" بابا جی نے ان کے تجسس میں اضافہ کیا۔

"اس کا نام شہریار ہے۔"

"شہریار!" بے اختیار سب کے ہونٹوں سے نکلا۔

"ہاں' شہریار' وہ ابھی آتا ہوگا' باقی باتیں وہی بتائے گا۔" کچھ دیر میں شہریار بھی آ گیا۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

"بابا جی' آپ کی اجازت ہو تو بانو کو دیکھ لوں؟"

دو بوند پانی

زمین سے اُٹھ کر!
بادلوں میں تیرنے لگا
میرے حصے کا بوند بوند پانی
پھر رب کے حکم سے
بادلوں نے اِسے جھٹک دیا
برسات کی صورت

☆

اک بوند پیاسی زمیں نے چوسی
کہ وہ اسے ذخیرہ کرے!
میرے مستقبل کے لیے
اک بوند بہہ کے
دریاؤں تالابوں اور پائپوں سے!
میرے گھر کو چلی

☆

میرے مستقبل کا پانی
میرے پڑوسی نے
بورنگ کر کے نکال لیا
اور
میرے گھر آنے والی بوند کو
اِک دوسرا پڑوسی
سکشن پمپ سے کھینچ لے گیا
میں پیاسا ہی رہ گیا!!

☆

پر دونوں ہی کہتے ہیں
بڑا برا زمانہ آگیا ہے
انصاف کہیں بھی نہیں ملتا!!

اختر شہاب

''ہاں' کیوں نہیں بلکہ اسے ہوش میں بھی لاؤ۔''

وہ دھیرے سے چلتا ہوا بانو کے پاس آیا۔ اس نے کچھ پڑھ کر بانو پر پھونکا' تب رحمت اور حمیداں حیران رہ گئے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو ہوش میں لانے کے کتنے جتن کر ڈالے تھے لیکن بے سود...... اور اب شہریار کی ایک پھونک سے ہی وہ اٹھ بیٹھی اور اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

بابا جی اٹھے اور پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر مسکرا دیے۔

''اب تم بولو برخوردار' کون ہو تم؟'' شہریار چونکا اور پھر دھیرے سے سر جھکا دیا۔

''پیرو مرشد' آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں؟ میں قومِ اجناء میں سے ہوں۔ میرا اصل نام رومان ہے۔ ایک روز میں اس گاؤں سے گزرا تو ایک خوبصورت سی بچی کو دیکھا جو کھوہ کے پاس لگے برگد کے درخت کے نیچے ہم جولیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ میں بھی اس وقت نوعمر ہی تھا۔ وہ مجھے بہت پیاری لگی۔ اس کی ہم جولیاں اسے بانو کہہ کر پکار رہی تھیں۔ اس بچی کو دیکھنے کے بعد میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں واپس جاؤں لیکن مجھے واپس اپنی دنیا میں لوٹنا پڑا' تاہم میرا دل مجھے روز برگد کے درخت کے پاس کھینچ لاتا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک خاص انعام سے نوازا ہے کہ میں ماضی اور حال میں ہونے والے واقعات و حالات جان لیتا ہوں پھر جب بانو کے متعلق مجھے پتہ چلا تو میں بہت پریشان ہوا۔ بانو جوان ہوئی تو میں اس کی محبت میں جیسے سرتاپا ڈوب گیا اور اس کی حفاظت کے لیے انسانی روپ میں نور پور چلا آیا۔ میں نے بانو کو قبرستان میں ڈرایا بھی' اس کے کمرے میں آ کے اسے روکا بھی لیکن پھر جو کچھ ہوا' سب جانتے ہیں۔ آپ لوگوں سے بس میری یہی درخواست ہے' مجھے اس نئے روپ میں قبول کرلیں اور پہلے کی طرح نور پور میں رہنے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں' میری ذات سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ بس آپ مجھے بانو سے جدا مت کریں۔'' یہ کہہ کر رومان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ غائب ہوگیا۔ وہاں موجود افراد حقیقت جان کر ساکت و جامد سے کھڑے تھے جبکہ بانو اپنے عاشق کی وفاداری پہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ بابا جی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''چپ کرو بیٹی' وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔''

پھر وہ چوہدری ضیغم سے مخاطب ہوئے۔ ''یہ راز صرف آپ لوگوں کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں' اسے راز ہی رہنے دیں' بانو اور رومان (شہریار) کو کبھی جدا مت کریں' یہ آپ سے ایک بیٹے کے باپ کی درخواست ہے۔ میں رومان کا باپ آتوم ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ بزرگ بھی غائب ہوگئے۔''

اس واقعے کو پانچ سال ہوگئے ہیں' رومان' شہریار کے روپ میں ہی اس گاؤں میں رہ رہا ہے۔ برگد کا بوڑھا درخت اب بھی بانو اور شہریار کے لیے بانہیں وا کیے ان کا انتظار کرتا ہے۔ گاؤں والے رومان کی حقیقت سے واقف نہیں' جن چند افراد کو معلوم ہے' وہ پہلے سے بھی زیادہ اس سے محبت کرنے لگے ہیں اور بانو...... وہ تو ہے ہی اس کی دیوانی' اس نے شادی نہیں کی ہے' جب بھی وہ بے قرار ہوتی ہے' برگد کے درخت کے نیچے کھڑا ہو کر ''شہریار...... !شہریار......!'' پکارتی ہے تو اس کا محبوب فوراً حاضر ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس پاکیزہ و عظیم محبت کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔

میں نے یہ عجیب اور سچی محبت کی کہانی رومان کی اجازت سے رقم کی ہے البتہ اس میں گاؤں کا نام اور کرداروں کے نام فرضی ہیں کیونکہ رومان نے مجھے اسی شرط پر اس کہانی کو لکھنے کی اجازت دی تھی۔

منزہ سہام مرزا



علامہ اقبال کی پروازِ خیال

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ

بہت دل چاہتا ہے کہ جب آپ سے مخاطب ہوں' کوئی خوشی کی خبر ہو' کوئی اچھی بات ہو جس پر میں اظہارِ مسرت کرسکوں' اپنے دور سے مقابلہ کرسکوں۔ دل چاہتا ہے کہ کہہ سکوں کہ اب حالات پہلے سے بہت اچھے ہیں مگر بس منتظر ہی رہتا ہوں کہ خوشی کی خبر سن سکوں' منتظر ہی رہتا ہوں کہ خوشی سے چمکتے دمکتے چہرے دیکھ سکوں' منتظر ہی رہتا ہوں کہ قہقہوں کی آوازیں کانوں میں پڑیں مگر کیا کروں' صرف آہ و فغاں ہے' غم سے سیاہ پڑتے چہرے ہیں' آنسو سے بھری آنکھیں ہیں۔ میں یہ سب محسوس کرسکتا ہوں' میں یہ سب دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں شہید ہوں اور شہید مرا نہیں کرتے۔ مجھے یاد ہے' ایک بار گاؤں میں چاچا رحمت کے گھر پر آگ لگ گئی تھی' شاید تندور جلتا رہ گیا تھا۔ چاچی پانی کا چھینٹا دینا بھول گئی تھی' بس پھر کیا تھا' آگ سارے گھر میں پھیل گئی تھی' صحن میں گھاس پھونس کا ڈھیر تھا' آگ پہلے اس نے پکڑی پھر تو سارا گھر دھڑ ادھڑ جلنے لگا۔ میری عمر دس' بارہ سال ہوگی۔ اللہ نے خیر کی' گھر والے سب محفوظ رہے' چاچا رحمت کا چھوٹا والا بیٹا برکتے جو میرا ابھی بہت اچھا دوست تھا' اس کے چار کبوتر جل کر مر گئے تھے۔ پنجرے میں بند تھے اس لیے اڑ بھی نہ سکے' وہیں جل مرے۔ میں اور برکتے کتنے دن اُن کو یاد کر کے روتے رہے تھے اس لیے کہ ہم سارا دن اُن کے ساتھ کھیلتے تھے' اُن کو دانہ کھلاتے تھے' ہاتھوں میں لے کر پیار کرتے تھے۔ جب وہ ہمیں اپنی چھوٹی چمکیلی آنکھوں سے دیکھتے تھے تو ہم خوب ہنستے تھے' بس یہ سب جب یاد آتا تو رونا آجاتا تھا۔ کتنے دن ہم سے پیٹ بھر کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ ان کے ساتھ وقت گزرا تھا نا' ایسے کیسے بھول جاتے پھر میں بڑا ہوگیا' فوج میں چلا گیا مگر جب بھی گاؤں آتا تو برکتے سے ملنے ضرور جاتا' تب اُس جگہ پر ضرور نظر ٹھہرتی تھی جہاں وہ پنجرہ رکھا تھا جس میں ہمارے پیارے چار کبوتر جل کر مر گئے تھے۔

آپ کے شہر میں تو کئی سو لوگ جل کر دنیا سے چلے گئے' کچھ کے تو لاشے بھی راکھ ہو گئے' وہ اب بھی لاپتہ لوگوں کی فہرست میں ہیں اور ہمیشہ ہی لاپتہ رہیں گے۔ وہ کئی سو لوگ کھڑکیوں میں لگی سلاخوں کو پکڑ کر چیختے رہے' زندگی کی بھیک مانگتے مانگتے مر گئے' راکھ ہو گئے' کتنی تکلیف ہوئی ہوگی' آگ میں جسم جل رہا ہوگا' دھوئیں سے دَم گھٹ رہا ہوگا' بے بسی کی موت' تکلیف دہ موت' وہ تو مر گئے' اذیت سے گزر گئے' اب اُن کے گھر والے ساری زندگی تنہائی اور اذیت کی آگ میں جلیں گے' بے بسی کا ماتم کریں گے' ساری زندگی یہی سوچتے رہیں گے کہ کاش' ہم اپنے پیاروں کو بچا سکتے۔ کاش' انہیں اُس دن کام پر جانے ہی نہ دیا ہوتا۔ کاش' آگ لگی ہی نہ ہوتی' جب دَم نکل رہا تھا' پتہ نہیں' کیا سوچا ہوگا؟ کون کون یاد آیا ہوگا؟ پتہ نہیں کیا گزری ہوگی؟ فیکٹری مالکان ذمہ دار ہیں یا دوسرے ادارے؟ فیکٹری رجسٹرڈ تھی یا نہیں؟ فائر بریگیڈ میں پانی تھا یا نہیں؟ دروازے باہر سے کیوں بند کیے گئے؟ وغیرہ وغیرہ مگر اہم یہ ہے کہ آپ نے کیا کیا؟ کیا ایک بار ٹھہر کر فاتحہ پڑھی؟ کیا آپ کی بھوک بھی ختم ہو گئی جیسے میری ہو گئی تھی مگر میں تو بچہ تھا' کم عقل تھا' جل کر مرنے والے میرے بچپن کے دوست کے کبوتر تھے مگر یہ جو جل گئے' وہ تو آپ کے جیسے جیتے جاگتے انسان تھے' آپ کے ملک کے باسی تھے' آپ کے اپنے تھے۔ کیا ایک بار آپ نے فاتحہ پڑھی؟ سوچیے گا ضرور!!

شہیدِ وطن

سلیم فاروقی

آتشِ جنوں

شاعر کا خیال

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی پیار کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت، اس کے دل میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا۔ قسط نمبر 7

خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں' ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے' نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے..... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان' راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی' راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں' اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان منہ ماری ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے اور آزاد کرا کے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران پولیس' عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورت حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا' اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں پتہ لگتا ہے' عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان' بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے..... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں.....

راستے میں تیمور اور عمران' شیر خان پر قابو پا لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ بابر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور اچانک ریوالور نکال کر بابر خان کی کنپٹی پر رکھ دیتا ہے۔ بابر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

”یہ...... یہ کیامذاق ہے؟“ بابر خان کہتا ہے اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔

”اپنے ہاتھ پیر قابو میں رکھو بابر خان!“ ارسلان چیخ کر کہتا ہے۔

بابر خان کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔ وہ حیرت سے کبھی تیمور کو دیکھ رہا ہے، کبھی ارسلان کو۔

پھر وہ ہنس کر کہتا ہے۔ ”آخر تم لوگ یہ کیسا مذاق کر رہے ہو؟ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں نے کس طرح مشہدی کے آدمیوں سے اپنی جان بچائی ہے۔ میں کئی میل تک پیدل چلا ہوں۔“

”مشہدی کے آدمیوں نے تمہیں چھوڑ دیا لیکن ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ بابر خان اس مرتبہ درشت لہجے میں کہتا ہے۔

”مطلب یہ کہ اب ہم بھی مشہدی کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ مشہدی سے میرا جھگڑا اس فائل کی وجہ سے تھا نا؟“ تیمور کے انداز میں سنجیدگی ہے۔ ”میں نے وہ فائل مشہدی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میری اس سے بات ہوئی ہے۔ اس نے مجھے آفر کی ہے کہ میں اس کے ساتھ کام کروں۔“

”کک...... کیا...... کہہ رہے ہو تم؟“ بابر خان ہکلا کر کہتا ہے۔ ”اور...... یہ ارسلان...... یہ بھی......“

”ہاں، یہ بھی اب ہمارے ساتھ ہے۔ ایک بات اور سنو! ارسلان کی بہن شائستہ ابھی زندہ ہے۔ مشہدی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ شائستہ کو بھی ہمارے حوالے کر دے گا، صرف ایک شرط پر کہ ارسلان بھی اس کے ساتھ کام کرے۔“

”تو...... کیا...... ارسلان راضی ہو گیا ہے؟“

”ہاں، مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔“ ارسلان نے کہا۔ ”آخر ہم عبداللہ کے لیے بھی تو کام کرتے تھے نا؟“

”عبداللہ اور مشہدی میں بہت فرق ہے۔“ بابر خان نے کہا۔ ”عبداللہ اس قسم کی ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف نہیں تھا۔ وہ تو قدم قدم پر مشہدی کے راستے کی رکاوٹ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب عبداللہ کی بجائے ہم لوگ مشہدی پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے لیکن یہ میری بھول تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم جیسے لوگ بھی بک سکتے ہیں۔ میں نے یہاں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔“

”وہ تو خیر، تم کر ہی چکے ہو۔“ تیمور نے کہا۔ ”تم مشہدی کے خلاف کیا کر سکتے تھے؟ عبداللہ تو رہا نہیں۔“

”کسی ایک آدمی کے نہ ہونے سے فرق تو پڑتا ہے لیکن کوئی نہ کوئی اس کی جگہ لے لیتا ہے۔“

”لیکن تم نے بہت دیر کر دی بابر خان!“ تیمور نے کہا۔ ”تم اگر ایک گھنٹہ پہلے آ جاتے تو ہم مشہدی سے کسی بھی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ کرتے۔ ہم تو عبداللہ بھائی کے نہ ہونے سے بہت مایوس ہو گئے تھے۔“

”اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔“ بابر خان نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”میں عبداللہ کے بہت نزدیک تھا۔ اس کی جگہ میں کام کر سکتا ہوں۔“

”تم نے تو اچھا کام دکھا دیا بابر خان!“ ارسلان نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”تم عبداللہ بھائی کے بہت نزدیک تھے نا، تم ہی نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔“

”یہ...... یہ...... تم کیا کہہ رہے ہو؟“ بابر خان ہکلا کر بولا۔

”بتاؤ، تم نے عبداللہ بھائی کو کیوں مارا؟“ ارسلان نے چیخ کر کہا۔ ”وہ تم پر سب سے زیادہ بھروسا کرتے تھے۔ تم نے ان ہی کو ڈس لیا؟ میں نے آستین کے سانپ کا صرف محاورہ سنا تھا، اب مجھے معلوم ہوا کہ آستین کا سانپ کیسا ہوتا ہے؟“

"تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" بابر خان نے ایک مرتبہ پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔

ارسلان نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زناٹے کا ایک تھپڑ رسید کر دیا اور بولا۔ "میں نے کہا ہے نا کہ اپنے ہاتھ پیر قابو میں رکھو۔" پھر وہ تیمور سے بولا۔ "اس ذلیل آدمی کی تلاشی لو۔"

"تم کیا کر رہے ہو تیمور؟ میں تم سے بہت سینئر ہوں۔"

تیمور نے اچانک پشت سے اس کی گردن دبوچ لی اور بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کتنے سینئر ہو۔" پھر اس نے بابر خان کی جیبوں سے ایک ریوالور، سیل فون اور تقریباً بائیس ہزار امریکن ڈالرز برآمد کیے۔ اس نے وہ سب چیزیں میری طرف بڑھا دیں۔

"اب اپنے دونوں ہاتھ سر پہ رکھو اور کھڑے ہو جاؤ۔" تیمور نے اسے جھٹکے سے کھڑا کر دیا پھر ارسلان سے بولا۔ "اس کی پنڈلیوں کے ساتھ بھی ایک ریوالور اور خنجر بندھا ہوتا ہے، میں وہ نکال لوں پھر اس سے بات کریں گے۔"

"تیمور، میری بات مانو، تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ میں اب اس تنظیم میں تم سب سے سینئر ہوں۔"

اس دوران میں تیمور نے اس کی پنڈلی سے بندھا ہوا ایک ریوالور اور پتلے اور لمبے پھل کا دو دھاری خنجر بھی نکال لیا پھر اس نے بابر خان کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "تم نے عبداللہ بھائی کو مارنے کے لیے مشہدی سے کتنے پیسے لیے تھے؟"

"میں...... میں...... عبداللہ کو ماروں گا؟" بابر خان ڈھٹائی سے بولا۔ "وہ میرا بھائی تھا، دوست تھا، میں......"

"اب یہ ڈائیلاگ بولنا بند کرو بابر خان!" میں نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ "ابھی مشہدی نے خود ہی ہمیں بتایا ہے کہ تم نے عبداللہ کو ہلاک کیا ہے۔ بتاؤ، تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟"

"مشہدی نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔" بابر خان نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ "تا کہ تم لوگ میرے خلاف ہو جاؤ۔"

"تم شاید بھول رہے ہو کہ تمہارے علاوہ وہاں عبداللہ بھائی کا ایک آدمی اور بھی موجود تھا۔" تیمور نے اندھیرے میں تیر چلایا جو نشانے پر لگا۔

"میرے علاوہ اور کون تھا وہاں؟" بابر خان نے کہا۔

"کوئی تھا یا نہیں......" ارسلان نے کہا۔ "میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تم بتاؤ کہ تم نے عبداللہ بھائی کو کیوں مارا ہے؟"

"میں نے اسے نہیں مارا۔" بابر خان نے ڈھٹائی سے کہا۔

"لیکن ہمیں یقین ہے کہ تم ہی نے اسے قتل کیا ہے اس لیے اب تم بھی مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"دیکھو میری بات سنو، تم مجھے مار کے...... نقصان......" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ باہر سے فائرنگ کی آواز آئی تھی۔

ارسلان نے چونک کر اُدھر دیکھا، بس اسی لمحے بابر خان نے جست لگائی اور ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں اٹھ کے اس کے پیچھے دوڑا لیکن وہ تو چھلاوے کی طرح باؤنڈری وال تک پہنچ گیا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے تیمور اور ارسلان بھی باہر نکلے تھے۔ تیمور نے اس پہ فائر بھی کیا لیکن اس وقت تک وہ باؤنڈری وال عبور کر چکا تھا۔

وہ دونوں دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑے۔ اس سے پہلے کہ وہ باؤنڈری وال تک پہنچتے، باہر کسی گاڑی کے

سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

ارسلان نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "وہ مردود نکل گیا۔ اب اس کا ہاتھ آنا مشکل ہے۔"

"یہ فائرنگ کس نے کی تھی؟" تیمور نے کہا۔

بنگلے کا مین گیٹ وہاں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ میں مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گیٹ پر گارڈ موجود تھا۔

"یہ فائرنگ تم نے کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"سر، کہیں سے ایک پاگل کتا اس طرف آ گیا تھا۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے تھے، وہ کارپوریشن کے لوگ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کسی نے ٹیلی فون پر اس پاگل کتے کی رپورٹ کی تھی۔ وہ دو آدمیوں کو کاٹ چکا تھا۔ کتا اس وقت تک بہت آگے نکل چکا تھا۔ اچانک سامنے سے ایک گاڑی آئی تو کتا پلٹ کر پھر ہمارے بنگلے کی طرف بھاگا۔ میں نے فائرنگ کر کے اسے ہلاک کر دیا۔"

میں نے باہر جا کر دیکھا، کچھ فاصلے پر ایک کتے کی لاش پڑی تھی، اس کی گردن پہ خاصا بڑا زخم تھا۔ گارڈ کی گولی نے اسے ایک ہی گولی میں ڈھیر کر دیا ہو گا۔ دوسری گولی تو اس نے فضول میں چلائی تھی۔

"ابھی بنگلے میں جو آدمی آیا تھا، وہ کہاں سے آیا تھا؟" تیمور نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا سر، وہ کہاں سے آیا تھا؟" گارڈ نے بوکھلا کر کہا۔

"تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ وہ بنگلے میں کہاں سے داخل ہوا؟" تیمور نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"سر، مجھے یہ تو معلوم ہے۔" گارڈ جلدی سے بولا۔ "وہ یہیں سے آیا تھا۔ میں نے آپ لوگوں سے پوچھا بھی تھا کہ کوئی بابر خان آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ آپ کے کہنے ہی پر میں نے اسے اندر بھیجا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں سے آیا تھا؟"

"وہ پیدل آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جی سر، وہ پیدل ہی تھا۔" گارڈ نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس نے اپنی گاڑی باؤنڈری وال کی اس جانب پارک کی تھی جہاں سے وہ فرار ہوا۔ شاید اسے بھی شبہ تھا کہ ہمیں اس کی حقیقت معلوم ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے، گاڑی میں اس کا کوئی ساتھی موجود ہو۔" ارسلان نے کہا۔ "اگر ہم اس کی باتوں پر یقین کر لیتے تو وہ کال کر کے اپنے ساتھی کو باؤنڈری وال سے رخصت کر دیتا یا پھر اسے بھی بلا لیتا۔"

"اب تو اس کا ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔" تیمور نے کہا۔ "وہ عبداللہ بھائی کا دستِ راست تھا، کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔"

"لعنت بھیجو اس پر......" میں نے کہا۔ "اس سے بھی نمٹ لیں گے۔ فی الحال تو ہمیں عدنان کو رخصت کرنا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ تیمور اس کے ساتھ ہی چلا جائے اور اسے وہاں چھوڑ آئے۔"

"پھر ایسا کریں کہ آپ ہی عدنان کے ساتھ چلے جائیں۔" ارسلان نے کہا۔

"تم شاید بھول رہے ہو کہ پولیس نے مجھ پہ کئی مقدمات بنائے ہوئے ہیں۔ میرا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔ تم دونوں میں سے کوئی چلا جائے۔ میں مقدمات کا فیصلہ ہونے تک یہیں رکوں گا۔"

"ان مقدمات میں کئی مہینے بلکہ سال بھی لگ سکتے ہیں۔" تیمور نے کہا۔ "یہاں کے عدالتی نظام سے آپ

بھی واقف ہیں۔"

"انصاری صاحب ہائی کورٹ میں پولیس کے خلاف میری طرف سے ایک پٹیشن دائر کر رہے ہیں۔ وہاں فیصلہ ہونے میں اتنی دیر نہیں لگے گی۔ ہمارے پاس ثبوت بھی ٹھوس ہیں اور گواہ بھی۔ انصاری صاحب یوں بھی بہت بااثر وکیل ہیں وہ کیس کو چار چھ پیشیوں ہی میں نمٹا دیں گے۔"

"اب سب سے پہلے تو آپ یہ بنگلہ چھوڑیں۔ بابر خان یہاں دوبارہ آئے گا اور اس مرتبہ وہ اکیلا نہیں ہوگا۔" تیمور نے کہا۔

"تو کیا اس کے خوف سے میں اپنا گھر چھوڑ کے مارا مارا پھروں؟" میں نے کہا۔

"ڈریئے نہیں بھیا......!" ارسلان نے کہا۔ "یہ مصلحت ہے۔"

"نہیں ارسلان!" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں جہاں بھی جاؤں گا گھر میں بند ہو کر بیٹھنے سے تو رہا۔ بابر خان یا اس کے آدمی مجھے کہیں بھی دیکھ سکتے ہیں اور نقصان پہنچا سکتے ہیں میرا پیچھا کر کے میرے دوسرے ٹھکانے کا پتا معلوم کر سکتے ہیں۔ میں اس کے خوف سے کہاں مارا مارا پھروں گا؟"

"بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" تیمور نے کہا۔ "پھر میں ایسا کرتا ہوں کہ اپنے اعتبار کے کچھ لوگوں کو یہاں بلا لیتا ہوں۔ وہ بابر خان کے آدمیوں کو پہچانتے ہیں۔"

"تم ماجد کو ٹیلی فون کرو اور معلوم کرو کہ عدنان کا سمسٹر کب شروع ہوگا؟"

"میں اس سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔" تیمور نے کہا۔ "وہ ابھی سویا نہیں ہوگا۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہاں کے اور پاکستان کے وقت میں تقریباً بارہ گھنٹے کا فرق ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سیل فون نکالا اور ماجد کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

میں کمرے سے باہر آ کر حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینے لگا۔ بنگلے کی باؤنڈری وال تقریباً سات فٹ تھی اس دیوار کو تو کوئی بھی پھلانگ سکتا تھا۔ مجھے بابر خان ہی سے نہیں بلکہ مشہدی اور پولیس سے بھی خطرہ تھا۔ پولیس والے اپنی عزت بلکہ نوکریاں بچانے کے لیے کوئی بھی حرکت کر سکتے تھے۔ وہ پیشہ ور بدمعاشوں کو میرے گھر بھیج کر حملہ کرا سکتے تھے یا ان کے ذریعے بنگلے میں منشیات اور اسلحہ وغیرہ رکھوا سکتے تھے۔

گیٹ پر جو گارڈ تھا وہ اس قسم کے حملہ آوروں سے نمٹنے کے لیے ناکافی تھا۔ تیمور ٹھیک ہی کہہ رہا تھا یہاں کچھ تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچا کہ سب سے پہلے تو مجھے باؤنڈری وال مزید بلند کرا کے اس پہ خاردار تار لگانا چاہئیں۔ بنگلے کے لان میں دائیں بائیں آمنے سامنے دو لائٹس بھی ہونا چاہئیں۔

اسی وقت ارسلان اور تیمور بھی کمرے سے باہر آ گئے۔

"بھیا......!" ارسلان نے کہا۔ "ابھی عدنان کا سمسٹر شروع ہونے میں دو مہینے باقی ہیں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ اس وقت تک ماجد کے ساتھ رہ سکتا ہے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "میں عدنان کے ساتھ ارسلان کو بھیج رہا ہوں۔"

"میرے خیال میں یہ ہی مناسب رہے گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں بھیا! میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔" ارسلان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"بھیا یہاں اکیلے کب ہیں؟" تیمور نے کہا۔ "میں یہاں موجود ہوں ناصر ہے صفدر ہے اور بھی کئی لوگ ہیں۔"

"کچھ بھی ہو۔" ارسلان نے کہا۔ "ابھی عدنان کا سمسٹر شروع ہونے میں دو مہینے باقی ہیں۔"

"لیکن میں نہیں چاہتا کہ عدنان یہاں رہے۔" میں نے کہا۔ "وہ اس مار دھاڑ اور قتل و غارت گری کا عادی کب ہے؟ یہاں تو کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ارسلان نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میں ایک فلائٹ سے جاؤں گا اور دوسری سے واپس آ جاؤں گا۔ میری بہن ابھی دشمنوں کے قبضے میں ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں ملک چھوڑ کر چلا جاؤں؟" ارسلان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ شدتِ جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"او کے۔" تیمور نے کہا۔ "پھر ایسا کرتا ہوں عدنان کو ندیم کے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔" تیمور نے کہا۔ "حالانکہ اس کی بھی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ آج کل تو چھوٹے چھوٹے بچے تنہا سفر کر لیتے ہیں۔ ایئر لائن کا عملہ انہیں حفاظت سے متعلقین کے حوالے کر دیتا ہے۔"

اس وقت عدنان کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ شاید کمرے میں ہماری ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "بھیا! آپ تو ابھی تک مجھے کے جی ون کا وہی عدنان سمجھتے ہیں۔ میں او لیول کر چکا ہوں۔ میں اکیلا دنیا کے دوسرے سرے تک بھی جا سکتا ہوں۔ میں اب بچہ نہیں رہا ہوں بھیا! اب میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ آپ لوگوں نے تو اسے بھی ایشو بنا لیا۔"

اس کے انداز پر ہم سبھی کو ہنسی آ گئی۔

اچانک مجھے ہاشم کا خیال آیا۔ میں نے تیمور سے پوچھا۔ "ہاشم کہاں چلا گیا؟"

"وہ بہت تھکا ہوا تھا میں نے اسے آرام کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔"

میں نے ارسلان کو ہدایات دیں کہ بنگلے کی باؤنڈری وال آج ہی اونچی کرا دو اور اس پہ خاردار تار بھی لگوا دو۔"

"میں نے پہلے ہی افضل سے کہہ دیا ہے۔" ارسلان نے کہا۔ "وہ اسی سلسلے میں سیمنٹ بلاک اور دوسرا سامان لینے گیا ہوا ہے بس صبح سے کام شروع ہو جائے گا۔"

"میں نے اپنے چار بہترین ساتھیوں کو بھی بلا لیا ہے۔" تیمور نے کہا پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "بھیا! میرے ایک ساتھی ندیم کے پاس اعلیٰ نسل کے کئی کتے بھی ہیں۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ کتوں کو بھی اپنے ساتھ لیتا آئے۔ کتوں کو رات کو کھول دیا جائے گا۔"

رات کو تیمور کے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ چار آدمی تھے اور ان میں سے ہر آدمی اپنے فن میں یکتا تھا۔ تیمور نے ان چاروں سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ ناصر ہے۔" اس نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ "بہترین نشانے باز اور پیراک۔" پھر اس نے ناصر سے کہا۔ "یہ میرے بھیا ہیں۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو مجھے ایسا لگا جیسے میرا ہاتھ کسی شکنجے میں آ گیا ہو۔ میں نے بھی جوابی طور پر اس کا ہاتھ دبایا تو مجھے اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ یقیناً اسے بھی میری قوت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔"

تیسرا نوجوان معین تھا۔ اس میں بھی وہ تمام خصوصیات تھیں جو تیمور میں تھیں۔ چوتھا نوجوان عامر تھا۔ وہ بھی کسرتی جسم کا مالک تھا لیکن انتہائی کم گو تھا۔ چہرے سے بھی وہ مجھے فلسفے کا اسٹوڈنٹ لگتا تھا۔

ندیم اپنے ساتھ کتوں کے دو جوڑے بھی لایا تھا۔ ان میں سے ایک ڈوبر مین تھا اور دوسرا جوڑا گرے ہاؤنڈز

کا تھا۔ دونوں جوڑے ہی بہت خوف ناک نسل کے تھے۔ مجھے بھی کتے پالنے کا شوق تھا۔ میں نے اسکول کالج کے زمانے میں کتے پالے بھی تھے لیکن امی کہتی تھیں کہ جس گھر میں کتے ہوں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ رحمت کے فرشتے تو وہاں بھی نہیں آتے جہاں تصویریں ہوں کیبل بھارتی اور انگریزی فلمیں دکھائی جاتی ہوں بلند آواز میں موسیقی کی آواز گونجتی ہو۔ یہ سب کچھ گھر میں ہوتا ہے پھر کتوں نے کیا قصور کیا ہے؟ لیکن یہ باتیں میں ان سے کہہ نہیں سکتا تھا اس لیے صرف سوچ کر ہی رہ جاتا تھا۔

ندیم نے فی الحال کتوں کو ایک خالی سرونٹ کوارٹر میں بند کر دیا تھا۔

اس نے جوں ہی دروازہ کھولا کتے اس کے گرد منڈلانے لگے لیکن مجھے دیکھتے ہی ان کے تیور بگڑ گئے اور سب خوف ناک انداز میں نظر آنے لگے۔

میں جانتا تھا کہ ان چاروں نے نہ سہی صرف ڈوبر مین ہی نے مجھ پر حملہ کر دیا تو وہ مجھے ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ گرے ہاؤنڈز اس سے بھی برا حشر کرے گا۔

''نو......'' ندیم نے بلند آواز میں کہا تو کتے کچھ پرسکون ہو گئے لیکن وہ اب بھی مجھے گھور رہے تھے۔

''اگر آپ دو چار دن ان کی دیکھ بھال کریں گے تو یہ آپ سے مانوس ہو جائیں گے۔'' ندیم نے کہا۔

ہم واپس بنگلے میں پہنچے تو ہاشم بھی ڈرائنگ روم میں موجود تھا اور خاصا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو یار۔'' میں نے کہا۔ ''میں کوئی مافیا چیف یا ڈان نہیں ہوں کہ تم میرے احترام میں کھڑے ہو گئے۔''

''آپ ارسلان کے بڑے بھائی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تو میرے لیے بھی قابلِ احترام ہیں۔''

''ہاشم! تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ مشہدی نے شائستہ کو کہاں رکھا ہے؟''

''مجھے اگر تھوڑا سا اندازہ بھی ہوتا تو میں انہیں بھی وہاں سے نکالنے کی کوشش کرتا۔'' ہاشم نے کہا۔ ''ہاں! خان کو ضرور علم ہوگا۔ وہ آج کل مشہدی کے بہت قریب ہے۔ ممکن ہے مشہدی نے اسے بھی نہ بتایا ہو۔'' پھر چونک کر بولا۔ ''ہاں ایک آدمی اور ہے جس پر مشہدی بہت بھروسا کرتا ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ محمد جان ہے۔ ہر مشن کے موقع پر مشہدی کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کا مشیرِ خاص ہے۔ اس میں دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کی سول اور انتظامی حلقوں میں اس کی بہت پی آر ہے۔ وہ خاصا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ عرصے تک وکالت بھی کر چکا ہے اس لیے قانونی داؤ پیچ بھی خوب جانتا ہے۔''

''وہ رہتا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رہتا تو وہ ڈیفنس میں ہی ہے لیکن اپنے بنگلے پر صرف خاص خاص موقعوں ہی پر آتا ہے۔''

''کیا وہ اپنے بنگلے میں تنہا رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں اس کی بیوی ہے دو بچے ہیں اور دو بہنیں ہیں۔''

''بہنیں بھی ہیں؟'' ارسلان نے چونک کر پوچھا۔

''بھئی اس کی دو بہنیں ہیں۔'' ہاشم نے بتایا۔ ''ایک بہن میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے اور دوسری ایم کالج میں ہے۔''

''میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''ہم لوگ محمد جان کو اٹھا لیتے ہیں۔ دو ہاتھ پڑیں گے تو وہ سب کچھ اگل دے گا۔''

''اس خوش فہمی میں رہنا بھی مت۔'' ہاشم نے کہا۔ ''محمد جان بھی مشہدی کی طرح سے سات پردوں میں رہتا ہے۔ وہ کوئی اسکول کا بچہ نہیں ہے کہ تم اسے بہلا پھسلا کر اور ٹافی کا لالچ دے کر اپنے ساتھ لے آؤ گے۔''

''وہ گھر سے یا اپنے ٹھکانے سے کبھی باہر تو نکلتا ہی ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''وہ گھر سے نکلتا ہے تو محافظوں کی ایک فوج اس کے ساتھ چلتی ہے لیکن اس کے محافظ نظر نہیں آتے۔''

''کیوں کیا وہ سلیمانی ٹوپی پہن کر اس کے ساتھ چلتے ہیں؟'' ارسلان نے ہنس کر کہا۔

''وہ اس کے اردگرد ضرور ہوتے ہیں لیکن کسی کو احساس نہیں ہوتا کہ وہ اس کے محافظ ہیں۔ کچھ لوگ اس کی گاڑی کے پیچھے ہوتے ہیں اور کچھ آگے۔'' ہاشم نے کہا۔

''وہ کیا کسی ملک کا سربراہ ہے؟'' تیمور نے کہا۔ ''اتنے حفاظتی اقدامات تو صدرِ پاکستان یا پرائم منسٹر کے ہوتے ہیں۔''

''ہاں لیکن وہ نظر بھی آتے ہیں۔ مشہدی اور جان محمد کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ دیکھنے والوں کو یہ علم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ان کی نگرانی کر رہا ہے اور کسی بھی مشتبہ نظر آنے والے شخص پر گولیاں برسا سکتا ہے۔'' ہاشم مسکرا کر بولا۔

''پھر تو میرے لیے یہ چیلنج کیس ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''اب تو میں جان محمد کو اٹھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔''

''پہلے تو ہم یہ کوشش کریں کہ مشہدی کے کسی بھی حملے سے بچ سکیں۔'' ہاشم نے کہا۔ ''وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے بین الاقوامی دہشت گرد ہے۔ اس کا نیٹ ورک پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔''

''تم ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

''میں تو آپ کو حقیقت بتا رہا ہوں۔ دشمن کو کمزور تو یوں بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کے پاس غیر قانونی ذرائع سے کمائی ہوئی اربوں ڈالرز کی دولت ہے قوت ہے اس کا اثر و رسوخ ہے۔ ہمیں یہ سب باتیں ذہن میں رکھنا ہوں گی۔''

''ہاشم ٹھیک کہہ رہا ہے بھیا!'' ارسلان نے کہا۔

''اچھا یار پہلے کھانا تو کھا لیں خالی پیٹ تو کچھ بھی نہیں سوجھے گا۔'' تیمور نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔

''کھانا تیار ہے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''میں ابھی منگواتا ہوں۔''

ہم بھی بھوکے تھے اس لیے اس وقت کچھ زیادہ ہی بھوک لگی تھی۔ اس کے باوجود مجھ سے کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا۔ مجھے ہر ہر موقع پر شائستہ یاد آ رہی تھی۔ کھانے کے وقت وہی ہم سب کی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھی۔

میں نے دوسروں کی وجہ سے جیسے تیسے اگل نگل کر کھانا کھایا اور اٹھ کر ایک مرتبہ پھر لاؤنج میں آ گیا۔

میرے پیچھے ارسلان تیمور اور ہاشم بھی وہیں آ گئے۔ ارسلان نے افضل کو ہدایت کی کہ مہمانوں کا کھانا ان کے کمروں میں پہنچا دو۔ مہمانوں سے مراد تیمور کے وہ چاروں ساتھی تھے۔ یہ تیمور اور ارسلان ہی کی ہدایت تھی کہ ان لوگوں کو گھر میں کبھی ہمارے ساتھ نظر نہیں آنا چاہیے۔

''وہ لوگ کھانا کھا چکے ہیں۔'' تیمور نے کہا۔ ''میں نے پہلے ان ہی لوگوں کے لیے کھانا بھجوایا تھا۔ اب اپنی ڈیوٹی پر ہوں گے۔''

''ڈیوٹی پر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھیا! دو آدمی اس وقت چھت پر ہوں گے تا کہ وہ اردگرد نظر رکھ سکیں اور دو آدمی لان کے دونوں پر پوزیشن سنبھالے بیٹھے ہوں گے۔ ندیم نے تو اب تک کتے بھی کھول دیئے ہوں گے۔''

''لیکن وہ کتے......''

''آپ پریشان نہ ہوں' میں نے تینوں ملازموں کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ رات کو گیارہ بجے کے بعد لا... طرف نہ آئیں۔ فی الحال تو آپ لوگ بھی احتیاط کیجیے گا۔''

''لیکن گیٹ پر ہماری گارڈ بھی تو موجود ہے؟'' میں نے کہا۔ ''وہ کتوں سے کیسے محفوظ رہے گا؟''

''میں نے گارڈ سے کہہ دیا ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ گیارہ بجے کے بعد ... کھولنے کی ذمہ داری بھی ندیم کی ہے۔''

ہم لوگ لاؤنج میں دیر تک بیٹھے رہے۔ شائستہ کے ساتھ ساتھ مجھے عدنان کی بھی فکر تھی۔ عدنان خود بھی صورتِ حال سے بہت ٹینشن میں تھا۔

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے چونک کر سیل فون جیب سے نکالا۔ اسکرین پر ... انصاری کا نام تھا۔

''یہ بیرسٹر صاحب اس وقت ٹیلی فون کیوں کر رہے ہیں؟'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور سیل ... کان سے لگا لیا۔ ''السلام علیکم! انکل!'' میں نے کہا۔

''وعلیکم السلام!'' انہوں نے جواب دیا۔ ''عمران! تم سو تو نہیں گئے تھے؟''

''نہیں انکل!'' میں نے جواب دیا۔ ''میں اتنی جلدی کب سوتا ہوں؟ خیریت تو ہے' آپ نے اس و... ٹیلی فون کیسے کیا؟''

''مجھے آج اپنی مصروفیات میں تمہیں یہ بتانا یاد ہی نہ رہا کہ کل تمہیں ہائی کورٹ جانا ہے۔ کل صبح آٹھ ... تک کورٹ پہنچ جانا۔''

''ٹھیک ہے انکل!'' میں نے کہا۔ ''میں پہنچ جاؤں گا۔''

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میں نے ان لوگوں کو بھی بتایا کہ انصاری صاحب کل صبح مجھے کورٹ بلا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے' آپ چلے جائیں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''میں اور تیمور آپ سے کچھ فاصلے پر رہ کر آپ ... حفاظت کریں گے۔''

''میں بھی تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔'' ہاشم نے کہا۔

•......•......•......•

انصاری صاحب نے میری طرف سے کورٹ میں پولیس کے خلاف پٹیشن دائر کر دی تھی۔ انہوں نے تمام ثبوت بھی کورٹ میں پیش کر دیئے تھے جو میرے پاس تھے۔ وہاں سے ہمیں اگلے ہفتے کی تاریخ مل گئی ...

ہائی کورٹ میں تو دو مہینے سے پہلے تاریخ ہی نہیں ملتی۔ یہ بھی انکل انصاری ہی کا کمال تھا۔

میں کورٹ سے واپس آیا ہی تھا کہ افضل نے مجھے کسی پولیس افسر کی آمد کے بارے میں بتایا۔ اس وقت تک ارسلان وغیرہ بھی گھر پہنچ چکے تھے۔ میں نے افضل سے کہا۔ ''تم ان صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ' میں ابھی کچھ دیر میں آ رہا ہوں۔''

''وہ بہت جلدی میں ہیں صاحب!'' افضل نے کہا۔

''آپ بیٹھیں بھیا!'' ارسلان نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں کہ اب پولیس کیوں آئی ہے؟'' وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے پیچھے نیچے اترا تو میری نظر پولیس کی ایک جیپ پر پڑی جو گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ میں نے گارڈ کو ہدایت کر دی تھی کہ اندر کوئی بھی گاڑی داخل نہیں ہو گی سوائے ان گاڑیوں کے جن کی اجازت ارسلان یا تیمور دیں گے۔

میں ڈرائنگ روم کے پاس کوریڈور میں جا ٹھہرا۔

اندر سے ارسلان اور کسی دوسرے شخص کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''ڈی آئی جی صاحب!'' ارسلان نے کہا۔ ''اب آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیس تو کورٹ میں ہے' اس کا فیصلہ بھی کورٹ ہی کرے گی۔''

''آپ پلیز' عمران صاحب کو بلائیں' مجھے ان سے بات کرنا ہے۔''

تیمور بھی میرے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ میں نے اسے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

ڈی آئی جی مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا۔ ''تشریف رکھیے' کہیے کیسے زحمت کی؟ اب پولیس میرے گھر سے کیا برآمد کرنا چاہتی ہے؟ راکٹ لانچر یا کوئی میزائل؟'' میرے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں نے تو ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''ہاں اسی لیے آپ ملک سے باہر ہونے کا ڈراما کر کے بیٹھ گئے تھے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''آپ میرے دوست کے والد ہیں اس لیے میں آپ کا بہت خیال کر رہا ہوں۔''

مجھے ایک دم یاد آ گیا کہ ارسلان کے کسی دوست کے والد ڈی آئی جی تھے اور انہوں نے ہماری مدد بھی کی تھی۔

''ارسلان!'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''پہلے ان کی بات سن لو وہ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انہوں نے ہماری بہت مدد کی تھی۔''

''لیکن جب ہم مصیبت میں پڑ گئے تو یہ ملک سے بیرونِ ملک جانے کا ڈراما کر کے بیٹھ گئے۔ مجھے بھی یقین تھا کہ آپ واقعی ملک سے باہر ہیں لیکن یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ آپ کے ساتھ آپ کا بیٹا بھی ہے۔ میں نے بعد میں تصدیق کی تو معلوم ہوا کہ آپ صرف ایک دن کے لیے اسلام آباد گئے تھے۔ باقی تمام وقت آپ یہیں موجود تھے۔''

”وہ میری مجبوری تھی‘ مجھے ہوم ڈپارٹمنٹ کی طرف سے حکم ملا تھا کہ میں اس کیس میں دخل اندازی کروں۔“

”پھر اب آپ کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ...... آپ اپنا کیس واپس لے لیں۔“ انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا اس کی ہدایات بھی آپ کو اوپر سے ملی ہیں؟“

”کیس واپس لینے کی صورت میں تو میں خود مجرم بن جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہی لیا جائے گا کہ میں نے وہ سب کچھ کیا ہے‘ جس کا الزام مجھ پر پولیس نے لگایا ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا‘ پولیس کی طرف سے آپ پر کوئی الزام نہیں لگایا جائے گا اور اس کیس کو ختم کر دیا جائے گا۔“

”یہ سب آپ کتنی آسانی سے کہہ رہے ہیں ڈی آئی جی صاحب؟“ میں نے کہا۔ ”میں حوالات میں رہا۔ میری ماں اور باپ کا انتقال بھی اس صدمے سے ہوا۔ میری بہن اغوا ہو گئی‘ اس کے لیے پولیس نے کیا کیا؟ اب آپ چاہتے ہیں کہ میں کیس واپس لے لوں؟“

”مجھے افسوس ہے کہ یہ سب کچھ ہوا لیکن......“

”ڈی آئی جی صاحب!“ میں نے کہا۔ ”کیس واپس لینے کا فیصلہ بیرسٹر انصاری کریں گے۔ اگر ان کی رائے بھی یہ ہی ہوئی تو میں کیس واپس لے لوں گا۔“

”بیرسٹر صاحب تو بہت اصولی آدمی ہیں۔“ ڈی آئی جی نے کہا۔ ”اس لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”بس‘ اگر بیرسٹر بخاری ہوتا تو شاید آپ یہ زحمت بھی نہ کرتے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

”عمران صاحب! آپ ابھی نوجوان ہیں‘ آپ کی رائے کی اونچ نیچ کا اندازہ و بھروسہ بھی نہیں ہے۔ میں......“

”میں آپ کو نوجوان لگتا ہوں؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”نوجوان ٹین ایجر ہوتا ہے اور میری عمر اس وقت چھبیس سال ہے۔“

”اگر آپ میری بات مان لیں گے تو فائدے میں رہیں گے۔“ ڈی آئی جی نے بھی سرد لہجے میں کہا۔

”ورنہ نقصان اٹھائیں گے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تو پھر آپ مجھے نقصان اٹھانے دیں‘ میرا تو پورا گھر بھی اجڑ چکا ہے۔ والدین اور بہن کے بعد اور مجھے کیا نقصان پہنچے گا؟ زیادہ سے زیادہ میں مارا جاؤں گا تو یہ بھی میرے لیے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔“ پھر میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”پولیس نے اب تک شائستہ کی بازیابی کے لیے کیا کیا ہے؟“

”پولیس کوشش کر رہی ہے۔“ ڈی آئی جی نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

”میں کیس واپس لینے کو تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔

ارسلان نے میری طرف چونک کر دیکھا اور بولا۔ ”بھیا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

ڈی آئی جی کی آنکھوں میں چمک ہوئی۔ ”یہ آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔“

”ہاں لیکن میری ایک شرط ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر پولیس نے تین دن کے اندر اندر میری بہن کو بازیاب کرا لیا تو میں کیس واپس لے لوں گا۔ تین دن بہت ہوتے ہیں ڈی آئی جی صاحب!“ میں نے کہا۔ ”پولیس چاہے تو کوئی بھی کیس اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر حل کر سکتی ہے۔“

”میں نے کہا نا کہ پولیس کوشش کر رہی ہے۔“

”تو اس کوشش کا نتیجہ بھی تو نکلنا چاہیے‘ تین دن کم تو نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم کیس واپس نہیں لو گے؟“ وہ درشت لہجے میں بولا اور اچانک آپ سے تم پر آ گیا۔

”آپ کس حیثیت میں یہاں آئے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”ارسلان کے دوست کی والد کی حیثیت سے یا ڈی آئی جی پولیس کی حیثیت سے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ارسلان کے انکل کی حیثیت سے آیا ہوں۔“ اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔

”سوری انکل......!“ ارسلان نے کہا۔ ”اس سلسلے میں ہم آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔ اگر آپ ذمے دار پولیس افسر کی حیثیت سے آئے ہوتے تو بات کچھ اور ہوتی۔“

”تم لوگ آخر سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟“ وہ تنگ آ کر بولا۔ ”میں اس وقت وردی میں ہوں‘ پولیس کی جیپ میں آیا ہوں‘ پولیس کے دو گارڈز بھی میرے ساتھ ہیں۔ کیا میں ذاتی حیثیت میں اس طرح آ سکتا تھا؟“

”تو آپ کیا ہمیں ہراساں کرنے آئے ہیں؟“ تیمور نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

”یہ بھی تمہارا بھائی ہے ارسلان؟“ اس نے پوچھا۔

”آں...... یہ بھی میرا بھائی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم میری بات مانو گے یا نہیں؟“

”نہیں......“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

ڈی آئی جی کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”تم شاید پولیس سے ابھی اچھی طرح واقف نہیں ہو‘ تمہیں آئندہ چند دن میں اپنی اس ہٹ دھرمی کا اندازہ ہو جائے گا۔“

”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”تم اگر اسے دھمکی سمجھتے ہو تو رہو اس خوش فہمی میں۔“ ڈی آئی جی نے کہا۔ ”لیکن یہ دھمکی نہیں ہے بلکہ میں......“

”ڈی آئی جی صاحب!“ تیمور نے اچانک کہا۔ ”اب آپ اس وقت تک یہاں سے نہیں جا سکتے جب تک بیرسٹر صاحب نہ آ جائیں۔“

”کون روکے گا مجھے؟“ ڈی آئی جی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”میں روکوں گا آپ کو۔“ تیمور نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔“

ڈی آئی جی نے بے اختیار اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن تیمور اس سے پہلے ہی پلک جھپکنے میں پسٹل نکال چکا تھا۔

تیمور کے ہاتھ میں گن دیکھ کر ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”تم...... تم مجھے اس کھلونے سے ڈرا رہے ہو؟“ انہوں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میری پوری زندگی ان ہی کھلونوں سے کھیلتے گزری ہے۔“

”میں ڈرا نہیں رہا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔ ”بلکہ ضرورت پڑنے پر فائر بھی کر سکتا ہوں۔“

اس کی بات سن کر ڈی آئی جی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ تیمور کے لہجے سے اسے یقین آ گیا کہ وہ واقعی فائر کر دے گا۔

تیمور نے آگے بڑھ کر ان کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ”آرام سے بیٹھ جائیں ڈی آئی جی صاحب‘ اور بیرسٹر صاحب کا انتظار کریں۔“

”آپ کو شاید احساس نہیں ہے کہ آپ کی یہ گفتگو بھی ریکارڈ ہو چکی ہے۔“ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا حالانکہ اس وقت میں نے ان کی بات چیت ریکارڈ نہیں کی تھی۔

ان کا سارا طنطنہ ہوا ہو گیا اور وہ صوفے پر گویا ڈھے گئے۔

”تم خود کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو لیکن تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ......“

”ڈی آئی جی صاحب' پلیز......!“ میں نے کہا۔ ”آپ کو شاید یاد نہیں ہے اور آپ نے ایک دفعہ میری مدد بھی کی تھی اس لیے میں ابھی تک آپ کا احترام کر رہا ہوں' بس اگر آپ اسی طرح بولتے رہے تو میں زیادہ دیر برداشت نہیں کروں گا۔“

توہین کے احساس سے ڈی آئی جی کا چہرہ مرجھا کر رہ گیا۔ شاید آج تک کسی بھی شخص نے ان سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

”میں اپنے وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ اگر تین دن کے اندر اندر شائستہ کو لے آتے ہیں تو میں کیس واپس لے لوں گا۔“

”شائستہ ایسے آدمی کے قبضے میں ہے جو......“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ پولیس کو شائستہ کے بارے میں علم ہے؟“

”میں نے یہ تو نہیں کہا' میں نے کہا کہ پولیس کوشش کر رہی ہے۔“

”آپ تو ابھی بھی اپنی کہی ہوئی بات سے انکار کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو آپ نے کہا ہے کہ شائستہ کس آدمی کے قبضے میں ہے۔“

”تم اگر صاف صاف سننا چاہتے ہو تو سنو۔“ ڈی آئی جی کو بھی غصہ آ گیا۔

میں نے اس سے پہلے ہی اپنا ریکارڈر آن کر دیا تھا جب انہیں یہ بتایا تھا کہ ان کی باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔ وہ مشتعل ہو کر پھر بھول گئے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں' ریکارڈ ہو رہا ہے۔

”شائستہ' مشہدی کے قبضے میں ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”آپ کو یقین ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے کیا' پورے ہوم ڈپارٹمنٹ کو معلوم ہے کہ شائستہ کہاں ہے؟“ انہوں نے کہا۔

”تو پھر اسے بازیاب کرانے میں کیا قباحت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

مشہدی کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔“ انہوں نے کہا۔

”گویا عوام کی جان و مال کے محافظ بھی بے بس ہیں؟ پولیس کا ایک ڈی آئی جی اپنی بے بسی کا اعتراف کر رہا ہے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”پولیس اس سے خوف زدہ نہیں ہے۔“ ڈی آئی جی نے کہا۔ ”بس ہمارے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں۔“

”اور یہ ہاتھ پیر باندھے کس نے ہیں؟“

”ہوم ڈپارٹمنٹ کے علاوہ اور کون......“ وہ بولتے بولتے چونک کر رک گئے۔ ”تم......تم......یہ باتیں بھی ریکارڈ کر رہے ہو؟“

”آف کورس۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں کسی بھی پولیس والے سے بات کرتے وقت اپنا ٹیپ ریکارڈر آن کر لیتا ہوں۔ اب آپ چاہیں تو جا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں' میری شرط اب بھی وہی ہے کہ تین دن کے اندر شائستہ مجھے مل جائے تو میں سب کچھ بھول جاؤں گا ورنہ ایک ثبوت آپ کے خلاف بھی میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔“

ڈی آئی جی نے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ مشہدی جب چاہے' چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہے۔ وہ انتہائی......“

”آپ جا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ میرا ارادہ بدل بھی سکتا ہے۔“

ڈی آئی جی نے پھر گھور کر مجھے دیکھا اور اپنی چھڑی ہلاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

”ہیں......ربھیا......!“ تیمور نے کہا۔ ”یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی؟“

”ہاں' میں خود حیران ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”پھر بھی آخر معاملہ کیا ہے؟ میں نے واقعی بیرسٹر انصاری صاحب کو بلایا ہے۔“

”تو پھر آپ نے اس ڈی آئی جی کو جانے کیوں دیا؟“ تیمور نے کہا۔

”وہ تو دوبارہ بیرسٹر صاحب کی ایک ٹیلی فون کال پر یہاں آ سکتا ہے۔“

اسی وقت افضل نے آ کر بتایا۔ ”بیرسٹر صاحب آ گئے ہیں صاحب جی!“ یہ کہہ کر اس نے بیرسٹر صاحب کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

میں نے سب کچھ انہیں تفصیل سے بتا دیا۔ وہ دیر تک اس معاملے پر غور کرتے رہے پھر بولے۔ ”اس ڈی آئی جی کو پھر بلا لو۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”انکل! کیا آپ نے اس کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“

”عمران! میں تمہارا بدخواہ نہیں ہوں۔ تمہارا باپ میرا بچپن کا دوست تھا۔ میں کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جس سے تمہیں یا تمہارے بھائیوں کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچے۔“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ”تمہارے نہ ہونے سے کاروبار بھی متاثر ہو رہا ہو گا۔“

”انکل! کیا آپ بھی ایسی بات کر سکتے ہیں؟“

”بیٹا! میں تمہارا انکل ہی ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ ”میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے تمہیں نقصان پہنچے۔ تم اس ڈی آئی جی کو بلاؤ۔“

میں نے ارسلان سے کہا کہ ڈی آئی جی کو ٹیلی فون کر دو کیونکہ اس کا نمبر ارسلان کے پاس تھا۔“

دس منٹ بعد وہ ڈی آئی جی پھر وہاں موجود تھا اور انکل انصاری کے سامنے خاصا مؤدب نظر آ رہا تھا۔

”ڈی آئی جی صاحب!“ انکل نے پوچھا۔ ”اگر میں کیس واپس لے لوں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ پولیس بھی عمران کو تمام سنگین الزامات سے بری کر دے گی؟“

”اس بات کی گارنٹی میں لیتا ہوں۔“ ڈی آئی جی نے کہا۔

”تو پھر ایسا کریں' پہلے عمران کے خلاف تمام کیس ختم کر دیں' میں بھی اپنا کیس واپس لے لوں گا۔“

”یہ کام تو کل ہی ہو جائے گا۔“ ڈی آئی جی پرجوش لہجے میں بولا۔

”تو پھر آپ کا کام بھی ہو جائے گا۔“

”لیکن سر......!“ ڈی آئی جی نے کہا۔ ”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ......“

”کوئی ضمانت نہیں ہے۔“ انکل نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ضمانت صرف میری زبان ہے۔ اگر آپ اس پر اعتبار کرتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ بات کو یہیں ختم کردیں۔“

”ٹھیک ہے‘ مجھے آپ کی زبان پر اعتماد ہے۔“ ڈی آئی جی نے کہا۔

”ہاں‘ ایک بات اور۔“ انکل نے کہا۔ ”عمران کی بہن کا معاملہ رہ ہی گیا۔“

”اس کا وعدہ تو میں ان سے پہلے ہی کرچکا ہوں۔“ ڈی آئی جی نے کہا۔ ”تم نے مجھے تین دن کا وقت دیا ہے نا؟“

”جی ہاں‘ آپ کے پاس اس میں سے بھی ایک گھنٹہ کم ہوگیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے‘ تمہیں تین دن سے پہلے ہی تمہاری بہن مل جائے گی۔“

”تو پھر میں کیس بھی تین دن بعد واپس لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کی بات کی کیا گارنٹی ہے؟“

”جب میں نے بیرسٹر صاحب کی زبان پر اعتبار کیا ہے تو تمہیں بھی مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔“ ڈی آئی جی نے کہا۔

میں نے انکل انصاری کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ڈی آئی جی صاحب! میں آپ کی زبان پر اعتبار کیے لیتا ہوں۔“

”اوکے عمران!“ ڈی آئی جی کھڑا ہوگیا۔ ”یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمہاری بہن تمہیں ضرور مل جائے گی تین دن کے اندر اندر۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھ سے اور انکل انصاری سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہوگیا۔

”انکل! ہم نے اس کی بات مان کر کوئی غلطی تو نہیں کردی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں بلکہ ہم فائدے میں رہے ہیں۔“ انکل نے کہا۔ ”تم ان تمام مقدمات سے بری ہوجاتے لیکن پولیس نے تمہارے خلاف قتل کا جو مقدمہ بنا رکھا ہے‘ وہ تمہارے گلے پڑ جاتا۔“

”قتل کا مقدمہ؟“ میں نے کہا۔

”ہاں‘ قتل کا مقدمہ......“ انکل نے کہا۔ ”ڈی آئی جی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ تم پولیس کے ہتھکنڈوں کو نہیں جانتے‘ ان لوگوں نے تمہیں راشد کے قتل میں ملوث کردیا ہے‘ وہ آلہ قتل بھی تمہارے گھر سے برآمد کرچکے ہیں۔“

”کب؟“ میں نے کہا۔

”جب وہ تمہارے گھر سے اسلحہ لے گئے تھے تو اس میں ایک ریوالور بھی تھا‘ اس سے راشد کو قتل کیا گیا ہے۔ وہ لوگ تمہیں گرفتار کرکے پولیس اسٹیشن لے جاتے اور اس ریوالور پر تمہاری انگلیوں کے نشانات حاصل کرلیتے۔“

میں حیرت سے منہ پھاڑے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”اب تم سوچ رہے ہو کہ مجھے ان باتوں کا علم کیسے ہوا؟ بیٹا! ایک کامیاب وکیل بننے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پولیس میں بھی میرے کچھ مخبر ہیں‘ ان ہی کے ذریعے مجھے اطلاعات ملی ہیں کہ وہ لوگ تمہارے خلاف کیا چال چلنے والے ہیں۔“

”لیکن راشد کا مرڈر تو......“

”میں جانتا ہوں کہ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ انکل انصاری نے میری بات کاٹ دی۔ ”لیکن پولیس چاہے تو باپ کو بیٹے اور شوہر کو بیوی کے قتل میں ملوث کرکے پھانسی پر چڑھادے یا عمر قید کی سزا کرا دے۔“ پھر وہ گھڑی دیکھ کر بولے۔ ”اب مجھے بھی جانا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔“

میں نے انہیں کھانے کے لیے روکنا چاہا لیکن ان کے پاس وقت نہیں تھا اس لیے وہ معذرت کرکے وہاں سے چلے گئے۔

”بھیا......!“ ارسلان نے کہا۔ ”مجھے اس ڈی آئی جی کی بات کا اعتبار نہیں ہے۔ اگر اس نے وعدہ خلافی کی تو میں خود اس کا کام تمام کردوں گا۔“

”اتنے جذباتی مت بنو ارسلان......!“ میں نے کہا۔ ”انکل انصاری نے کچھ سوچ کر ہی ایسا کیا ہے۔ ان کے اندازے غلط نہیں ہوسکتے۔“

دوسرے دن واقعی مجھ پر سے تمام سنگین الزامات ختم کردیئے گئے۔ جب محکمۂ داخلہ ان امور میں ملوث ہو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ انکل نے حسبِ وعدہ اپنا کیس واپس لے لیا۔ اب مجھے پولیس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا البتہ مشہدی کی طرف سے اب بھی خطرے کی تلوار میرے سر پر لٹک رہی تھی۔

مجھے اس وقت کا انتظار تھا جب شائستہ مجھے مل جاتی۔

تیسرے دن میں نے ڈی آئی جی کو ٹیلی فون کیا تو اس کا سیل فون آف تھا۔ دفتر میں ٹیلی فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ آفس میں موجود نہیں ہے۔

”بھیا!“ ارسلان نے کہا۔ ”میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے اس ڈی آئی جی پر اعتماد نہیں ہے لیکن آپ نے میری بات نہ مانی۔“

”فکر مت کرو ارسلان!“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو پورے چار گھنٹے باقی ہیں۔“

”تو کیا وہ ڈی آئی جی گھنٹوں اور منٹوں کا حساب کررہا ہوگا؟“ ارسلان نے چڑ کر کہا۔ ”کہ کب وقت پورا ہو اور وہ شائستہ کو ہمارے حوالے کرے۔“

”میں ابھی تھوڑی دیر میں انکل انصاری سے بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ان کا سیل فون بزی ہے‘ وہ کسی کلائنٹ سے بات کررہے ہوں گے۔“

ابھی میں ارسلان سے بات کر ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر انکل انصاری کا نام تھا۔ میں نے ارسلان سے کہا۔ ”لو‘ انکل کا ٹیلی فون آگیا۔“ یہ کہہ کر میں نے سیل فون کان سے لگا لیا اور بولا۔ ”السلام علیکم! انکل! میں ابھی آپ ہی کو کال کررہا تھا لیکن آپ کا سیل فون بزی تھا۔“

”وعلیکم السلام!“ انہوں نے جواب دیا لیکن ان کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔ ”ہاں‘ میں اپنے ایک کلائنٹ سے ڈسکس کررہا تھا۔“

”انکل! ابھی تک ڈی آئی جی صاحب نے رابطہ نہیں کیا ہے۔ کیا آپ سے ان کا رابطہ ہوا ہے؟ آج تیسرا دن ہے اور شائستہ......“

”عمران بیٹا......!“ انکل نے میری بات کاٹ دی۔ ”وہ ڈی آئی جی بے چارہ اپنے وعدے کی لاج رکھنے کے سلسلے میں اپنی جان سے گیا......“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ میں نے کہا۔

”ہاں بیٹا!“ انہوں نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے آفس سے نکلا تھا کہ ایک گاڑی سے اس پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈرائیور بھی ہلاک

ہوگیا۔تم شاید ٹی وی نہیں دیکھ رہے؟“
”لیکن انکل! اب شائستہ......“
”بیٹا! پریشان کیوں ہوتے ہو؟ شائستہ بھی انشاءاللہ مل جائے گی۔“ میں نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ سلسلہ منقطع کردیا اور خود بھی صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔
”کیا ہوا بھیا؟“ ارسلان نے پوچھا۔
میں نے اسے بتادیا کہ ڈی آئی جی کو آج نامعلوم افراد نے فائرنگ کرکے ہلاک کردیا۔
تیمور نے ہاتھ بڑھا کر ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ٹی وی آن کردیا۔
ٹی وی کے ہر چینل پر یہی خبر تھی کہ کچھ نامعلوم افراد نے ڈی آئی جی صادق علی کو گولیاں مار کے جاں بحق کردیا۔ ان کے ساتھ ہی ان کا ڈرائیور بھی جاں بحق ہوگیا اور فائرنگ سے ایک راہ گیر ہلاک اور چار آدمی زخمی ہوگئے۔
”اس کا مطلب ہے کہ ڈی آئی جی نے واقعی سنجیدگی سے کوشش کی تھی کہ وہ شائستہ کو ہمارے حوالے کردے۔ اسے غالباً شائستہ کے بارے میں کوئی سراغ مل گیا تھا اور وہ پوری دیانت داری سے اسے بازیاب کرانا چاہتا تھا۔
”اللہ ڈی آئی جی صاحب کی مغفرت کرے اور مجھے معاف کرے۔ میں ان کے بارے میں بہت غلط سوچ رہا تھا۔“ ارسلان نے کہا۔
ہم بھی غم زدہ تھے اور کمرے میں صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔
اس سکوت کو میری سیل فون کی بیل نے توڑ دیا۔ میں نے چونک کر اسکرین پر نظر ڈالی‘ وہاں کوئی اجنبی نمبر تھا۔ پہلے تو میں نے اسے نظر انداز کرنا چاہا اور بیل بجتی رہی۔
”کون ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔
”کوئی اجنبی نمبر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
اس دوران میں بیل بج بج کر خاموش ہوچکی تھی۔
چند سیکنڈ بعد پھر بیل بجنے لگی۔ اس مرتبہ بھی اسکرین پر وہی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے جھنجھلا کر دوسری بیل کے بعد سیل فون کا بٹن دبایا اور اسے کان سے لگا کر بولا۔ ”ہیلو۔“
”تم سو رہے تھے یا پھر بہرے ہوگئے ہو؟“ دوسری طرف سے کوئی نہایت اکھڑ لہجے اور توہین آمیز انداز میں بولا۔
”کون بول رہا ہے؟“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔
”میرے کئی نام ہیں۔“ اس نے چڑانے والے انداز میں کہا۔ ”فرشتۂ اجل‘ ملک الموت‘ عزرائیل......“
”تو عزرائیل صاحب...... کیسے زحمت فرمائی؟“ میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ روح قبض کرنا چاہتے ہیں تو ٹیلی فون پر تو ممکن نہیں‘ اس کے لیے آپ کو یہاں تک آنے کی زحمت کرنا ہوگی یا پھر آپ کو یہاں آنے میں کوئی قباحت ہے تو میں حاضر ہوجاتا ہوں۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔“
”بہت چہک رہے ہو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ابھی ساری شوخی ہوا ہوجائے گی۔“
”ظاہر ہے‘ جب آپ نزول فرمائیں گے تو شوخی کیا‘ میں خود بھی ہوا ہوجاؤں گا۔“

”لگتا ہے‘ آج کل کامیڈی فلمیں زیادہ دیکھ رہے ہو؟“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔
”آپ بھی ان فلموں سے شوق فرماتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”زیادہ بکواس مت کرو‘ تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو؟“
”ابھی آپ نے خود ہی تو اپنا تعارف کرایا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”پہلے بھی جانتا تھا لیکن بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع پہلی مرتبہ نصیب ہوا ہے۔“
”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اس ڈی آئی جی کے انجام سے عبرت پکڑو۔“
”میں تو ہر مرنے والے کو دیکھ کر عبرت پکڑتا ہوں اور اپنی موت کو یاد کرتا ہوں۔ کراچی میں تو آج کل روزانہ بہت سے لوگ ’تمہارا‘ لقمہ بن جاتے ہیں۔ آدمی کہاں تک عبرت پکڑے۔ اگر عبرت ہی پکڑتا رہے تو پھر وہ کسی بدمعاش اور دہشت گرد کو کب اور کیسے پکڑے گا؟“
”میرا نام سنو گے تو تمہاری پتلون گیلی ہوجائے گی۔“
”پہلی بات تو یہ کہ میں تمہارا نام ابھی تم ہی سے سن چکا ہوں‘ دوسری بات یہ کہ میں اس وقت پتلون میں نہیں ہوں اور تیسری اور آخری بات یہ کہ جو کچھ بھی میں نے پہن رکھا ہے‘ وہ گیلا نہیں ہوا۔“
میں یہ تو پہچان گیا تھا کہ یہ فون مشہدی کے کسی آدمی نے کیا ہے جو مجھے ڈی آئی جی کے انجام سے خوف زدہ کررہا ہے لیکن میں بھی جان بوجھ کر انجان بنا ہوا تھا۔
”تم نے شاید غلط نمبر ملا لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا نام سن کر تمہارا بھی وہی حال ہوگا اس لیے بہتر ہے کہ سیل فون بند کردو۔“
”تو خود کو بہت بڑا مسخرہ سمجھتا ہے؟“ وہ مشتعل ہوکر تم سے تو پر آگیا۔
”بہت بڑا تو نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس ملک میں مجھ سے بھی بڑے مسخرے ہیں مثلاً مشہدی......“
”لگتا ہے‘ تجھے اپنی بہن کی بالکل پروا نہیں ہے۔“
”میری بہن کو خراش بھی پہنچی تو تجھے اور تیرے اس مسخرے باس کو پھانسی کے تختے پر پہنچا دوں گا۔ وہ فائل ابھی تک اسے نہیں ملی ہے اور اب تو میرے پاس ایک مائیکرو فلم بھی ہے۔“ پھر میں سنجیدہ ہوکر بولا۔ ”اب سیدھی طرح اپنا نام اور کام بتا ورنہ میں فون بند کررہا ہوں۔“
”میں جان محمد ہوں لیکن مجھے موت کا ہرکارہ بھی کہتے ہیں۔“
”بہت خوشی ہوئی یہ جان کر‘ یہی بات لوگ میرے لیے بھی کہتے ہیں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اگر تجھ میں ہمت ہے تو سامنے آکر بات کر‘ میں بھی تو دیکھوں کہ کون کس کی موت کا ہرکارہ ہے۔“
”باس نے کہا ہے کہ اگر وہ فائل اسے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر نہ ملی تو پھر تیری بہن کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔“
”تیرا باس کیا گونگا ہے یا مجھ سے بات کرتے ہوئے شرما رہا ہے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اس سے کہنا کہ شرمانا چھوڑے اور مجھ سے براہ راست بات کرے۔ مجھے کسی درمیانی الو کے پٹھے کی ضرورت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔
تیمور‘ ارسلان اور ہاشم تینوں ہی میری بات پر ہنس رہے تھے۔ ارسلان کو میں نے ایک مدت بعد ہنستے دیکھا

تھا۔ اسے ہنستے دیکھ کر مجھے خود بھی ہنسی آ گئی۔ میں نے اسے ہنستے ہنستے بتایا کہ ٹیلی فون پر کون تھا اور کیا کہہ رہا تھا؟

سیل فون کی بیل دوبارہ بجی تو میں نے ہنستے ہنستے ہی اسکرین پر نظر ڈالی۔ اس مرتبہ بھی کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے دوسری گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بہت ہنسی آ رہی ہے عمران!'' دوسری طرف سے مشہدی کی آواز آئی۔

''بات ہی ہنسنے کی ہے' ابھی تمہارا ایک آدمی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ میری بہن کو ہلاک کر دے گا۔'' میں نے زبردستی ہنستے ہوئے کہا۔ ''اسے تم کتنی دفعہ ہلاک کرو گے؟ تم تو مجھے اس کی ڈیڈ باڈی بھجوا رہے تھے؟''

''میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''تمہاری بہن ابھی زندہ ہے۔''

''اب میں کیسے یقین کر لوں؟'' میں نے کہا۔ ''تم نے پہلے جھوٹ بولا تھا یا اب بول رہے ہو؟''

''تمہیں کیسے یقین آئے گا؟'' وہ کاٹ کھانے والے لہجے میں بولا۔

''تم اس سے میری بات کرا دو' مجھے یقین آ جائے گا۔'' میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''تو پھر اس سے بات کرو۔''

دوسرے ہی لمحے مجھے شائستہ کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''بھیا......!''

''تو کیسی ہے گڑیا؟'' میں بے تاب ہو کر بولا۔ ''تجھے ان لوگوں نے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟''

''نہیں بھیا! میں بہت آرام سے ہوں۔ آپ......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ مشہدی نے اس سے سیل فون چھین لیا تھا۔ وہ کرخت لہجے میں بولا۔ ''اب تو یقین آ گیا؟''

''ہاں' اب مجھے یقین آ گیا۔'' میں نے کہا۔

''اب اگر تم اپنی بہن کی واپسی چاہتے ہو تو مجھ سے ایک سودا کر لو۔''

میں خاموش رہا۔

''ہیلو عمران! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

''ہاں' میں سن رہا ہوں' تم بولتے رہو۔''

''تم تیمور سے وہ فائل حاصل کر کے اور مائیکرو فلم میرے حوالے کر دو۔ تمہاری بہن بخیر و عافیت تم تک پہنچ جائے گی۔''

''دیکھو مشہدی' تیمور میرا ماتحت نہیں ہے کہ میں اس سے کہوں گا اور وہ فائل مجھے دے دے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسے تو ابھی اس فائل کا علم نہیں ہے۔ تم نے اس کی ماں اور بہن کو ہلاک کر دیا' اس کے باپ کی جان لے لی۔ اگر فائل اس کے پاس ہوتی تو تم تک پہنچا چکا ہوتا۔ اپنی بہن اور ماں کو یوں موت کے منہ کے حوالے نہ کرتا۔''

''تم کسی بھی طرح اس سے فائل حاصل کرنے کی کوشش کرو۔''

''میری ملاقات تو اس سے کبھی کبھی ہی ہوتی ہے۔ میں اپنی بہن کی رہائی کے لیے یہ کوشش بھی کر لوں گا۔ اگر اس پہ تشدد بھی کرنا پڑا تو کروں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا مشہدی' اگر میری بہن کو ایک خراش بھی آئی تو......''

یہ پرتجسس' سنسنی خیز اور لہو رنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

آگ سے پیدا کی گئی مخلوق جنات کی ایسی کہانیاں جن میں چند کرشماتی شرارتیں اور بدی کے ساتھ انسانی عظمت اور کمزوریوں کے کردار ہوتے ہیں

شیما عبدالقیوم

محبت کا سحر

کمرے میں سناٹے کا راج تھا۔ وہ حیران حیران سی اُٹھ بیٹھی اور پھر بے ساختہ اُس کی نظر اپنے بائیں ہاتھ پر پڑی، مخروطی سفید انگلیاں اندھیرے میں چمک رہی تھیں اور تیسری انگلی میں......

ایک رحم دل حسینہ کی عجیب کہانی، اس نے تو نیکی کی تھی مگر......!



”اے چلو‘ باہر نکلو‘ اندر کہاں گھسے چلے آ رہے ہو؟“ چوکیدار کی آواز پر مہرالنساء نے پلٹ کر مین گیٹ پر دیکھا۔ چوکیدار زمین پر گھسٹ کر آگے آنے والے فقیر کا رستہ روک کر اسے واپس باہر نکل جانے کا کہہ رہا تھا۔ میلی کچیلی بنیان اور پھٹا پرانا پاجامہ پہنے وہ مفلوک الحال فقیر ہاتھ جوڑ کر کچھ بول رہا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں غالباً معذور تھیں کیونکہ وہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر گھسٹ رہا تھا۔ مہرالنساء نے پائپ نیچے ڈال دیا۔

”صامی بابا‘ پانی بند کر دیں۔“ یہ کہتی ہوئی وہ گیٹ کی طرف چل دی۔ ”کیا بات ہے؟ کون ہے یہ......؟“ اس نے اچٹتی نظر فقیر پر ڈالتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا۔

”باجی جی‘ صاحب کی گاڑی باہر نکلی تو نجانے کیسے یہ اندر آ دھمکا۔ اب کہتا ہے‘ دھوپ بہت ہے‘ اس سے آگے نہیں جایا جا رہا‘ دھوپ ڈھلنے تک یہاں پڑا رہنے دو۔“

فقیر نے نظر اٹھا کر پاس کھڑی دراز قامت خوبصورت سی لڑکی کو دیکھا جس کے گھنے بال کمر سے نیچے لہرا رہے تھے۔ ہوا جب اس کو چھوتی ہوئی اس کے پاس آتی تو بہت خوب صورت خوشبو چرا لا رہی تھی۔ کھڑا ناک نقشہ اور بے حد گورا رنگ‘ آنکھوں سے نرمی اور ملائمت جھلک رہی تھی۔

”بھوکا ہوں‘ پیاس لگی ہے‘ باہر دھوپ ہے‘ ہاتھ جل رہے ہیں دیکھو۔“ اس نے اپنی جھلسی ہوئی کالی ہتھیلیاں مہرالنساء کے سامنے پھیلا دیں جو سرخ ہو رہی تھیں اور کہیں کہیں جلنے کا پیلا پن بھی موجود تھا۔ مہرالنساء نے ترس کھاتی نظروں سے اُسے دیکھا‘ گھٹنے بھی چھلے ہوئے تھے۔

”اتنی تکلیف اٹھا کر باہر کیوں نکلے تھے؟“

”پھر کیا کرتا‘ بھوکا مر جاتا؟ یہ پیٹ کھانا مانگتا ہے۔“ فقیر کی آواز اور انداز اس کے حلیے کے بالکل برعکس تھے۔ گونج دار اور صاف لب و لہجہ۔ مہرالنساء نے حیرانی سے اس کی شخصیت کا امتزاج دیکھا۔

”چوکیدار‘ اسے کچھ کھانے کو دو اور دھوپ ہلکی ہو جانے پر چائے دینا۔“ یہ کہہ کر وہ مڑی ہی تھی کہ فقیر کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

”شکریہ‘ مہربان خاتون......!“ اس کے بولنے کا کیا شاہانہ انداز تھا۔ مہرالنساء نے ذرا کی ذرا گردن گھما کر دیکھا‘ کالے چہرے پر گہری نیلی آنکھیں بے حد نمایاں اور چمکیلی تھیں۔ وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔

•......•......•......•

”بٹی‘ یہ فقیر کون ہے؟“ اماں نے کھڑکی کی گرل سے جھانکتے ہوئے لان سے کچھ دور جامن کے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے فقیر کو دیکھا۔ مہرالنساء ٹی وی کی طرف متوجہ تھی۔

”کون‘ کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟“

”ارے‘ یہی جو کچھ دنوں سے یہاں بیٹھا رہتا ہے اور شام ڈھلے نکل جاتا ہے۔“

”ارے اماں! بے چارہ گلی گلی مانگتا پھرتا ہے‘ ہاتھ جل گئے بے چارے کے تو بڑی منتیں کر رہا تھا کہ دھوپ کا وقت گزارنے دیا کریں۔ میں نے ترس کھا کر کہہ دیا کہ ٹھیک ہے۔“ وہ لاپروائی سے بتا رہی تھی۔

”بٹی! یہ ٹھیک نہیں ہے‘ نجانے کون ہے؟“

”افوہ اماں......!“ وہ دُلار سے اُن کے کندھے پر جھول گئی۔ ”غریب آدمی ہے‘ بے ضرر ہے‘ کیا کر سکتا ہے؟“

”نہ بٹی......! کسی کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔“

”ہاں اماں......! یہی بات میں نے اور عظمیٰ نے بھی اسے سمجھائی ہے۔“ بھابھی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”بس بھابھی......! عظمیٰ ایک وہمی خاتون ہیں‘ رہنے دیں۔“ وہ چٹیا کے بل کھول رہی تھی۔

”نہیں چندا! یہ بہت عجیب سا آدمی ہے۔“ بھابھی نے ہولے سے گرل کا پردہ کھول کر پھیلا دیا تھا۔ انہیں لگا جیسے وہ فقیر اندر ہی دیکھ رہا ہو۔

”افوہ بھابھی......! بس کریں‘ اس کی ٹانگیں بھی نہیں‘ کیا کر سکتا ہے وہ؟“ اس کے انداز میں لاپروائی تھی۔

”ارے ایشا‘ میری جان......!“ اُس نے اندر آتی گول مٹول ایشا کو دبوچ لیا تھا۔

”پھوپھو‘ نگیں‘ آپ بہت زور سے پیار کرتی ہیں۔“ وہ منہ بسور رہی تھی۔

”اچھا......!“ اس نے ایشا کو مزید بھینچا۔

”ایسے‘ ایسے......“

”مما......! مما......! بچائیں۔ پھوپھو مجھے کھا رہی ہیں۔“ وہ اس کی گود میں مچل رہی تھی۔

•......•......•......•

”بابا جانی! مجھے آئس کریم دلا دیں نا پلیز۔“ ایشا‘ منصور کی گود میں ہمک رہی تھی۔

”جانِ بابا......! آفس لیٹ ہو جاؤں گا۔ آپ کو عظمیٰ پھوپھو دلا دیں گی نا۔“ منصور آج اپنے وقت سے کافی لیٹ اٹھا تھا۔ ساڑھے گیارہ ہو گئے تھے۔

”نہیں نہیں بابا جانی......!“ وہ اُن کے کندھے پر مضبوطی سے سر ٹکائے ہوئے تھی۔

”اِدھر آ جاؤ ایشاء! مما کے ساتھ چلو‘ آج نانا کے گھر بھی جائیں گے۔“ نمرہ نے پیار سے ایشاء کو اپنی طرف کھینچا۔

”پکا‘ جائیں گی نا؟“ وہ لمحوں میں اُس کی گود میں تھی۔

”تو اور کیا‘ پتہ ہے‘ ہم آئس کریم کھائیں گے‘ ٹوائز لائیں گے۔“ اس نے ایشاء کی کمر پر ہاتھ لے جا کر منصور کو جانے کا اشارہ دیا۔ جواباً منصور اُسے سلیوٹ کرتا جلدی جلدی باہر نکل گیا۔ گاڑی ڈرائیو وے سے نکالتے ہوئے اُس نے میلے کچیلے فقیر کو درخت کے نیچے کچھ کھاتے دیکھا۔ شیشہ نیچے اتار کر اس نے چوکیدار کو بلایا۔

”یہ کون ہے؟“ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ...... صاحب جی‘ فقیر ہے‘ کافی دن سے اِدھر ہی ہے‘ شام کو چلا جاتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ منصور نے قدرے ناگواری اور غصہ کے عالم میں چوکیدار کو گھورا۔ ”تم نے یہاں ٹرسٹ بنا لیا ہے‘ نکالو اسے اِدھر سے فوراً۔“

”وہ...... نہیں صاحب‘ میں نے نہیں......“ چوکیدار بوکھلا گیا۔ ”مہرالنساء بی بی نے اسے اجازت دیا ہے یہاں شام تک رکنے کی۔“ اسی اثناء میں منصور کا موبائل بج اٹھا۔ آفس سے کال تھی۔ کال اوکے کرتے ہوئے منصور نے فقیر کو دیکھا جو نہایت مگن انداز میں کھانا کھا رہا تھا۔

”ہاں روزی‘ بس 15 منٹ میں آتا ہوں۔ تم جب تک چائے وغیرہ ارینج کرو سلطان مغل کے لیے۔“ وہ عجلت میں گاڑی باہر نکال لے گیا تھا۔ کال بند کر کے اس نے پیچھے بند ہوتے گیٹ کو دیکھا۔

”بہت بے وقوف ہے یہ مہرالنساء‘ شام کو بات کرتا ہوں۔ پہلے زخمی کتا‘ بلی لے آئی تھی اور اب زخمی معذور......“ وہ خود سے بات کر رہا تھا۔

•......•......•......•

”مہرو‘ میرا خیال ہے کہ اب تم اس فقیر کو چلتا کرو۔“ رات وہ سب کھانا کھا رہے تھے جب منصور نے مہرالنساء کو مخاطب کیا۔

”بھیا‘ وہ کسی کا کیا لیتا ہے غریب‘ آپ اس کی اُس پہلے دن حالت دیکھتے‘ ہتھیلیاں اور گھٹنے نہ صرف چھلے ہوئے تھے بلکہ جل بھی گئے تھے۔“ مہرالنساء جب بولنے پر آتی تو نان اسٹاپ بولتی ہی چلی جاتی تھی۔ اماں نے خفگی سے اسے گھورا۔

”بڑا بھائی ہے تمہارا‘ کچھ سوچ کر ہی بول رہا ہوگا۔“

”اماں......!“ وہ بچوں کی طرح ناراض ہوگئی۔ عظمیٰ نے بھی اسے گھورا۔ ”بجو‘ کچھ عقل کے ناخن لے لو یار‘ نجانے کون ہے‘ کیسا ہے‘ کل کلاں کو کچھ نقصان دے بیٹھا تو؟“ وہ خاموشی سے چاول کھاتی رہی۔

”بھابھی‘ رائتہ پاس کردیں پلیز۔“

”یار‘ بڑی ڈھیٹ ہو قسم سے۔“ عظمیٰ تو جل ہی گئی تھی۔

”بھیا‘ ذرا موسم تبدیل ہوجائے تو میں اسے یہاں سے چلتا کردوں گی‘ بس گرمیاں گزرنے دیں۔“ اُس نے معصومیت سے پلکیں پٹپٹاتے ہوئے منصور کو دیکھا۔ منصور کو اپنی یہ دو بہنیں بہت عزیز تھیں۔ ابا میاں کے انتقال کے بعد اُسی نے انہیں خود میں سمیٹ لیا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

”اوکے مگر صرف گرمیوں تک۔“

”ایک دم پکا۔“ وہ ہنس دی تھی۔ منصور ہاتھ نیپکن سے صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”نمرہ‘ ایک کپ چائے کمرے میں لے آؤ یار‘ بہت تھک گیا آج تو۔“

”اوکے‘ بس کھانا کھالوں‘ آپ پہنچیں‘ میں لاتی ہوں۔“ نمرہ پلیٹ صاف کرتے ہوئے بولی۔

•......•......•......•

اُس روز مہرالنساء لان میں بیٹھی کچھ نوٹس مکمل کررہی تھی کہ وہی فقیر گھسٹتا ہوا اُس کے قریب آدھمکا۔ مہر نے چونک کر اُسے دیکھا‘ گہری نیلی آنکھیں اسی پر مرکوز تھیں۔ کتنی سپاٹ اور سنجیدہ نظریں ہیں اس کی‘ وہ بے چین ہوگئی۔

”کیا بات ہے‘ کچھ چاہیے تمہیں؟“ مہر کی آواز کا ترنم اس کے کانوں میں اترا۔ جواباً اس نے گردن ہلادی۔ ”کیا چاہیے‘ چوکیدار کو بتادیا ہوتا؟“

”نہیں‘ اُس کے بس میں نہیں تھا جبھی یہاں آپ کے پاس آیا ہوں۔“ مہر ہمیشہ کی طرح اس کی آواز میں الجھنے لگی۔

”کیا چاہیے؟“ وہ دانستہ لاپرواہ ہوئی۔

”آپ......“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

”کیا!!“ مہر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ فقیر نے اس کی بدلتی کیفیت کو بغور تکا۔

”آپ مجھے اپنے بھائی کی قمیص دے سکتی ہیں؟“ اس نے اپنی میلی پھٹتی ہوئی قمیص کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بہت پھٹ گئی ہے۔“ مہر نے سکون کا سانس لیا۔

’احمق آدمی......‘ وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

”کیا آپ مجھے کچھ کہہ رہی ہیں؟“ فقیر بہت اطمینان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں تو......“ وہ گڑبڑا گئی۔

”اور آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے یہاں گرمیاں ختم ہونے تک کی اجازت دلادی۔“ ”کس قدر خوب صورت آواز ہے اس فقیر کی۔ بولتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ......“ ”آپ کیا چاہتی ہیں؟“ وہ اس کے بالکل سامنے آگیا۔

”نہیں......“ مہرالنساء نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”کیا مطلب‘ میں تمہیں کپڑے بھجوادیتی ہوں ماسی کے ہاتھ۔“ وہ کتابیں اٹھائے بغیر تیز تیز قدموں سے اندر جارہی تھی۔ فقیر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔

•......•......•......•

اب گھر والے بھی کافی مطمئن تھے۔ مہینہ ہونے کو آیا تھا مگر اس فقیر نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس پر وہ اس پر توجہ رکھتے بلکہ اب تو نمرہ اور کبھی کبھی عظمیٰ بھی کھانے کے لیے اسے کچھ نہ کچھ بھیج دیا کرتی تھیں۔ وہ فقیر جب تک بیٹھا رہتا یا تو خلاؤں میں نظریں مرکوز رکھتا یا آنکھیں بند کیے کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ ایک حیران کن بات یہ ہوئی تھی کہ منصور کا بزنس بہت تیزی سے اوپر جانے لگا تھا۔ اب وہ ایک مشہور صنعت کار کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا تھا۔ عظمیٰ کے لیے بھی ایک بے حد امیر وکبیر گھرانے کا رشتہ آگیا تھا۔ ان کے گھریلو حالات مزید بہتر سے بہترین ہوتے جارہے تھے۔ اماں بھی اس فقیر کا خیال رکھنے لگی تھیں مگر ایک رات مہرالنساء نہایت گھبرائی ہوئی اماں کے کمرے میں آگئی۔

”اماں جانی‘ کیا میں آپ کے ساتھ سو جاؤں؟“ وہ بہت ہراساں تھی۔

”ہاں بٹیا‘ آجاؤ۔“ وہ پیچھے کو ہٹ گئیں اور مہرالنساء اُن کے ساتھ دبک کر سو گئی۔

”رات کو کیا ہوگیا تھا مہرو؟“ صبح ناشتا کرتے ہوئے انہیں رات کی بات یاد آئی۔ مہرو ناشتا کرتے کرتے رک گئی۔

”پتہ نہیں‘ کیا بات ہے اماں جانی‘ کچھ راتوں سے مجھے بہت عجیب خواب نظر آنے لگے ہیں اور کل رات تو بہت ہی عجیب سا......“ اتنا کہہ کر وہ رک گئی۔

”کیا ہوا بٹیا؟“ اماں فکر مند سی ہوگئیں۔

”کچھ نہیں اماں جانی......! بس بہت ڈراؤنا خواب تھا اسی لیے آپ کے کمرے میں آگئی تھی۔“ وہ مسکرادی۔ ”اچھا اماں جانی......! بس میں نکلتی ہوں‘ آج اسائنمنٹ جمع کروانا ہے۔“ وہ اُن کے ماتھے کو چومتی ہوئی باہر نکل گئی۔

•......•......•......•

مہرالنساء مستقل اُس کالی بلی کے بارے میں سوچ رہی تھی جو متواتر اس کے خوابوں میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس خواب نے اسے کوفت میں مبتلا کردیا تھا۔ یہ بلی کبھی اس کے پیروں میں لوٹا کرتی تھی تو کبھی اس کی ہتھیلیاں چاٹا کرتی تھی۔ خواب کی حد تک تو درست تھا مگر کل رات یہ کیفیات اتنی اور عجیب تھیں کہ آنکھ کھلنے کے بعد بھی اس بلی کا ملائم وجود اسے خود سے قریب محسوس ہوتا رہا تھا اور کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس اتنا قوی تھا کہ وہ خوفزدہ ہوکر اماں جانی کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

”کیا بات ہے مہرالنساء؟“ اُس کی پروفیسر حمیدہ خاتون نے اُسے مستقل کنپٹیاں دباتے پوچھ لیا تھا۔

”کچھ نہیں میڈم‘ آئی ایم فائن۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ کچھ تو تھا جو انہیں بھی ڈسٹرب کرگیا۔ مہرالنساء قابل ترین اسٹوڈنٹس میں شمار کی جاتی تھی۔

”اگر کچھ ہے تو آپ مجھ سے share کرسکتی ہیں۔“ وہ نرمی سے مسکرائیں۔

”شیور میڈم۔“ وہ سر جھٹکتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج کل نجانے کیا ہوگیا تھا کہ وہ گھر سے زیادہ دور نہیں رہ پاتی تھی۔ عجیب سی گھبراہٹ اُس پر طاری ہونے لگتی تھی‘ قدم بوجھل ہونے لگتے تھے حالانکہ اس کا سوشل سرکل کافی بڑا تھا اور اُس کا زیادہ ٹائم اسی میں گزرا کرتا تھا۔ وہ بےزاری سے کار ڈرائیو کررہی تھی۔ نجانے کیا تھا جو اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ ہر لمحہ یہ کیفیات اس پر طاری رہا کرتی تھیں۔ دوست احباب سب سے دور رہنے کا دل چاہنے لگا تھا۔

•......•......•......•

رات کے ڈھائی بج رہے تھے‘ مہرالنساء نے نظر

اٹھا کر وال کلاک کو دیکھا اور کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس نے لمبی جمائی لیتے ہوئے لیمپ بجھا دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ گہری نیند سو چکی تھی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا اور خاموشی تھی، تبھی کمرے میں نیلی روشنی آنے لگی تھی جو آہستہ آہستہ مہرالنساء کے چہرے پر چھا رہی تھی۔ مہرالنساء کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔

"مہرالنساء، تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" آواز مانوس سی تھی۔ "میں تم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں۔ کیا تم میری ہونا چاہو گی؟" آواز میں عجیب سا سحر تھا، ہر طرف آواز گونج رہی تھی۔

"مگر میں تمہیں نہیں جانتی اور تم ہو کون؟" بلی اس کے پیروں میں بیٹھی اسے تک رہی تھی۔

"کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں، بہت محبت کرتا ہوں؟" آواز کا طلسم بڑھ رہا تھا۔ مہرالنساء کو یہ سب کچھ بہت غیر فطری، نامانوس مگر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اسے چاہتا تھا۔

"یہ تمہارے لیے۔" بڑے بڑے نگینوں سے جگمگاتی انگوٹھی اس کے پاس تھی۔ "اسے پہن لو مہرالنساء، یہ میری محبت کا حصار ہے جو ہمیشہ تمہارے اردگرد قائم رہے گا۔" آواز میں خوشی تھی، مان تھا۔

"یہ خود پہناؤ گے مجھے؟" مہرالنساء دھیرے سے بولی۔

"ہاں، کیوں نہیں۔" لمحوں میں انگوٹھی مہرالنساء کے ہاتھ میں جگمگا رہی تھی۔ مہرالنساء نے دھیرے سے کروٹ لی۔ حد سے زیادہ ٹھنڈک کا احساس تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں سناٹے کا راج تھا مگر سرہانے چنبیلی کی کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ وہ حیران حیران سی اٹھ بیٹھی۔ "یہ سب کیا ہو رہا تھا؟" بے ساختہ اس کی نظر اپنے بائیں ہاتھ پر پڑی، مخروطی سفید انگلیاں اندھیرے میں چمک رہی تھیں اور تیسری انگلی میں انگوٹھی موجود تھی۔ مہرالنساء نے حیرانی سے اسے چھوا اور اسے چوم کر مسکرا دی۔ آنکھیں پھر بوجھل سی ہو رہی تھیں۔

•......•......•......•

"واؤ...... ہاؤ پریٹی......!" عظمیٰ نے مہرالنساء کی انگلی میں جگمگاتی انگوٹھی دیکھی۔ "یہ کس نے دی تمہیں مہرو؟"

مہرالنساء جو کہ گیلے بالوں کو انگلیوں سے سلجھا رہی تھی، مسکرا دی۔ "یہ بہت خاص انسان نے دی ہے۔"

"مطلب؟" عظمیٰ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"اونہوں...... پریشان مت ہو، وقت آنے پر سب بتا دوں گی۔" عظمیٰ کو اس کی مسکراہٹ بہت عجیب لگی تھی۔ مہرالنساء کا چہرہ چمک رہا تھا۔ آنکھیں تو خیر، ہمیشہ سے خوب صورت تھیں مگر اب بہت روشن لگ رہی تھیں۔

"مہرو، تم کسی غلط آدمی کا انتخاب مت کر لینا۔ بھیا اور اماں کا مان مت توڑ دینا۔" عظمیٰ نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"ایسا کچھ نہیں ہے عظمیٰ!" مہرالنساء نے محبت سے اس کے ہاتھ کی پشت تھپتھپائی تھی۔ "وہ غلط انسان نہیں ہے ہاں مگر کچھ عجیب ضرور ہے۔ روزانہ خوابوں میں چلا آتا ہے اور جب جاتا ہے تو ہر شے کو اپنے حصار میں قید کر جاتا ہے مجھے، دیکھو۔" وہ عظمیٰ کے عین سامنے آ گئی۔ چہرہ تپ رہا تھا۔ "میں بھی اس کے حصار میں ہوں۔" وہ سرگوشی میں بول رہی تھی۔ آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ "عظمیٰ! مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے، روزانہ رات میں جب تک اس سے بات نہ کر لوں، مجھے سکون نہیں ملتا۔ جانتی ہو، وہ میرے سونے کا انتظار کرتا ہے اور جب میں سو جاتی ہوں تو چپکے سے میرے پاس آ جاتا ہے۔" وہ جیسے نیند میں بول رہی تھی۔ عظمیٰ کو وہ بہت عجیب لگی۔

"ارے مہرو، کیا ہوا ہے تمہیں؟" عظمیٰ نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ "کیا اول فول بکے جا رہی ہو؟" وہ کافی تیز لہجے میں بولی۔ "اور اتار و اسے، نجانے کہاں سے پہن کر آ گئی ہو؟" اس نے تیزی سے مہرالنساء کی انگلی سے وہ انگوٹھی اتار پھینکی۔ لمحوں کے لمحوں سب تبدیل ہو گیا تھا۔ مہرالنساء نے غرا کر عظمیٰ کو گھورا اور تھپڑ کھینچ مارا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

"تیری ہمت کس طرح ہوئی؟ تو ہوتی کون ہے؟" اس کی آواز بدلتی جا رہی تھی۔ عظمیٰ سکتے کی حالت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ "ہم ایک ہو چکے ہیں اور کوئی ہمیں علیحدہ نہیں کر سکتا، کبھی نہیں۔" اس نے عظمیٰ کو دھکا دیا۔ وہ سیدھی ڈریسنگ ٹیبل سے جا ٹکرائی۔ اس کی نظر دروازے پر کھڑی اماں اور بھابھی پر پڑی جو حیرت و دہشت سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ "نکل یہاں سے......" نازک سی مہرالنساء میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت امڈ آئی تھی کہ وہ عظمیٰ کو بازو سے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ "آئندہ تیرے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتوں گی۔" اس نے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا تھا۔ اماں اور بھابھی تھر تھر کانپتی عظمیٰ سے لپٹ گئی تھیں۔

"اماں......! کچھ غلط ہے۔" وہ رو رہی تھی۔ "مہرالنساء، وہ نہیں رہی۔"

•......•......•......•

منصور کافی فکرمندی سے سب سن رہا تھا، چہرے پر تناؤ کی کیفیت ابھر آئی تھی۔ "بیٹا، مجھے یہ سب کسی اور مخلوق کی کارستانی لگتی ہے۔" اماں نے منصور کو بغور دیکھا تھا۔

"یہ کسی عام انسان کا معاملہ نہیں ہے۔" نمرہ نے بھی اماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ہاں مائی، یہ سب میں نے بھی دیکھا ہے، ضرور کچھ اور ہے۔" ابھی وہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ مہرالنساء کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے بلاارادہ اسے دیکھا، وہ عام دنوں سے زیادہ نکھری ہوئی اور خوب صورت لگ رہی تھی، لمبے سیاہ بال کمر سے نیچے لہرا رہے تھے۔

"ہیلو، کیا بات ہے؟" وہ مسکراتی ہوئی منصور کے بازو سے چپک گئی۔ "بھیا، مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

"ہاں چندا، بولو۔" وہ جبراً مسکرایا۔

"میں، سب کے سامنے آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" وہ نہایت پراعتماد انداز میں منصور سے بات کر رہی تھی۔ اماں، عظمیٰ اور نمرہ نے چونکنے انداز میں اسے دیکھا۔ "بھیا......! میں کسی کو پسند کرتی ہوں، پسند نہیں بلکہ مجھے اس سے محبت ہے، شدید اور بے اختیار محبت۔" وہ جیسے کسی ٹرانس میں بول رہی تھی۔ "مجھے اس کو آپ سب سے ملوانا ہے اور ملوانے کا مطلب آپ بخوبی جانتے ہیں نا، مجھے اس سے شادی کرنی ہے۔"

"یہ کیا بول رہی ہو مہرو......؟" اماں نے اسے گھرکا۔ "یہ کیسی بات ہے جس انسان کا نہ اتا نہ پتا، ہم کیسے تمہیں اسے سونپ سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں سونپ سکتے؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "سونپنا پڑے گا کیونکہ میں اسے اپنا آپ سونپ چکی ہوں۔" عظمیٰ اور نمرہ پتھر کی مورت بنے اسے گھور رہے تھے۔ یہ وہ مہرالنساء تو نہیں تھی۔

"تمیز سے بات کرو مہرالنساء، منصور صرف تمہارا بھائی ہی نہیں، باپ برابر ہے۔" اماں اب غصے میں

آ چکی تھیں۔ جواباً وہ سرد نظروں سے انہیں گھورتی رہی۔ منصور نے اماں کا ہاتھ دبایا۔

''ٹھیک ہے گڑیا' مجھے اس سے ملواؤ۔''

''ہاں' ضرور۔'' وہ منصور کی طرف مڑی۔ ''وہ کل صبح اس پتے پر آپ سے ملے گا۔''

''کیا مطلب؟'' منصور نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ''وہ یہاں نہیں آئے گا؟''

''نہیں' آپ جائیں گے اور ضرور جائیں گے۔'' وہ اتنا کہہ کر باہر نکل گئی۔ اماں غصے اور افسوس کی کیفیت میں گھری ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں جبکہ نمرہ اور عظمٰی حیران تھیں۔

•......•......•......•

صبح ناشتے کی ٹیبل پر سب خاموشی سے ناشتا کررہے تھے۔ ہنستا بستا گھرانہ یاس کی تصویر بن گیا تھا۔ ''بھیا......!'' مہرالنساء نے چائے کا کپ اٹھاتے منصور کو مخاطب کیا۔ ''اس نے آج گیارہ بجے آپ کو بلایا ہے اور آپ اکیلے جائیں گے' کسی اور کو نہیں لے کر جائیں گے۔'' اماں حیرت اور افسوس سے اپنی خوبصورت بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ منصور نے کچھ سوچ کر سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے گڑیا' چلا جاؤں گا مگر تمہیں ہمارے لیے سوچنا چاہیے تھا' ہم تمہارے بڑے ہیں۔''

''جواباً مہرالنساء نے آنسوؤں سے بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ''بھیا! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر ایک لمحہ بھلانے کی کوشش کروں تو جیسے کوئی میری رگ رگ میں سوئیاں چبھانے لگتا ہے۔ میں مجبور ہوگئی بھیا......!'' وہ یکدم چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے رو پڑی۔ منصور نے اٹھ کر اس کا سر سہلایا اور کچھ بولے بنا کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے سے نکل کر وہ پورچ میں آرکا۔

''فیض......!'' اس نے ڈرائیور کو آواز دی۔

''گاڑی نکالو' ہمیں کام سے جانا ہے۔''

''بہتر صاحب......!'' فیض برسوں سے اس گھر کا نمک خوار تھا اور اپنی بیوی کی زبانی اسے اندر کے حالات کافی پتہ چل چکے تھے۔ بلاارادہ منصور کی نظر کونے پر لگے درخت پر پڑی۔

''یہ فقیر کہاں گیا؟''

''وہ تو کافی عرصہ ہوا' یہاں سے چلا گیا صاحب......!'' فیض گاڑی پر کپڑا پھیرتے ہوئے بولا۔

''تم گاڑی چیک کرو' میں change کر کے آتا ہوں۔'' منصور واپس اندر مڑ گیا۔ فیض نے کافی پرسوچ نظروں سے منصور کو دیکھا تھا۔

•......•......•......•

''یہاں کس سے ملنا ہے آپ کو صاحب؟'' فیض نے حیرانی سے اس ویران علاقے کو دیکھا' سنسان سا' غیر آباد سا علاقہ تھا۔ منصور خود حیرانی میں مبتلا تھا۔ پرچے پہ لکھا پتہ سامنے بنے مکان کا تھا جو کہ کچا پکا تھا' بغیر پلاستر کی دیواریں' لکڑی کا ٹوٹا' جھولتا دروازہ مکینوں کی زبوں حالی کی داستان سنا رہا تھا۔ منصور کچھ بولے بنا اس دروازے سے اندر گھسا۔ فیض کچھ سوچتا ہوا اس کے پیچھے ہی اندر آ گیا۔

بڑا سا صحن تھا جس میں نیم کا درخت تھا۔ سامنے ایک کمرا تھا جس پر میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔

''اندر آ جائیں۔'' اندر سے مردانہ آواز نے پکارا جو کافی مہذب تھی۔ منصور نے حیرانی سے فیض کو دیکھا۔ فیض کو یہ آواز کافی مانوس سی لگی۔ دونوں نیم اندھیرے کمرے میں داخل ہوگئے۔ اندر داخل ہوتے ہی حیرت کا پہاڑ تھا جو اُن دونوں پر ٹوٹا۔ سامنے معذور فقیر بیٹھا مسکرا رہا تھا' اس کی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں اور سفید دانت نمایاں تھے۔

''تم......؟'' منصور نے نہایت غصہ سے اسے گھورا۔ ''تو یہ تم ہو؟''

''ہاں' منصور صاحب' یہ میں ہوں جس سے مہرالنساء محبت کرتی ہیں۔'' وہ پرسکون انداز میں مسکرایا تھا۔

''تیری یہ جرات......؟'' مارے غصہ کے منصور کا برا حال تھا۔ ''اپنی حالت اور اوقات بھول گیا تو؟ دو ٹکے کا معذور فقیر......'' منصور سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''اوقات میں نہیں' مہرالنساء بھول گئی ہیں' وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔'' وہ بتدریج پرسکون انداز میں بول رہا تھا۔ ''اور میری اوقات بدل جائے گی جب میں کروڑ پتی منصور خاقانی کا بہنوئی بنوں گا......'' فیض سے اب صبر نہیں ہوا تھا' وہ اس پر بری طرح پل پڑا تھا۔ دونوں ٹانگوں سے معذور انسان کس طرح اس کا مقابلہ کرتا' اس اچانک حملے نے اسے کچھ کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ فیض اسے بری طرح مار رہا تھا۔ فیض نے طیش میں آ کر پاس پڑی کانچ کی بوتل توڑ کر اس سے فقیر کو بری طرح لہولہان کردیا تھا۔

•......•......•......•

''یاخدا! یہ مہرالنساء کے کمرے سے کیسی آوازیں آ رہی ہیں؟'' عظمٰی' نمرہ ہولتی ہوئی بھاگی تھیں۔ اندر سے یوں آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی مہرالنساء کو بری طرح پیٹ رہا ہو۔ اماں بھی ہولتی بھاگتی آئی تھیں۔ دونوں نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا۔ مہرالنساء بیڈ پر لہولہان تھی۔ عظمٰی نے بھاگ کر اس کو سہارا دے کر اٹھایا' وہ نیم بے ہوش تھی' ہاتھوں' بازوؤں پر جا بجا کھرونچیں تھیں' آنکھ کے نیچے نیل تھا جبکہ ماتھے سے خون رس رہا تھا جیسے کسی نے نوکیلی چیز سے اسے خوب مارا ہو۔

''اوہ میرے رب! رحم فرما!'' کمزور سی اماں اس کی حالت دیکھ کر رو پڑیں۔

''عظمٰی......! بھاگ کر گاڑی نکلواؤ' منصور کو فون کرو' ہری اپ۔'' نمرہ نے بے حال ہوتی مہر کو سنبھالا۔

''نفیسہ......! نفیسہ......!'' عظمٰی نے دروازے سے لگی حیران ہوتی نفیسہ کو پکارا۔ ''تم' اماں اور بے بی کو دیکھنا' ہم اسے ہاسپٹل لے جا رہے ہیں۔''

''جی' باجی جی......!'' وہ اماں کے قریب آ گئی جو کہ مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔

''گاڑی نکال لی ہے چھوٹی بیگم صاحبہ!'' چوکیدار نے ہال سے آواز لگائی۔ وہ دونوں بے ہوش مہرالنساء کو سنبھالتی پورچ تک آ گئی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد عظمٰی نے منصور کو کال ملائی۔

''بھیا......! جلدی جنرل ہسپتال آ جائیں' مہر کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔''

•......•......•......•

منصور حیرت اور پریشانی سے پڑی نیم بے ہوش مہر کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ٹھیک اسی جگہ چوٹیں لگی تھیں جہاں جہاں فیض نے فقیر کو مارا تھا۔ فیض بھی کچھ دیر یہ سب سکتے کی حالت میں دیکھتا رہا پھر باہر نکل گیا۔ ہسپتال کے لان میں وہ پریشانی سے ٹہل رہا تھا' وہ اُن سب سے بے حد محبت کرتا تھا اور آج وہ سب پریشان تھے تو فیض بھی اُن کا درد محسوس کر رہا تھا۔

'کاش' میں اپنے پیارے مالکوں کے لیے کچھ کرتا۔' تبھی ہاسپٹل میں بنے مسجد کے احاطے میں لوگ نماز کے لیے جمع ہو رہے تھے تو وہ بھی اسی طرف چل پڑا۔ نماز ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ آنکھیں بند کیے مستقل اُن سب کے لیے دُعا کر رہا تھا۔ ذہن میں معذور فقیر گھوم رہا تھا۔ 'کون ہے وہ؟ کہاں سے آیا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے؟' یہ سوال مستقل اس

کے ذہن کو کچوکے لگائے جا رہے تھے۔ مہر کے زخمی وجود نے اس کو حد سے زیادہ شرمندگی میں ڈال دیا تھا۔ کاش کہ وہ اس فقیر کو نہ مارتا تو نازک سی مہر اس تکلیف میں نہ پڑتی۔

''یہ تکلیف تو خود اس نے اپنے گلے میں ڈالی ہے تو کیوں روتا ہے؟'' کافی بارعب آواز تھی جس نے فیض کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بے ساختہ آنکھیں کھول کر اپنے قریب دیکھا' پچاس' پچپن سال کی عمر کا باریش آدمی اسے تک رہا تھا۔

''آپ......؟'' وہ کچھ بول بھی نہ پایا کہ اس آدمی نے اپنے لبوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''کدھر ہے وہ پاگل جس نے اس حیوان کو خود پر مسلط کیا ہے؟ مجھے لے چل اس کے پاس۔'' فیض اس آدمی کو لیے چپ چاپ ہسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں چلا آیا۔

منصور نے اندر آتے فیض اور اس کے ساتھ لمبے سے باریش مرد کو دیکھا جس کے چہرے پر بے پناہ نور اور سنجیدگی تھی۔

''السلامُ علیکم!'' اس نے با آوازِ بلند سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' منصور نے جواب دیتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ کتنی ملائمت تھی ہاتھ میں' یوں لگا جیسے کوئی روئی ہو۔ نمرہ اور عظمٰی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''بٹیا' آپ لوگ کچھ دیر کے لیے باہر چلی جائیں۔'' وہ کسی سے بھی نگاہیں ملائے بغیر مخاطب تھا۔ نمرہ' منصور کے اشارے پر عظمٰی کو لیے باہر نکل گئی۔ مہر بے ہوش تھی۔ وہ اس کے قریب پڑی کرسی پر آ بیٹھا۔ زیرِ لب کچھ دُعائیں پڑھتے وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

''منصور......!'' کچھ دیر بعد اس نے آواز دی۔

''جی......!'' منصور کچھ حیران حیران سا قریب چلا آیا۔

''میرا نام عبداللہ ہے۔ تم اپنی بہن کے قریب بیٹھ جاؤ۔'' کچھ کہے بنا منصور' مہر کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''فیض' کسی کو اندر مت آنے دینا' تم باہر چلے جاؤ' تمہاری بی بیاں پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' فیض سر ہلاتا باہر نکل آیا۔ نجانے کیوں اسے لگا تھا کہ عبداللہ کو اللہ نے ان کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔

''مہرالنساء کی انگلی میں پڑی انگوٹھی نکال دو منصور' حیرت ہے' اس فساد کی جڑ پر کسی کی نظر نہیں گئی؟ وہ شیطان اسی کی مدد سے مہرالنساء پر حاوی ہوا ہے۔'' عبداللہ کی نظریں مستقل زمین پر تھیں۔ منصور نے بے ہوش پڑی مہرالنساء کا بایاں ہاتھ تھاما جو کہ برف کی مانند سرد ہو رہا تھا۔ غیر معمولی بڑی انگوٹھی کا نگینہ گہرا نیلا تھا جو خوب چمک رہا تھا۔ منصور نے جیسے ہی انگوٹھی کو چھوا' وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا' بے ساختہ اس نے ہاتھ پیچھے کیا تھا۔ ہزار وولٹیج کا کرنٹ تھا جو اسے لگا تھا۔

''بسم اللہ سے کام شروع کرتے ہیں منصور......!'' عبداللہ کی آواز ملائمت سے بھرپور تھی۔ شرمندہ شرمندہ سے منصور نے بسم اللہ پڑھ کر ہاتھ تھام لیا تھا۔ انگوٹھی آرام سے اتر گئی تھی۔ یکایک کمرے کا ٹمپریچر گھٹنا شروع ہو گیا تھا' ہوا نہ ہونے کے باوجود منصور ہواؤں کا شور اور ٹھنڈ محسوس کر رہا تھا۔ عبداللہ نے انگوٹھی سیدھے ہاتھ میں تھام لی تھی۔ وہ مستقل کچھ پڑھے جا رہا تھا۔ منصور کا وجود سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے مہرالنساء کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہ مستقل غنودگی میں تھی۔

''معاف کر دو مجھے......معاف کر دو......'' اچانک ہی فضا میں آواز ابھرنا شروع ہو گئی تھی۔

''غلطی ہوئی مجھ سے' میں انسانی جسم میں قید ہو گیا تھا اور پھر ایک دن زخمی بھی تو اس کے گھر چلا آیا۔'' آواز میں تکلیف تھی۔ ''اس لڑکی سے مجھے محبت ہو گئی تھی۔''

''احسان فراموش' تو نے ہمدردی کا یہ صلہ دیا اس نیک لڑکی کو کہ اس کا طلب گار بن بیٹھا؟'' عبداللہ کی آواز میں شدید غصہ تھا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں' دور چلا جاؤں گا' مجھے معاف کر دو۔'' منصور پہچان گیا تھا' یہ آواز تو اس فقیر کی تھی۔

''نہیں' اب تیرا اس دنیا میں رہنا ممکن نہیں رہا' تجھے وہاں لوٹنا ہو گا جہاں سے تیرا سفر شروع ہوا تھا۔'' عبداللہ گونجتی آواز میں بول رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دو' میں اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وعدہ کرتا ہوں' انسانوں سے دور رہوں گا۔'' آواز میں خوف تھا' منت سماجت تھی۔

''نہیں' یہ ممکن نہیں۔'' یہ کہہ کر عبداللہ دوبارہ کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ منصور خوف کے عالم میں سب دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد عبداللہ نے آنکھیں کھول دی تھیں اور مسکرا کر منصور کو دیکھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''سب ختم منصور' سب بہتر ہو گیا ہے۔''

''آپ کا شکریہ۔'' منصور بے ساختہ رو پڑا تھا۔

''میرا نہیں' رب کا شکر ادا کرو۔ مجھے حکم ہوا تو چلا آیا۔'' عبداللہ نے منصور کا ہاتھ تھپتھپایا تھا۔ ''خیرات کرنا اس کے نام پر جو مشکل سے آسانیوں میں لانے والا ہے۔ چلتا ہوں۔''

''مگر یہ سب کیا تھا' وہ کون تھا؟'' منصور نے ذہن میں مچلتے سوالات زبان سے ادا کر دیئے تھے۔

''وہ انسان نہیں' جن تھا' ایک سرکش جن جسے سزا کے طور پر انسانی معذور جسم میں قید کیا گیا تھا۔ بس اب اور کچھ نہ پوچھنا۔ السلامُ علیکم!'' یہ کہہ کر عبداللہ کمرے کا دروازہ کھول کر نکل گیا تھا۔

باہر نکلتے عبداللہ کو دیکھ کر فیض' عظمٰی اور نمرہ تیزی سے اندر آ گئے تھے۔ سب کے چہروں پر سوال تھے جبکہ منصور مسکرا رہا تھا۔ ''خدا کا شکر ہے' سب ٹھیک ہو گیا۔ فیض' تمہارا بھی شکریہ۔'' منصور نے گرم جوشی سے فیض کو گلے لگا لیا تھا۔ ''یہ تمہیں کہاں ملے تھے؟''

''صاحب! میں نماز پڑھ رہا تھا تو یہ میرے ساتھ بیٹھے تھے اور انہوں نے خود ہی مجھ سے بات کر کے یہاں لانے کا کہا تھا۔'' فیض نے حیرانی سے بتایا۔ ''مگر صاحب! ہوا کیا' کیا مہرو بیٹی ٹھیک ہو گئی ہیں؟ وہ فقیر کون تھا؟''

''ہاں منصور! کیا ہوا؟'' نمرہ بھی بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

''وہ فقیر انسان نہیں تھا نمرہ!'' منصور نے پلٹ کر مہرالنساء کو دیکھا۔ ''اس نے ہماری مہرو کو قید کر لیا تھا مگر اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔''

''تو کیا مہرو ٹھیک ہو گئی ہے بھیا؟'' عظمٰی' مہر کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں عظمٰی! یہ بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔'' منصور نے بھی بڑھ کر مہر کو پیار کیا تھا۔

''اللہ! تیرا شکر!'' نمرہ نے بے ساختہ ہاتھ پھیلائے تھے۔ ''میں یہ خوش خبری اماں کو سنا دوں' وہ مستقل جائے نماز پر ہیں۔'' عظمٰی نے موبائل اٹھایا۔

''ہاں' انہیں کہو' ہم اپنی پرانی مہرالنساء کو جلد گھر لے آئیں گے۔'' منصور کے لہجے میں بھرپور سکون اور اطمینان تھا۔



ایم اے خالق بھٹی

نار اور ناری

اچانک درخت میں آگ بھڑک اُٹھی۔ شمو اس آگ کے شعلوں میں سے نمودار ہوئی اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''تم خوش قسمت ہو کہ مجھے چھو نہیں سکے ورنہ جل کر بھسم ہو جاتے، میں تمہاری طرح انسان نہیں بلکہ......

اسرار یت سے جڑا ایک ناری کا عجیب قصہ، وہ سراپا نار تھی

گزشتہ ماہ اپنے ایک عزیز کے بیٹے کے عقیقے میں شریک ہونے کے لیے بہاول پور جانے کا اتفاق ہوا۔ اللہ آباد سے لیاقت پور پہنچ کر میں ایک کوسٹر میں سوار ہوا۔ اس روز رش اتنا زیادہ تھا کہ کوسٹر میں سیٹ نہیں ملی۔ مجھے ہر حالت میں پہنچنا تھا اس لیے سفر کرنا قبول کیا تھا۔ ابھی کھڑے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی نے پیچھے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرا ایک عزیز دوست عمر شبیر جو گوٹھ حیات میں رہتا تھا' ایک سیٹ پر براجمان تھا۔ میں سواریوں میں جگہ بناتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک بزرگ کو جو اس کا ہمسایہ تھا' تھوڑا سا آگے کر کے میرے بیٹھنے کی جگہ بنائی پھر ہم تینوں ٹھنس کر دو والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سفر شروع ہوا تو حال واحوال کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

اچانک ساتھ بیٹھے ہوئے بزرگ نے جنات کے حوالے سے ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ ایک جلسے سے واپس بستی آ رہا تھا۔ جلسہ ایک قریبی بستی میں تھا۔ جب جلسہ ختم ہوا تو رات کافی ہو چکی تھی اور ہم نے جس راستے کا انتخاب کیا' وہ شارٹ کٹ ضرور تھا لیکن عام راستہ نہیں تھا بلکہ مختلف لوگوں کے زرعی رقبے سے گزر کر بستی میں پہنچتا تھا۔ ابھی ہم راستے میں ہی تھے کہ ہم نے دیکھا کہ ایک درخت کو آگ لگی ہوئی ہے اور آگ کے شعلے اتنے بلند تھے جیسے آسمان کو چھو رہے ہوں۔ یہ دیکھ کر میں پریشان ہو گیا کہ اتنی تیز آگ لگی ہوئی ہے کہ آناً فاناً قریبی علاقوں کو اور فصلوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر خاکستر کر دے گی لیکن حیرت اس بات پر تھی کہ آگ کے شعلے اتنے بلند تھے کہ کافی دور تک اس کی روشنی پڑ رہی تھی لیکن پھر بھی قریبی بستی کے لوگ اس آگ کو بجھانے کے لیے موجود نہیں تھے۔



میں اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے چلایا۔ ''یار! اب کیا ہوگا؟''

''کس بات کا......؟'' اس نے پوچھا۔

''دیکھو! ایسی آگ لگ رہی ہے' یہ بہت زیادہ نقصان پہنچائے گی اور ابھی تک اس کو بجھانے کے لیے قریبی مکینوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا ہے۔ لگتا ہے کہ آج بہت بڑا حادثہ ہو کر رہے گا۔'' میرے ساتھی نے مجھے خاموش رہنے کو کہا لیکن میں اس کے اشارے کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

اس نے کہا۔ ''جلدی جلدی چلو تاکہ بستی سے لوگوں کو بلا لائیں اور اس آگ پر قابو پائیں ورنہ یہ آگ اردگرد کی تمام فصلوں' درختوں اور قریبی بستی کو جلا کر راکھ کر دے گی۔''

ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگے۔ خوف سے میرا برا حال تھا۔ میرے قدم اتنے تیز چل رہے تھے کہ میں اپنے ساتھی سے کافی آگے نکل چکا تھا لیکن اس افراتفری میں بھی میں نے محسوس کیا کہ میرا یہ ساتھی آیت الکرسی پڑھتا ہوا آ رہا ہے۔ جب ہم بستی کے قریب پہنچے تو میں نے ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھا تو ششدر رہ گیا کیونکہ نہ آگ تھی اور نہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلے نظر آ رہے تھے۔ میں حیرانگی اور پریشانی کے عالم میں اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔

''ملک صاحب' وہ آگ اور شعلے تو نظر نہیں آ رہے ہیں۔ میرے خیال میں ہم کافی آگے نکل آئے ہیں۔''

میرے ساتھی نے مجھے بازو سے پکڑ کر آگے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''وہ آگ نہیں تھی بلکہ جنات کی کارستانی تھی۔'' جنات کا نام سنتے ہی مجھے

گھبراہٹ سے چکر آنے لگے۔

ملک صاحب نے مجھے تھام لیا اور بلند آواز سے آیت الکرسی اور سورۃ قل ہو اللہ پڑھ کر مجھ پر پھونک مارتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں‘ اب ہم ان کی دسترس سے کافی دور آ گئے ہیں۔ اب یہ جنات ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کئی مرتبہ میرا اس مخلوق سے واسطہ پڑا ہے‘ جب ہم ان کو تنگ نہ کریں تو وہ بھی ہمیں تنگ نہیں کرتے۔ تم بے فکر ہو جاؤ اور ہاں‘ بستی میں ان کا ذکر نہ کرنا‘ خوامخواہ لوگ اس زرعی رقبہ پر فصل کاشت کرنا اور آنا جانا چھوڑ دیں گے اور پھر یہ مخلوق یہاں مستقل اپنا ٹھکانہ بنا لے گی۔“ لیکن ملک صاحب کی ہمت بندھانے اور مجھے میرے گھر چھوڑنے کے باوجود مجھے بخار آ گیا۔ کئی روز تک میں بخار میں مبتلا رہا۔ اس دوران مختلف عاملوں‘ بزرگوں سے دَم بھی کراتا رہا۔ اب ماشاء اللہ‘ ٹھیک ہوں۔ جب میں مکمل صحت یاب ہو گیا تو ایک دن میں نے اُن ہی ملک صاحب جن کا نام ملک عبدالحق تھا‘ سے پوچھا۔

”ملک صاحب! آپ کو کیسے پتہ چلا کہ یہ سب جنات کی کارستانی ہے اور آپ اس واقعہ کے وقت قدرے مطمئن تھے؟“

”اب اس قصے کو رہنے دو۔“ انہوں نے ٹالنے والے انداز میں کہا لیکن میرے تجسس کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ”یہ پچیس برس پہلے کا ذکر ہے‘ جون کا مہینہ تھا‘ گرمی اپنے عروج پر تھی۔ رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر میں اکیلا پل کی طرف چل پڑا۔ میں نے سوچا تھا کہ پل پر کچھ دکانیں ہیں۔ میں کچھ دیر کھلی فضا میں بیٹھ کر اپنے یار محمد اکرم کی کریانہ کی دکان پر گپ شپ لگاؤں گا۔ رات گئے ہوا چل پڑے گی تو واپس گھر آ کر سو جاؤں گا۔ اپنے پروگرام کے مطابق میں اکرم کی دکان پر پہنچا‘ اُس سے سلام دُعا کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس دوران جو بھی دکان پر سودا لینے آتا‘ کچھ دیر کے لیے ہماری بات چیت میں شریک ہو جاتا۔ اس وقت ہماری بستی چند گھرانوں پر مشتمل تھی لہٰذا بستی کے لوگ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے اور ایک دوسرے سے علیک سلیک رکھتے تھے۔ ہمیں باتیں کرتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے گزر گئے پھر ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تو میں گھر کی طرف چل پڑا۔ اکرم اپنی دکان میں سوتا تھا تاکہ رات کو کوئی چور اچکا اس کی دکان میں نقب نہ لگا لے۔ اُن دنوں اکثر بستیوں میں چوکیدار کا بندوبست نہیں ہوتا تھا جس کی وجہ سے دکاندار لازمی اپنی دکان میں سوتے تھے۔ بہرحال میں رات کے اس پہر اکیلا چلتا ہوا بستی کی طرف آ رہا تھا کہ میں نے آگے کچھ فاصلے پر دیکھا‘ کوئی عورت تنہا بستی کی طرف چلی جا رہی ہے۔ میں نے چلنے کی رفتار تیز کر دی تھی کہ قریب پہنچ کر اس سے پوچھوں کہ رات کے اس پہر وہ کہاں سے آ رہی ہے؟ پھر میرے دل میں خیال آیا کہ شاید اسے کسی مدد کی ضرورت ہو کیونکہ بستی کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ بستی کے مردوں سے باتیں بھی کر لیتی تھیں جو کسی کو معیوب نہیں لگتا تھا۔ یہ ریت اور رواج برسوں سے چلا آ رہا تھا۔ میں نے جب اس عورت کے قریب پہنچ کر اسے پکارا تو اس نے پلٹ کر میری طرف اپنا چہرہ کر لیا۔ میں نے اسے بغور دیکھا‘ وہ مجھے اپنی بستی کی نہیں لگی۔ چاند کی چاندنی میں اس کا چہرہ صاف اور واضح نظر آ رہا تھا۔ اس اجنبی عورت سے میں نے پوچھا۔

”کون ہو تم اور رات گئے کدھر سے آ رہی ہو؟“

میرے سوال پر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”میں اپنے گھر سے بھاگ کر آئی ہوں اور کسی پناہ کی تلاش میں ہوں۔“ میں اس کے اتنے قریب پہنچ گیا تھا کہ اب میرے اور اس کے درمیان میں تین فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا‘ وہ عورت نہیں بلکہ بیس‘ بائیس برس کی لڑکی تھی۔

”کیا تمہارا اس بستی میں کوئی عزیز وغیرہ رہتا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”نہیں‘ میں گھر سے بھاگ کر جب بس اڈے پر آئی تو جو بس جانے کی لیے تیار کھڑی تھی‘ اس میں سوار ہو گئی اور یہاں اتر گئی۔ مجھے یہ بستی نظر آئی تو میں ادھر چل پڑی۔“

”تم رہتی کہاں ہو؟“

”خان پور اور میرا نام شمیم ہے۔“ میں نے اس سے گھر سے بھاگنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا۔

”میرا باپ نشہ کرتا ہے‘ کوئی کام نہیں کرتا جس کی وجہ سے پہلے اس نے میری بڑی بہن کو بیچا‘ اب مجھے ایک ادھیڑ عمر آدمی کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہے لیکن میں اپنے ایک کزن سے محبت کرتی ہوں اور اسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن تمہارا کزن تمہارے باپ کو نقد رقم دے کر تمہارے ساتھ شادی کیوں نہیں کرتا؟“

”اس کے والدین میرے باپ کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ شادی کے بعد آئے روز نشہ کرنے کے لیے پیسے مانگنے کے لیے ہمیں تنگ کرے گا۔“

”تو پھر تم اپنے کزن کے ساتھ خفیہ طور پر نکاح کر کے کسی دوسری جگہ چلی جاتیں یا پھر اس کو اپنے ساتھ یہاں لے آتیں؟ اب یہاں اکیلی کیسے رہو گی؟“

”میں نے اپنے کزن کو ایسا کرنے کو کہا تھا لیکن وہ ڈرپوک ہے‘ کہتا ہے‘ تمہارا نشئی باپ ساری زندگی میرے گھر والوں کو تنگ کرتا رہے گا بلکہ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ کچھ عرصہ انتظار کر لوں‘ شاید تمہارا باپ رشتہ کے لیے مان جائے۔“

”پھر تم انتظار کرتیں‘ یوں اکیلی گھر سے بھاگ کر آنا بھی تو جوان لڑکی کے لیے مناسب نہیں‘ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی خوبصورت تھی اور اس کی آواز بھی بہت مسحور کن تھی۔

”آج صبح میرا باپ اس ادھیڑ عمر شخص سے رقم لے کر گھر آیا تھا اور میری ماں کو بتایا کہ کل شموں کا نکاح قائم دین سے کر دیا جائے گا۔ تم اس کو تیار کر دینا۔ میری ماں اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی‘ اس نے کوئی بات کی تو وہ اسے حسبِ سابق مارنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ جب میرا باپ گھر سے باہر چلا گیا تو ماں نے فوری طور پر میرے اس کزن احمد علی کو بلوایا جس سے میں محبت کرتی ہوں۔ احمد علی فوراً ہمارے گھر آیا تو میری ماں نے تمام صورتِ حال سے اسے آگاہ کیا تو اس نے اپنے جواب میں کہا کہ ممانی‘ آپ ایسا کریں‘ کچھ دنوں کے لیے شمو کو دور کے رشتہ داروں کے پاس بھیج دیں۔ میں اس دوران اتنی رقم اکٹھی کر لوں گا کہ ماموں وہ رقم اس شخص کو واپس لوٹا کر میری شادی شمو کے ساتھ کر دیں گے۔ یہ مشورہ میری ماں کو پسند آ گیا۔ اس نے مجھے لیاقت پور میں رہنے والی ایک عزیز کے پاس چلے جانے کو کہا۔ میں اپنی محبت پانے کے لیے اتنی بے چین تھی کہ فوراً بس اڈے پر آئی اور بس میں سوار ہو کر چلی آئی لیکن لیاقت پور اپنے عزیزوں کے ہاں اس لیے نہیں گئی کہ وہاں میرا باپ مجھے ڈھونڈے گا لہٰذا اس بستی کے قریب اتر گئی۔“ اپنی روداد سنا کر وہ خاموش ہو گئی۔

"اب تم یہاں آ گئی ہو تو کہاں رہو گی؟ اگر چاہو تو میرے گھر چلے چلو جہاں میرے ماں باپ اور بہن بھائی رہتے ہیں۔"

"نہیں، میں تمہارے گھر نہیں جا سکتی البتہ اگر تم مجھے آبادی یعنی بستی سے دور کسی ایسے مکان میں رہنے کا بندوبست کر دو جہاں کسی کو بھی میری موجودگی کا پتہ نہ چلے تو میں تمہاری احسان مند رہوں گی۔"

"یہاں تمہارا جاننے والا کوئی نہیں ہے پھر تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟" میں نے الجھن سے پوچھا۔

"جب بستی کی عورتیں اپنے درمیان ایک اجنبی عورت کو دیکھیں گی تو وہ ایک دوسرے سے ذکر کریں گی اور ہوتے ہوتے میری موجودگی کی خبر میرے باپ تک پہنچ سکتی ہے لہٰذا مجھے کسی ایسی جگہ کا بتا دو جس کا تمہارے سوا کسی کو علم نہ ہو۔" اس کی بات سن کر پہلے تو میں پریشان ہوا پھر ایک دم میرے ذہن میں اپنے رقبہ پر بنے ڈیرے کا خیال آیا جو برسوں سے ویران پڑا تھا۔ میں نے اسے اس بارے میں بتایا تو اس نے فوراً وہاں رہنے کی حامی بھر لی پھر ہم بستی سے دوسری طرف جانے والے راستہ پر چل پڑے۔ اس ویران ڈیرے پر جا بجا بھوسے کا ڈھیر تھا اور بیٹھنے کے لیے کوئی کپڑا وغیرہ نہیں تھا جسے بچھایا جا سکے البتہ ایک جاء نماز رکھی تھی۔ میں نے وہ جاء نماز بچھا دی۔

"تم ایسا کرو، یہاں بیٹھ جاؤ، میں گھر سے چارپائی لے کر آتا ہوں۔"

"چارپائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اس مصلے پر سو جاؤں گی۔"

"اچھا، تم بھوکی ہو گی، کچھ کھانے پینے کے لیے لے کر آتا ہوں۔"

"میری ماں نے مجھے روٹی اور سالن باندھ کر دیا تھا جو میں نے بس سے اتر کر راستے میں کھا لیا تھا۔ اب مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔"

جب میں واپس آنے کے لیے دروازے سے باہر نکلنے لگا تو چلتے چلتے اس سے پوچھا۔ "یہاں اکیلے سوتے ہوئے تمہیں خوف تو محسوس نہیں ہو گا؟"

"وہاں گھر میں اپنے نشئی باپ کے ڈر سے اکثر اپنے گھر کی چھت پر یا اس کے چوبارے پر اکیلی سونے کی عادی ہوں۔" پھر میں اس کو اکیلا چھوڑ کر واپس گھر آ گیا اور صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا۔ گھر والے پہلے ہی سو چکے تھے۔ میں لیٹ تو گیا تھا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور چلی گئی تھی۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے اس جوان اور خوبرو لڑکی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ میں نے تو بہت کوشش کی کہ کسی طرح نیند آ جائے لیکن جب خیالات میں صنفِ مخالف کے حسن اور جوانی کی آگ بھڑک رہی ہو تو نیند بھلا کہاں آتی ہے، ایک تنہا لڑکی کا اپنی دسترس میں موجودگی کا احساس دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا جو کسی پل بھی چین لینے نہیں دے رہا تھا۔ جب کافی کوشش کے بعد اس لڑکی کا خمار ذہن سے نہ اتر پایا تو میں یک دم اپنے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس ویران ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ جب ڈیرے کا دروازہ عبور کر کے اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ شمو ابھی تک جاگ رہی تھی اور مصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"میں جانتی ہوں کہ تم مرد ذات ایک جوان لڑکی کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو دیتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی اس مقصد کے لیے آئے ہو۔"

"واقعی تمہارے سراپے اور حسن نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے اور مجھے بے چین کر دیا ہے اور مجھے کسی پل بھی سکون نہیں۔" میری بات سن کر وہ اپنی جگہ سے فوراً کھڑی ہو گئی۔

"میں مرد ذات کی ہوس کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ جب تم اکیلی لڑکی کو دیکھتے ہو، تمہارے ذہن پر ہوس کا جنون سوار ہو جاتا ہے......"

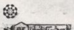
میں اس کی باتوں کی پروا کیے بغیر اس کی جانب بڑھ رہا تھا اور اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ واقعی جب مرد ایک جوان، اکیلی لڑکی کے اتنے نزدیک ہوتا ہے تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے، میرے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آ رہی تھی۔

میں نے جذبات سے مخمور انداز میں شمو سے کہا۔ "تم میری بن جاؤ، میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔"

"نہیں، میری محبت میرا سب کچھ ہے، میں اپنے محبوب کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔" اس نے اٹل لہجے میں کہا لیکن مجھ پر تو اس وقت جنون سوار تھا، میں اس کی طلب میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اسی کیفیت میں اس کا ہاتھ پکڑنے کی غرض سے میں آگے بڑھا تو وہ میری نیت کو بھانپ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں بھی دیوانہ وار اس کے پیچھے لپکا۔ وہ بھاگتے ہوئے ڈیرے سے نکل آئی۔ میں اس کو پکڑنے کے لیے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا پھر وہ بھاگتے بھاگتے یکایک ایک درخت پر چڑھ گئی۔ میں اس درخت کے نیچے پہنچ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن ایک دم درخت کو آگ لگ گئی۔ میں فوراً اس درخت سے دور ہٹ گیا۔ شمو اس آگ کے شعلوں میں سے نمودار ہوئی اور قہقہہ لگاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"تم انسان لالچی، ہوس کے پجاری اور بدکردار ہوتے ہو۔ اکیلی لڑکی کو دیکھ کر اپنے دین و مذہب کو بھی فراموش کر کے درندے بن جاتے ہو اور مجبور لڑکی کی عزت کو پامال کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ تم نے مجھ کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا لیکن تم نہیں جانتے، میں تمہاری طرح انسان نہیں ہوں بلکہ جن زادی ہوں۔ تم خوش قسمت ہو جو مجھے چھو نہیں سکے۔ اگر مجھے چھو لیتے تو جل کر بھسم ہو جاتے۔ جاؤ، میں تمہیں معاف کرتی ہوں لیکن اتنا جان لو، جب بھی رات کو اس درخت کے قریب سے گزرو گے تو اس درخت پر آگ کے شعلے دیکھو گے لیکن تم ڈرنا نہیں، تم کو اس آگ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن اگر اس وقت تمہارے ساتھ کوئی ہو گا تو وہ ضرور ڈر جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں غائب ہو گئی اور پھر ایک دم آگ بھی ٹھنڈی ہو گئی اور درخت پہلے کی طرح ہو گیا۔ اس منظر نے مجھے اس قدر دہشت زدہ کر دیا کہ معلوم نہیں کس طرح میں گھر پہنچا۔ کئی دن تک میں بخار میں جلتا رہا۔ بعد میں گھر والوں نے بتایا کہ تم کو اتنا تیز بخار ہو گیا تھا کہ کئی دن مسلسل علاج اور دَم دُرود کے بعد تمہیں ہوش آیا ہے۔ اب تم اس درخت پر بلند ہوتے شعلوں کا راز جان چکے ہو لیکن جب تم اکیلے اس درخت کے قریب سے گزرو گے تو کوئی آگ وغیرہ نہیں ہو گی لیکن جب بھی میرے ساتھ رات کو اس درخت کے پاس سے گزرو گے تو اس درخت کو اسی طرح آگ میں جلتا ہوا پاؤ گے۔"

ملک صاحب اپنی عجیب کہانی سنا کر خاموش ہو گئے تھے۔ نگران کی آنکھوں سے جھانکتی دہشت سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ہیبت ناک منظر آج بھی ان کے قلب و ذہن پر اسی طرح تر و تازہ ہے اور شاید عمر بھر وہ اس واقعے کو فراموش نہ کر سکیں۔







کاشی چوہان



بلّا یا بلا

زینب کو لحد میں جیسے ہی اُتارنے لگے، سفید بلے نے قبر میں چھلانگ لگا دی۔ بلا قبر میں جاتے ہی غائب ہو گیا تھا، اُسے قبر میں جاتے تو سب نے دیکھا تھا مگر نکلتے......

قوم اجناء سے تعلق رکھنے والے ایک سچے عاشق کا مختصر احوال



''ڈاکٹر صاحب! میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتی حقیقت ہے کہ وہ ہے اور جب......'' زینیا
ن سے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈاکٹر نومیر بول پڑے۔
''اور جب...... جب آپ اسے سوچتی ہیں تو وہ
منے ہوتا ہے۔'' ان کی مسکراہٹ واضح تھی۔
''سوری ڈاکٹر' میں نے یہ کب کہا؟ آپ میری
ری بات سن تو لیں۔''
''پچھلے 80 منٹ سے کیا کر رہا ہوں؟''
''اوہ' پورا پورا حساب رکھتے ہیں اپنے وقت
'' زینیا بھی مسکرا دی۔
''محبت کی ہے کبھی آپ نے؟'' ڈاکٹر نومیر نے
تک سے سوال کیا تو اسے لگا' اس کی نشست کے
ے زمین میں ارتعاش پیدا ہونے لگا ہو۔ ایک دم
ے اسے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے پھوٹتے محسوس
ئے۔ نومیر نے فوراً گھنٹی بجائی اور جن کی طرح
صد آبنوسی دروازے سے برآمد ہوا۔
''پانی کا گلاس بدل دو' ٹھنڈا لے آؤ۔'' قاصد
ے پیشنٹ کے آنے پر جو گلاس پیش کیا تھا' وہ جوں
توں میز پر دھرا تھا۔ وہ خاموشی سے گلاس اٹھا کر
ر چلا گیا اور پھر فوراً ہی ٹھنڈا پانی میز پر رکھ کر چلا
یا۔ آبنوسی دروازہ پھر سے بند تھا مگر شاید زینیا میں
ب بات کرنے کی سکت نہ تھی۔ غٹاغٹ پانی کا پورا
اس حلق میں انڈیل کر اس نے اعصاب بحال
ے ''تو پھر ہم بات شروع کریں؟'' ڈاکٹر نومیر نے
ب پھر سے منقطع سلسلہ جوڑنا چاہا تھا۔
''میں پہلے ہی آپ کے 89 (نواسی) منٹ
لے چکی ہوں۔ اب اگلی میٹنگ پر بات کریں گے۔''
سکراتے ہوئے زینیا نے اجازت طلب کی
ی۔ ڈاکٹر نومیر نے بھی مسکرا کر اسے اگلی دفعہ آنے
ی دعوت دی اور پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک
وسری میں پھنسا کر میز پر ٹکائے بیٹھ گیا۔

''محبت...... ہاں' یہ پوائنٹ بڑا ٹھوس ہے۔ لگتا ہے' محترمہ کے ساتھ محبت کا معاملہ ہے یا ہو سکتا ہے' دل کی توڑ جوڑ...... خیر' جو بھی ہے' کیس ہے یہ پیچیدہ۔'' اور پھر وہ کسی فائل کو کھول کر کیس اسٹڈی کرنے لگا۔

ڈاکٹر نومیر کا شمار شہر کے مشہور سائیکولوجسٹ میں ہوتا تھا۔ بعض لوگوں پر خدا کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ نومیر کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا۔ بہت جلد' بہت نوجوانی میں ہی اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تھا حالانکہ اس فیلڈ میں اس کا تجربہ اتنا نہ تھا مگر ذہن اور اس کی خاص صلاحیت اس کی چھٹی حس نے بڑے بڑے پیچیدہ مسئلوں کو چٹکی بجاتے ہی حل کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خان زوہیب کپاڈیہ نے بھی اپنی اکلوتی بیٹی کی پراسرار خاموشی کے علاج کے لیے ڈاکٹر نومیر ہی کا انتخاب کیا تھا۔ خان زوہیب کپاڈیہ کی بتائی گئی باتوں میں ان کی بیٹی سے مل کر نومیر کو بالکل یقین نہ آیا۔ زینیا کپاڈیہ تو مستقل بولتی رہی تھی' 80 منٹ' کیا بہت نہیں ہوتے؟ کسی باتونی سے بڑھ کر بولنے میں تو اس نے نومیر کو بھی چونکا دیا تھا۔

•......•......•......•

رات کا جانے کون سا پہر تھا' ہواؤں کی شائیں شائیں نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ درختوں پر لگے پتے جھر جھرا رہے تھے۔ فضا میں اچانک سے گھنگھروؤں کی آواز اس ماحول کو تھوڑی دیر کے لیے مزید پراسرار کرتی اور پھر ماحول کی پراسرار گمبھیرتا رات کے سینے میں اپنے پنجے گاڑ دیتی۔ کچھ ہی دیر پہلے کی تو بات تھی' فضا میں دو محبت کرنے والوں کی سانسوں کے جلترنگ بج رہے تھے۔ پورے چاند کی رات تھی اور اس رات میں تو دیوانے دل مدہوش ہو ہی جایا کرتے ہیں۔

''میرے پیر چھوڑ دو پلیز......'' اس نے کالی ناگن سی زلفیں جو کہ بدمست ہوا سے اِدھر اُدھر بکھر کر

چاند چہرے کو ڈھانپ چکی تھیں' چہرے سے ہٹا کر کہا۔

''کیوں مجھے گناہ گار کرتے ہو؟'' مگر جیسے وہ تو کچھ سن ہی نہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم آنسو آ گئے۔ انسان چاہ کر بھی جب کچھ نہ کر پائے تو بے بسی سے بڑا دکھ کوئی نہیں ہوتا۔ اس سمے وہ بھی اسی کیفیت سے دوچار تھی۔ کھڑکی سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی سے صاف ظاہر تھا' بادلوں کے رتھ پر سوار پورا چاند مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو راستہ بنا رہے تھے۔ چہرے پر پھیلتی اَن گنت نمکین لکیریں سوکھتی ابھرتی جال سا پھیلا چکی تھیں مگر وہ بے بسی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی قدرت سے شکوہ کناں تھی۔

اچانک کھڑکی کا پٹ بڑی زور سے دھڑ دھڑایا جیسے یکلخت آندھی نے پوری طاقت سے اس منظر کے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہو۔ اس نے دھڑ دھڑ کرتے دل سے اسے خود سے جدا کیا اور آن کی آن میں منظر تبدیل ہو گیا' بس وہ تھی اور کمرے میں کوکتا سناٹا۔ وہ بستر پر پڑی بری طرح ہانپ رہی تھی جیسے کہیں سے بہت تیزی سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہو۔ اس کیفیت نے اسے ادھ موئی ہی تو کر دیا تھا جیسے اور پھر آنسوؤں نے رات کے سینے میں رین بسیرا کر لیا۔ اس کا تکیہ بھیگتا چلا جا رہا تھا۔

•......•......•......•

''ہیلو بیٹا' ہاؤ آر یو سویٹی؟''

''فائن ڈیڈ......!''

''اور بتاؤ' کیا چل رہا ہے؟''

''نتھنگ ڈیڈ' آپ سنائیں۔''

خان زوہیب کپاڈیہ اسے ایک عرصے بعد اس طرح باتیں کرتا دیکھ کر حیران ہوئے بنا نہ رہ سکے تھے یعنی ڈاکٹر نومیر کا جادو چل ہی گیا' وہ اپنی دانست میں سوچتے' ناشتہ کرنے لگے۔ ''میری بیٹی خوش ہے اور بس کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ اسی طرح بولتی رہا کر... خاموش ہوتی ہو تو عجیب سا فیل ہوتا ہے مجھے... میں تمہیں خوش نہیں رکھ پا رہا ہوں۔''

''اوہ' کم آن ڈیڈ...... آئندہ شکایت نہیں... آپ کو۔'' زینیا اتنا کہہ کر سنجیدگی سے ناشتے... انصاف کرنے لگی۔

''اوکے سویٹی' Have a good day.''

زوہیب کپاڈیہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے صو... رکھا کوٹ اٹھا کر پہنا اور بریف کیس اٹھا کر زینیا... پاس آ گئے۔

''اوکے بیٹا' ٹیک کیئر۔'' وہ اس کے سر پر... پھیرتے کار پورچ میں جانے کے لیے نکلے۔ ز... ان کے پیچھے تھی' وہ باپ کو دفتر روانہ ہونے تک کے ساتھ رہی اور پھر جونہی کمرے میں داخل ہو... تو مسکرا کر رہ گئی۔ وہ اس سے پہلے اس کی کرسی... براجمان تھا۔ وہ اداس صورت لیے اس کے پیر دل... لپٹ کر رونے لگا۔ زینب کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور... فوراً اسے گود میں لیے کار میں آ گئی۔

•......•......•......•

''آیئے محترمہ' آپ بتایئے' کیا حال ہیں؟''... نومیر نے زینیا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔... نے گلاسز اتارے تو نومیر کو حیرت کا دھچکہ لگا۔

''کیا بات ہی ایک تو آپ آئی ہیں پورے دو... بعد اور آپ کی سوجی ہوئی آنکھیں...... کیا بات... بتایئے؟'' اسے اس کومل سی لڑکی سے عجیب سی انسیت محسوس ہوئی تھی۔ ایک بے نام سا جذبہ... دیکھتے ہی بیدار ہوتا تھا جسے وہ اپنا خام خیال جانتا تھا۔

''وہ......''

''جی بولیے' کچھ بھی اندر دل میں نہ رکھیں بول دیں۔''

''وہ...... رانی کے پاس چلا گیا ہے' رانی ا... آنے نہیں دے رہی۔ وہ میرا ہے' بس میرا۔

...یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور نومیر اس کے ...ربط جملوں کا ربط جوڑنے لگا۔ اس کی سمجھ میں یہ ...واڑ کی آ کے نہ دے رہی تھی۔ وہ کچھ دیر اس کے ...بیٹھی رہی اور پھر بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر ...ئی۔ نومیر اسے روکتا ہی رہ گیا مگر وہ نہ رکی۔

•......•......•......•

...پورن ماشی کا چاند پورے آب و تاب سے ...رہا تھا۔ قدیم جنگل میں جوگی گورکھ کی استھان ...ی رونق تھی۔ اس کے دو چار بھگت بڑی شان ...اگنی پوجا میں مصروف تھے۔ گورکھ ایک مٹی کی ...ی میں الو کی آنکھیں اور پر رکھ کر' السی کے پتے ...کر بیٹھا تھا اور قریب ہی اس کا بھگت شورے ...ک کے سینے کی سوکھی ہڈی پیس کر سفوف بنا رہا ...اور آخر میں سور کی ناک جو کہ بڑی مشکل سے ...صل کی گئی تھی' اس ہانڈی میں ڈالنا تھی۔ سارا ...مان مکمل تھا۔ گورکھ نے شورے کو آواز دی۔

''بالک اسی سپھو پھ ارپن کر دے با۔ سمے بیتے ...ئے ہے۔ چاند کے گپھا سے نکلنے کے بعد ہمارے ...ش میں کیول آدھا گھنٹہ رہ جاوے گا' جلدی کر پتر......''

''مہاراج' بس آ کھری جھنکا دیو ہوں۔''

...اور پھر شورے جلدی سے اونٹ کی ہڈی کا ...فوف لے آیا جسے گورکھ نے جاپ پڑھتے ہوئے ...ی ہانڈی میں پھرایا اور پھیلا دیا اور پھر اس نے الو ...خون ہانڈی کے کناروں پر پھیلا دیا اور پھر سور کی ...ک بیچ میں رکھی اور سیہ کا کانٹا اس ناک میں بھونک ...کر اوپر سے نشاستہ بھر کر ہانڈی کے ڈھکن کو درخت ...ی قدیم گوند سے جوڑ کر ہانڈی پیک کر دی۔

''اے کالی ماتا...... اب ای سارا تمہارے ...اسطے اے' او کنیا کے پاس ہمارا ابا گڑ بلا دل لگا بیٹھا ...ہے۔ او کالی ماتا' ہم کا واپس او ہمارا ابا گڑ بلا دلائی دیو ...اور اس کنیا کو رام رام ستے کر دیو۔'' اور پھر بھگت اور

غزل

تیری پلکوں پہ خواب اُترے ہیں
مجھ پہ تازہ عذاب اُترے ہیں

تم جو آؤ تو ایسا لگتا ہے!
میرے گھر ماہتاب اُترے ہیں

تجھ سے بچھڑے تو دل کے صحرا میں
کیسے کیسے سراب اُترے ہیں

ہاں سبھی سے ہمارا رشتہ ہے
جتنے اہلِ کتاب اُترے ہیں

پھر ہوئی دیکھ دربدر خوشبو
شاخ سے پھر گلاب اُترے ہیں

میرا تو اس زمیں سے رشتہ ہے
آسماں سے جناب اُترے ہیں

ہم اسیرانِ عشق پر محسنؔ
چاہتوں کے نصاب اُترے ہیں



محسن سلیم

سوامی مل کر جاپ پڑھتے آگ کے اوپر ہانڈی ٹانگے رقص کرنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہانڈی اڑنے لگی۔

•......•......•......•

"ابھی کل ہی تو زینیا میرے پاس آئی تھی۔"

ڈاکٹر نومیر کسی طرح یقین کرنے پر تیار نہ تھا مگر اخبار کی خبر تھی' نہ کرنے میں گنجائش ہی کہاں تھی۔

"معروف صنعت کار خان زوہیب کپاڈیہ کی بیٹی زینیا کپاڈیہ گھر میں مردہ حالت میں پائی گئی۔"

ڈاکٹر نومیر فوراً اپنی حیرت کی گٹھری اٹھائے خان زوہیب کے گھر چل پڑا۔

•......•......•......•

جنگل میں آگ کی طرح یہ خبر پورے شہر کا احاطہ کر چکی تھی۔ نومیر' خان صاحب کے گھر پہنچا تو فوراً اس نے خان صاحب سے زینیا کے کمرے میں جانے کی درخواست کی۔ خان صاحب کی حالت ٹھیک نہ تھی مگر انہوں نے ملازمین سے ڈاکٹر صاحب کی معاونت کی درخواست کی۔

زینیا کے کمرے میں کوئی بے ترتیبی نہ تھی' سب کچھ نک سک سے پڑا تھا۔ اچانک نومیر کی نظر کمرے کی کھلی کھڑکی پر پڑی۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا' ایک ٹوٹی ہوئی ہانڈی کے علاوہ اسے لان میں کچھ نظر نہ آیا تھا۔

•......•......•......•

جنازہ تیار تھا مگر...... ڈولی کے پائے سے ایک بلا چپٹا تھا جو بری طرح دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ وہ سفید' نیلی آنکھوں والا مقناطیسی کشش رکھنے والا بلا...... بڑی مشکل سے اسے وہاں سے ہٹایا گیا۔

قبرستان میں قبر تیار ہوئی اور زینیا کو لحد میں جیسے ہی اتارنے لگے' سفید بلے نے قبر میں چھلانگ لگا دی۔ سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا' سب نے ہی کوشش کی کہ بلا قبر سے نکل جائے لیکن بلا جاتے ہی غائب ہو چکا تھا۔ اپنا سا اطمینان کے بعد زینیا کو قبر میں اتار دیا گیا مگر بلا...... ہی غائب ہوا تھا اور اسے قبر میں جاتے دیکھا تھا مگر نکلتے......؟؟

•......•......•......•

ڈاکٹر نومیر کا کہنا ہے کہ زینیا کی موت وہ کئی بار خان صاحب کے گھر گیا۔ اس نے لا پڑی ہانڈی اٹھوا کر سمندر میں پھنکوا دی تھی۔ سے عجیب بساند پھوٹ رہی تھی جسے وہ آج بھی نتھنوں میں محسوس کرتا ہے تو اس کا جی مالش لگتا ہے مگر ایک عجیب اتفاق ہے' زینیا کے کمر لان میں اس جگہ جہاں ہانڈی ٹوٹی پڑی تھی سفید بلا نیلی نیلی مقناطیسی آنکھوں والا ہمیشہ دیکھا گیا ہے۔ وہ کب آتا ہے' کب جاتا ہے نہیں جانتا مگر پورن ماشی کی رات کو قبرستان بیٹھ کر پوری رات اس کے رونے کی گواہی خود اور ارد گرد کے لوگ دیتے ہیں۔

دور' کہیں بہت دور' گورکھ سوامی کا بھی رات دیہانت ہو گیا تھا جس شب زینیا کی موت کی بھیجی ہانڈی کے زیر اثر واقع ہوئی تھی اور وہ سفید' نیلی نیلی مقناطیسی آنکھوں والا بلا پایا گیا بلا ہے یا بلا' یہ راز' راز تو نہیں مگر یہ طے ہے سے عشق اس بلے نے ہی کیا تھا اور وہ بلا' گور قید سے آزاد ہونے والا ایک بہت بڑا جن تھا محبوبہ کی تلاش میں بلا بن کر گھوم رہا تھا اور گور اسے جن سے بلا بنا دیا تھا۔

ڈاکٹر نومیر کو یہ راز ایک پہنچے ہوئے اس بز نے بتایا جو کہ اچانک سے ایک دن اس کے کلی میں آیا اور اس کے ذہن میں اٹھتے تشنہ سوالات قید سے اسے آزاد کر گیا تھا۔



وفا صدام حسین غازی



نورانی چہرہ بزرگ

مجھ پر سکتے کی سی کیفیت تھی۔ بس میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور کان سُن رہے تھے، باقی سارا جسم سُن ہو گیا تھا۔ دو نادیدہ بازوؤں نے مجھے کسی چیز سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر......

ایک دیہاتی کے ساتھ پیش آنے والے غیر معمولی حالات کی عجیب کہانی

یہ واقعہ میرے گاؤں کے ایک شخص کے ساتھ ش آیا۔ سارے گاؤں میں یہ واقعہ مشہور ہو گیا تھا۔ ج اس واقعے کو چالیس سال سے زیادہ گزر چکے یں وہ شخص بھی اب اس دنیا سے گزر چکا ہے۔

•......•......•......•

ڈھلتا ہوا سورج آہستہ آہستہ غروب ہو چکا تھا۔ پہلے ملگجا اندھیرا ہوا اور پھر غیر محسوس طور پر تاریکی کی چادر دبیز ہوتی چلی گئی۔ بس تیزی سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے بس میں لائٹیں جلا دی گئی تھیں۔ گاڑی میں آہستہ



آواز میں سندھی گیت چل رہے تھے جس کی وجہ سے میرے سر میں ہلکا ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ مجھے بس کے سفر سے الرجی ہے، بس میں میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے، چکر آتے ہیں، قے ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ بس کی چھت پر جا کر بیٹھ جاؤں کیونکہ اندرونِ سندھ کی گاڑیوں میں لوگ چھتوں پر بھی سفر کرتے ہیں لیکن سردی بہت زیادہ تھی اس لیے میں نے اپنے خیال کو خود ہی رد کر دیا۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا، کھڑکی کے باہر جو درخت نظر آ رہے تھے، وہ اندھیرے میں گم ہو گئے تھے۔ تمام مسافر پریشان تھے کیونکہ بس اپنے مقررہ وقت سے بہت لیٹ ہو گئی تھی۔ دادو اور میہڑ کے درمیان بس خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے یہ دیر ہوئی تھی۔ میں حیدر آباد سے شہداد کوٹ اپنے گاؤں جا رہا تھا، میرا گاؤں شہداد کوٹ سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا اور اس بس کا آخری اسٹاپ شہداد کوٹ تھا۔ میرا گاؤں اس سے پہلے تھا لیکن میری پریشانی کا سبب یہ تھا کہ بس مجھے مین روڈ پر اتارے گی جبکہ میرا گاؤں مین روڈ سے بہت دور تھا۔ اگر زیادہ دیر ہو گئی تو گاؤں تک کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔ مغرب کے وقت گاؤں کے لوگ اپنے گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔ اندھیرا ہوتے ہی گاؤں میں چور ڈاکوؤں کا راج ہوتا تھا۔ مجھے اسی بات کا خوف تھا کہ اگر بس دیر سے پہنچی اور کوئی سواری نہ ملی تو مجھے پیدل ہی گاؤں کی طرف جانا پڑے گا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ عشاء کا وقت ہونے والا تھا لیکن اب تک میری منزل نہیں آئی تھی۔ اب میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اور میں پریشانی کے عالم میں اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا۔

آخر خدا خدا کر کے، میرا اسٹاپ آیا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی جب میں بس سے اترا تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اس وقت اسٹاپ [illegible] دکانیں بند تھیں، ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ [illegible] بندے کی ذات...... وہاں لگے اکلوتے [illegible] اسٹریٹ لائٹ جل رہی تھی جس کی دھیمی [illegible] کچھ فاصلے پر مجھے دو کتے نظر آئے جو آپس [illegible] رہے تھے۔ وہ اپنی لڑائی میں اس قدر منہمک [illegible] مجھ پر توجہ نہیں دی۔ میں کچھ دیر تک اسٹاپ [illegible] بیچ کی حالت میں کھڑا رہا۔ میں فیصلہ نہیں [illegible] تھا کہ گاؤں جانے کے لیے کس راستے کا [illegible] کروں؟ اگر میں روڈ سے جاتا تو ڈاکوؤں [illegible] ہاتھوں لٹنے کا خطرہ تھا اور راستہ بھی طویل [illegible] کھیتوں سے گزر کر جانے سے بھی محفوظ [illegible] جلدی بھی پہنچ جاتا۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ [illegible] سے گھر پہنچا تھا بلکہ اس سے پہلے بھی مجھے [illegible] ہوئی تھی مگر آج نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا [illegible] کچھ سوچنے کے بعد میں نے کھیتوں میں [illegible] گزرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے قدم آہستہ آہستہ [illegible] جانب اٹھ گئے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ [illegible] سنبھل کے چلنا پڑ رہا تھا۔ بہت احتیاط سے [illegible] جانب بڑھ رہا تھا کہ کہیں ٹھوکر وغیرہ نہ لگ [illegible] کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے ایک اور [illegible] تھا کہ کوئی زہریلا جانور سانپ، بچھو کاٹ [illegible] میں ابھی کچھ ہی آگے گیا تھا کہ اچانک میرا پاؤں [illegible] چیز میں الجھا اور میں دھڑام سے گر پڑا۔ مجھے [illegible] تھا جیسے میرا پاؤں کسی سوئے ہوئے شخص پر [illegible] اسے کچلنے سے بچانے کے لیے میں نے اپنا [illegible] اٹھانا چاہا اور توازن برقرار نہ رہنے کی وجہ سے [illegible] رہ سکا اور زمیں بوس ہو گیا۔ میں پھرتی [illegible] اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس [illegible] دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جس پر میں نے پاؤں [illegible] دیا تھا مگر حیرت انگیز طور پر وہاں کوئی نہیں تھا۔ [illegible]

کر میں گھبرا گیا، یقیناً وہ میرا وہم نہیں تھا بلکہ حقیقت میں کسی سوتے ہوئے شخص سے میں ٹکرایا تھا مگر اچھی طرح دیکھنے پر کوئی نہیں تھا۔ یہ صورت حال میرے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی تھی۔ میرے اٹھتے قدموں میں تیزی آ گئی۔ ابھی مجھے چلتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ 'چھن...... چھن...... چھنا چھن......' کی مخصوص آواز پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پائل کی یہ جھنکار مجھے بالکل اپنے قریب سنائی دے رہی تھی۔ اس آواز نے میرے رہے سہے حوصلے بھی ختم کر دیئے اور میں بدحواسی میں ناک کی سیدھ میں دوڑ پڑا۔ میں بہت تیزی سے دوڑ رہا تھا مگر چھن چھن کی آواز مسلسل آ رہی تھی، یوں لگ رہا تھا، وہ پائل والی بھی میرے ساتھ ہی دوڑ رہی ہو۔ کڑکتی سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا اور ساتھ میرے جسم پر لرزہ بھی طاری تھا۔ بھاگتے بھاگتے میں اتنا بدحواس ہو گیا کہ مجھے پتا ہی نہیں تھا میں کہاں ہوں اور کس سمت بھاگا جا رہا ہوں؟ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل لڑھک گیا، یوں گرنے سے میرے ہاتھ، پیروں میں شدید چوٹیں آئی تھیں جن میں ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر میں اس درد کو برداشت کرتے ہوئے دوبارہ اٹھا اور چاروں طرف ایک نگاہ ڈالی۔ گرتے وقت مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں کسی انسانی وجود سے ٹکرایا ہوں مگر دور دور تک میرے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میرے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا، تاہم اتنا ضرور ہوا تھا کہ پائل کی چھن چھن کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ میں نے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی مگر اب میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے چنانچہ بمشکل قدم اٹھاتا ہوا میں آگے کی جانب بڑھنے لگا۔ جب میرے حواس قدرے بحال ہوئے تو ایک اور حیرت انگیز انکشاف نے مجھے

ایس ایم ایس

زندگی میں کچھ چیزیں آپ کی سانسوں کی ڈور سے بندھی ہیں جو آپ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتیں:۔

(1) وقت
(2) دل کی دھڑکن
(3) آپ کا سایہ
(4) نصیب

اور میں اور میری دعائیں!

رضوانہ کوثر۔ لاہور

ششدر کر دیا کہ مجھے چلتے چلتے خاصی دیر ہو گئی تھی مگر میرا سفر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو مجھ پر عقدہ کھلا کہ میں وہیں کھڑا ہوں جہاں ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔ میری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں کسی پراسرار مخلوق کے چنگل میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے گاؤں کے اکثر افراد کے ساتھ پیش آنے والے پراسرار واقعات یاد آ گئے، میں ان پر یقین نہیں کرتا تھا مگر آج میرے ساتھ یہ سب کچھ پیش آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں بس یہی خیال تھا کہ جان بچ جائے پھر کبھی اس راستے سے نہیں گزروں گا۔ میں ان سوچوں میں گم تھا کہ اچانک زور زور سے ہنسنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے چونک کر نظریں گھمائیں تو میرے چاروں طرف لوگ کھڑے تھے۔

وہ سب عجیب و غریب شکل و شباہت کے تھے۔ ان کے رنگ سیاہ تھے اور قد بہت لمبے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسلسل ہنس رہے تھے، انہیں دیکھ کر میں جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا دم نکل رہا ہو اور پھر اگلے ہی لمحے میں گر پڑا لیکن میں بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ ان کی آوازیں بخوبی سن رہا تھا۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ ''اس کو اٹھاؤ اور ساتھ لے چلو۔'' آخری جملہ تھا جو بے ہوش ہونے سے پہلے میری سماعت سے ٹکرایا تھا پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ آنکھ کھلی تو میرے لیے ایک اور حیرت کا جھٹکا تھا۔ میں ایک گھنے پیڑ کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے بھی جکڑ دیا گیا تھا تاکہ میں کوئی آواز نہ نکال سکوں۔ اردگرد گھٹاٹوپ اندھیرا تھا۔ یہ سب دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ بس میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ یہ مخلوق مجھے کچا کھا جائے گی۔ موت کے خوف سے میری دھڑکنیں اتنی تیز ہوگئی تھیں جیسے میرا دل سینہ چیر کر باہر نکل پڑے گا۔ اچانک ہنسی کی آواز پھر گونجنے لگی۔ میں مرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ بچنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ ہنسی کی آواز بتدریج تیز ہوتی جارہی تھی پھر کسی غیر مرئی ہاتھ نے میری رسی کو کھولا اور دو بازو مجھے اٹھا کر فضا میں اڑنے لگے۔ وہ جانے مجھے کہاں لے جارہے تھے؟ میں خوف سے سہما ہوا تھا۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں خود کو باور کرا رہا تھا کہ موت تو ایک دن آنی ہی ہے' سو اب سہی۔ کتنی دیر فضا میں پرواز کرنے کے بعد پتا نہیں انہوں نے مجھے نیچے اتارا۔ وہ عجب سنسان سی جگہ تھی' بہت بڑا کھلا میدان تھا جہاں ہلکی پھلکی روشنی پھیلی تھی جو ماحول کی ہیبت ناکی میں اضافہ کررہی تھی۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت تھی۔ نہ میرے منہ سے کوئی آواز نکل رہی تھی اور نہ ہی میرے جسم میں جان تھی' بس میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور کان سن رہے تھے' باقی سارا جسم سن ہوگیا تھا۔ ان دو نادیدہ بازوؤں نے مجھے کسی چیز کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا پھر عجیب قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں وہاں چھوٹے قد کی عجیب وغریب مخلوق جمع ہونے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ آتے گئے۔ پتا نہیں وہ کہاں سے آرہے تھے؟ بس آتے ہی جارہے تھے۔ ان کی تعداد اتنی ہوگئی کہ وہ سارا میدان بھر گیا۔ وہ سارے کے سارے غصے کے عالم میں چلا رہے تھے' ان کی آوازوں سے اس میدان میں شور برپا ہوگیا تھا۔ چلاتے ہوئے وہ عجیب غیر مانوس سی زبان میں بات کررہے تھے۔ مجھے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ اچانک وہ سب کے سب خاموش ہوگئے اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اسی وقت میدان میں ایک طرف روشنی کی لکیر پھوٹی اور پھر وہ روشنی پھیلتی چلی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس روشنی میں سے ایک نورانی چہرے والے بزرگ نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح' سر پر عمامہ اور چہرے پہ سفید براق داڑھی تھی۔ ان کا چہرہ گویا نور کا منبع تھا۔ میدان کے ایک جانب کرسی رکھی ہوئی تھی۔ وہ بزرگ بہت وقار سے چلتے ہوئے اس کرسی پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے ایک بھرپور نظر ڈالی اور نرم آواز میں کہا۔ ''مقدمہ شروع کیا جائے۔''

اس نرم مگر بارعب حکم پر دو شخص اس مجمع میں سے نکلے اور ان نورانی چہرے والے بزرگ کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔

ایک نے چلا کر کہا۔ ''سرکار! اس نے میرے گھر پر قبضہ کرلیا ہے' وہ جگہ میری تھی' میں اپنے رشتے داروں کے یہاں گیا ہوا تھا۔ میری غیر موجودگی میں اس نے قبضہ کرلیا۔''

دوسرے نے بھی چلا کر کہا۔ ''نہیں سرکار! وہ جگہ پہلے میری تھی جس پر یہ قابض ہوگیا تھا' سو میں نے اپنی جگہ اس سے واپس لے لی ہے۔''

''نہیں...... جگہ میری ہے سرکار' یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' پہلے والا اپنی بات پر مصر تھا۔

''نہیں سرکار! جھوٹ تو یہ بول رہا ہے۔'' دوسرا بھی بضد تھا پھر وہ دونوں آپس میں الجھ پڑے۔

بزرگ نے کڑک دار لہجے میں کہا۔ ''خاموش ہوجاؤ...... آپس میں لڑتے ہو' شرم نہیں آتی؟ مجھے معلوم ہے' وہ جگہ کس کی ہے' اس جگہ کا مالک تو ہے۔'' بزرگ نے دوسرے شخص کی طرف اشارہ کرتے کہا۔

بزرگ کا فیصلہ سن کر وہ دونوں خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ان کے بعد دو اور افراد کا تنازعہ پیش کیا گیا' ان کا بھی فیصلہ ہوگیا۔ خاصی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اچانک ان نورانی چہرے والے بزرگ کی نظر مجھ پر پڑی۔

''اس انسان کو یہاں کون لایا ہے؟'' انہوں نے بارعب انداز میں پوچھا۔ اس سوال پر آٹھ دس افراد مجمعے میں سے باہر نکل کر کھڑے ہوگئے۔

''کیوں لائے ہو؟'' بزرگ نے شعلہ برساتی نگاہوں سے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

''سرکار! یہ انسان ہمارے علاقے سے اس وقت گزر رہا تھا جب ہمارا وقت ہوتا ہے۔ اس مخصوص وقت میں ان انسانوں کا آنا ممنوع ہوتا ہے۔''

بزرگ نے ڈپٹنے کے انداز میں کہا۔ ''یہ زمین اللہ کی ہے۔ اور انسان اللہ کو بہت ہی پیارا ہے۔ تم کون ہوتے ہو ان کو روکنے والے؟ انسان کی ہی وجہ سے تمہیں رزق ملتا ہے' ان کی وجہ سے ہی یہ زمین بنی ہے' انہی کی وجہ سے یہ تمام نعمتیں ملی ہیں تو فوراً اس انسان کو وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے اس کو لے کر آئے ہو۔''

''لیکن سرکار! یہ ہمارے ایک ساتھی کو کچلتا ہوا گزرا تھا؟'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''ہاں سرکار! ہم سوئے پڑے تھے' اس نے ہماری نیند خراب کردی۔'' ایک اور نے شکوہ کیا۔

''تمہیں کس نے کہا تھا کہ بیچ رستے پہ سوتے

تم میرے بھلا کیا لگتے ہو!

☆☆☆

میرے مَن آنگن میں بستے ہو
تم میرے بھلا کیا لگتے ہو!
ہر خواب میں تم سے پوچھوں میں
تو اک مسکان سجائے بس
کیوں مجھ کو تکنے لگتے ہو
تم میرے بھلا کیا لگتے ہو!
میں رات کے تاروں سے پوچھوں
یا جھلمل پانی بوندوں سے
تتلی سے یا برساتوں سے
بتلا دو بس یہ آج مجھے
تم میرے بھلا کیا لگتے ہو!

☆☆☆

شازلی سعید مغل

رہو اور یہ بے چارہ تو تمہیں دیکھ بھی نہیں سکتا؟ اب یہ میرا حکم ہے اُسے چھوڑ دو۔"

"لیکن سرکار......!" ایک نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں، میں جانتا ہوں، تم جھوٹ بول رہے ہو، رات کو کیسے سوتے ہو تم جبکہ میں جانتا ہوں ہم رات کو نہیں سوتے، رات ہی تو ہمارے لیے دن ہے۔ اب جلدی جاؤ اور اس بے چارے کو وہیں چھوڑ کر آؤ۔" بزرگ نے گویا حکم دے کر بات ختم کردی۔

"جی سرکار......!" ان سب نے اطاعت میں سر جھکا لیے۔

پھر دو نادیدہ ہاتھوں نے مجھے اٹھایا اور میں فضا میں بلند ہونے لگا۔ میں پرواز کر رہا تھا لیکن مجھے اپنے آس پاس کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں مر چکا ہوں اور میری روح کو اڑا کر لے جایا جا رہا ہے پھر کچھ ہی دیر میں مجھے وہیں اتار دیا گیا جہاں سے لے جایا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے کچی نرم مٹی پر پھینک دیا۔ مجھے ہلکی چوٹ لگی تو جیسے ہوش آیا۔ میں فوراً اٹھا۔ میرا جسم بہت ہی بھاری ہو گیا تھا اور میرا روم روم کانپ رہا تھا اور میرے جسم سے پسینہ ایسے بہہ رہا تھا جیسے میں نہا کر آیا ہوں۔ میں بڑی مشکل سے گرتا پڑتا وہاں سے ایسا بھاگا کہ کچھ ہوش نہیں رہا کہ کب گاؤں پہنچا۔ میں گھر میں داخل ہو کے سیدھا کمرے میں چارپائی پہ گر گیا۔ مجھے شدید سردی لگ رہی تھی۔ میں نے اماں کو کہا کہ مجھ پر کمبل ڈال دو، بڑی سردی لگ رہی ہے۔ اماں نے بہت پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ لیکن مجھ سے کچھ نہیں بولا جا رہا تھا۔ اماں جہاں دیدہ خاتون تھیں، شاید سب کچھ بنا بتائے ہی سمجھ گئیں۔ اماں نے مجھ پر دو تین لحاف ڈال دیئے۔ وہ ساری رات میں نے کانپتے ہوئے گزار دی۔ صبح تک مجھے بہت تیز بخار چڑھ چکا تھا۔ بابا گاؤں کے واحد ڈاکٹر صاحب لائے، اس نے دوا دی جسے کھا کر شام تک طبیعت میں کچھ بہتری آئی۔ دو دن بعد جب بالکل ٹھیک ہو گیا تو گھر والوں کو اس رات کا تمام ماجرا کہہ سنایا۔ اماں، بابا شکر کرنے لگے کہ اللہ نے مجھے بچا لیا تھا۔

مگر یہ پراسرار قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا تب لگا جب ایک روز میں میرو خان نامی گاؤں گیا۔ وہاں کی مسجد میں جب میں نماز پڑھنے کے لیے گیا تو ان ہی نورانی چہرے والے بزرگ کو نماز پڑھتے دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی بزرگ ہیں۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے سلام کیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا پھر میں کچھ کہہ نہیں سکا، بس انہیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ انہوں نے بڑی شفقت سے مجھے قریب بلایا اور اپنے پاس بٹھایا۔

"بیٹا، حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرا کام تھا۔"

"آپ کا نام کیا ہے حضرت؟" میں نے بمشکل پوچھا۔

"بیٹا، پہلے تم نماز پڑھ لو پھر بتاتا ہوں ساری بات۔" میں نے ان کے کہنے پر عمل کیا اور فوراً نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ سلام پھیر کر دیکھا تو بزرگ موجود نہیں تھے۔ میں نے انہیں مسجد کے اندر، باہر ہر جگہ تلاش کیا مگر ان کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہاں لوگوں سے پوچھا تو ہر ایک نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔ اس بات کا افسوس مجھے ہمیشہ رہا کہ کاش میں نماز پڑھنے سے پہلے ان کا نام پوچھ لیتا اور ان سے اپنی کوئی دیرینہ خواہش پوری کروا لیتا کیونکہ وہ بزرگ قومِ اجناء میں سے تھے۔

❀



محمد عزیز

جنوں والا چوبارہ

ان کی بیٹی کے لیے جنات سے رشتے آئے، یہ بات بعید از امکان تھی مگر ایسا ہو گیا تھا، سو گھر والوں پر وہی اثر ہوا، جو پہلے بیٹی پر ہوا تھا

شہر حیدر آباد سے، جنوں سے جڑی چشم کشا رودادِ عجب

حیدر آباد کی بمبئی بیکری سے میرا تعلق جڑے ایک عمر گزر گئی ہے۔ اس بیکری پر زمانے بھر کی معروف شخصیات کی آمد ہوتی رہی ہے اور میں اُن سے اپنے تعلقات پر فخر کے ساتھ اللہ کا شکر بھی کرتا ہوں۔ جنات کے حوالے سے مجھے یہ کہانی لاہور سے آنے والے ایک صحافی دوست نے سنائی تھی جو میں اُن ہی کے الفاظ میں آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

شہر لاہور کے ایک محلے میں ایک گھر "جنوں والے چوبارے" کے نام سے مشہور ہے۔ مجھے یہ جاننے کا تجسس تھا کہ اس گھر میں واقعی جنات رہتے



ہیں یا پھر اس کے خالی ہونے کی وجہ سے یہ بات مشہور ہوگئی ہے۔ تحقیق کی تو پتا چلا کہ نہ تو اس گھر میں جنات رہتے ہیں اور نہ ہی اس کے خالی ہونے کی وجہ سے یہ بات مشہور ہوئی ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہاں جنات کا آنا جانا تھا جس کی وجہ سے یہ گھر ''جنوں والے چوبارے'' کے نام سے مشہور ہوگیا ہے اور آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ اگر انسانوں کو اس بات کی بھنک بھی پڑ جائے کہ اس جگہ سے جنات کا گزر ہوتا ہے تو وہ کبھی بھول کر بھی اس راستے پر قدم نہیں رکھتے۔

جنوں والے چوبارے کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ یہاں جمیل نامی ایک صاحب کا معزز خاندان رہا کرتا تھا۔ ان کا اپنا کاروبار تھا اور وہ سب خوشحالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جمیل صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بیٹے اور بیٹیاں دونوں اولادوں سے نواز رکھا تھا۔

ایک دن ان کی منجھلی بیٹی زیبی نہا کر بال سکھانے چھت پر چلی آئی۔ ابھی اسے آئے چند ہی لمحے ہوئے تھے کہ اچانک وہاں سے کسی جن کا گزر ہوا۔ اس کی نظر بال سکھاتی زیبی پر پڑی تو اپنا دل ہار بیٹھا۔ اگرچہ زیبی کوئی خوبصورت لڑکی نہیں تھی مگر شاید انسانوں کی طرح جنات بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں، بس دل آنے کی بات ہوتی ہے جس پر بھی آجائے، بس پھر کیا تھا، اس نے وہیں اپنا ڈیرہ جمالیا اور خاموشی سے اس کی پرستش شروع کردی۔

انہی دنوں زیبی کے لیے ایک بڑا اچھا رشتہ آیا۔ والدین سنجیدگی سے اس رشتے کے متعلق غور کرنے لگے۔ زیبی کی بڑی بہن نورالنساء شادی شدہ تھی اور اب قدرتی طور پر والدین زیبی کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے۔ آخر بڑے غور و خوص کے بعد رشتے کی منظوری دے دی گئی اور جلد ہی منگنی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ زیبی اس رشتے سے بہت خوش تھی۔

ابھی اس کی آنکھوں نے خواب سجانے بھی شروع نہیں کیے تھے کہ ایک چھناکے سے سب سپنے ٹوٹ کر بکھر گئے کیونکہ اس کے سسرال والوں نے شادی سے انکار کردیا تھا بغیر کسی وجہ اور جواز کے۔ زیبی اور اس کے گھر والے تو زندہ درگور ہوکر رہ گئے۔ ان دنوں منگنی ٹوٹنے کو بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ لوگ باتیں بناتے تھے کہ لڑکی میں ضرور کوئی عیب ہوگا جو منگنی ٹوٹ گئی۔

ایک دن زیبی اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی کہ اچانک ایک خوبصورت نوجوان وہاں نمودار ہوا۔ وہ گھبرا گئی۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی تو آواز جیسے اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ چیخنا تو کیا اس سے بولا بھی نہ گیا۔

''ڈرو نہیں اچھی لڑکی!'' وہ خوبصورت نوجوان گویا ہوا۔ ''پہلے میں اپنا تعارف کرادوں۔ میں انسان نہیں بلکہ جنات کی قوم سے ہوں اور یہ بھی کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''

اس نے ابھی یہیں تک کہا تھا کہ زیبی خوف کے مارے بے ہوش ہوگئی۔ جب ہوش میں آئی تو سب گھر والوں کو اپنے سامنے پایا۔ اردگرد دیکھا تو وہ نوجوان کہیں نظر نہ آیا لیکن لفظ ''جن'' ہی ایسا ہے کہ بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہوجاتا ہے۔ مارے ڈر اور خوف کے زیبی کسی کو کچھ بتا بھی نہ سکی۔ گھر والے یہی سوچ رہے تھے کہ شاید منگنی ٹوٹنے کی وجہ سے زیبی کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اس واقعے کے بعد وہ نوجوان کئی مرتبہ زیبی کے پاس آیا اور اسے اپنی محبت اور وفا کا یقین دلاتا رہا۔ زیبی کو بھی اب وہ نوجوان اچھا لگنے لگا تھا اور چونکہ وہ انسانی شکل میں اس کے پاس آتا تھا اس لیے اب اس کا ڈر بھی ختم ہوگیا تھا۔ آخر ایک دن زیبی نے بھی اس سے اقرار محبت کر ہی لیا۔ وہ تو خوشی سے جھوم اٹھا، بولا۔ ''میں اپنی ماں کو لینے اپنی دنیا میں جارہا ہوں۔ بہت جلد تمہاری ماں سے ہم رشتہ مانگنے آئیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ غائب ہوگیا۔

حسب وعدہ وہ چند ہی دنوں بعد اپنی ماں کو لے کر زیبی کے ہاں آپہنچا اور اس کے والدین سے رشتہ طلب کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی حقیقت بھی واضح کردی۔ زیبی کے والدین پہلے تو دم بخود رہ گئے پھر خوف سے تھرتھر کانپنے لگے۔

ان کی بیٹی کے لیے جنات سے رشتہ آئے، یہ بات بعیدازامکان تھی مگر ایسا ہوگیا تھا۔ ان پر وہی اثر ہوا جو پہلے پہل زیبی پر ہوا تھا۔ وہ دونوں بے ہوش ہوگئے۔ سارے گھر والے ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ ہوش میں آنے پر جب انہیں وہ جن اور اس کی ماں نظر نہ آئے تو کچھ اطمینان ہوا مگر یہ بات ان سے اب بھی ہضم نہ ہورہی تھی کہ ان کی بیٹی کے لیے جن کا رشتہ آیا ہے۔ لو بھلا جنوں کو اپنی قوم میں کوئی لڑکی نہ ملی تھی جو وہ زیبی کا رشتہ لے کر آگئے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ دلوں کے معاملے ہیں۔ اب اگر کسی جن کا دل انسان پر آجائے تو کوئی بھلا کیا کرسکتا ہے؟

اس کے بعد تو جن نے گویا ان کے گھر کی دہلیز ہی پکڑلی۔ زیبی کے والدین کا خوف بھی کافی حد تک کم ہوگیا تھا۔ جن اور اس کی ماں نے زیبی کے والدین کو ہر طرح سے یقین دلایا کہ وہ زیبی کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے، اس کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور یہ بھی کہ وہ جب چاہیں گے، زیبی ان سے ملنے آجایا کرے گی۔

زیبی کے والدین نے اعتراض کیا کہ بھلا ایک جن کی شادی انسان سے کیونکر ممکن ہوسکتی ہے؟ جواباً انہوں نے حضرت علی کی مثال دی جنہوں نے ایک جنیہ سے شادی کی تھی۔

ان کے اصرار اور خلوص کے آگے زیبی کے والدین مان گئے اور یوں اس کی شادی کی تاریخ ٹھہر گئی۔

انہوں نے اس بات کی بھنک بھی کسی کو نہ لگنے دی کہ زیبی کی شادی ایک جن سے ہی ہورہی ہے، بس یہی بتایا کہ اس کی شادی کسی دوسرے شہر ہورہی ہے اور وہ بیاہ کر وہیں چلی جائے گی۔

زیبی کی بَری میں جو کچھ آیا، اسے دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لعل و جواہر کے ایسے ایسے زیورات جن کے بارے میں لوگوں نے خواب میں بھی تصور نہ کیا تھا۔ اتنے نفیس اور سرسراتے ریشمی کپڑے جن کے بارے میں لوگ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ بیاہ کر زیبی اپنے پیا کے دیس چلی گئی جو کہ حقیقتاً جنات کا دیس تھا۔

اس شادی اور اس کی بَری کا مدتوں چرچا ہوتا رہا لیکن کسی کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ سب جنات کے ہاں سے آیا ہوا سامان تھا۔

بعدازاں جب زیبی یا اس کے گھر والوں کا دل اس سے ملنے کو چاہتا تو وہ آجاتی۔ آہستہ آہستہ لوگوں کو بھی اس بات کی خبر ہوگئی کہ زیبی ایک جن سے بیاہی گئی ہے اور یوں اس کا گھر ''جنوں والا چوبارہ'' کے نام سے مشہور ہوگیا۔

اپنے والدین کی زندگی تک تو زیبی ان سے ملنے آتی رہی، بعد میں اس کا کچھ پتا نہ چلا البتہ وہ چوبارہ اب تک موجود ہے۔

محبت

☆ محبت کا ایک گھنٹہ سو برس کی بے محبت زندگی سے بہتر ہے۔ (شیلے)

☆ محبت کے نشے میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے کردار کا صحیح جائزہ نہیں لے سکتے۔ (گلبرٹ)

☆ اگر دنیا میں ایک بھی محبت کرنے والا دل باقی نہ رہے تو آفتاب اپنی حرارت کھو بیٹھے گا۔ (تھیلر)

☆ محبت ایسی چیز ہے جو ہر انسان کو مشکل ترین کاموں کے لئے مجبور کرتی ہے۔ (ٹینی سن)

☆ محبت معنی و الفاظ میں لائی نہیں جاتی۔ (جگر مرادآبادی)

اقبال زمان

سلیمانی جن



دربار میں کسی کو ذرا سا شک بھی نہ ہوا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام نہیں بلکہ صحرہ جن ہے۔ دربار میں موجود سارے جنات اور انسان اسی طرح مودب کھڑے رہے

اسلامی تاریخ سے جڑی ایک جناتی کہانی

موجودہ سائنسی دورِ جدید میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو جنات کے وجود سے انکاری ہیں باوجود اس کے قرآنِ پاک میں بھی جنات کا ذکر موجود ہے۔ جنات کی موجودگی کے حوالے سے حضرت سلیمان علیہ السلام اور صحرہ جن کا یہ واقعہ ''قصص الانبیاء'' میں موجود ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی عادت تھی کہ جب بھی حوائج ضروری کے لیے جاتے' اپنی انگشتری اتار کر ایک خادمہ کو دے دیتے تھے کیونکہ اس پر اسمِ اعظم کندہ تھا۔ ایک جن جس کا نام صحرہ تھا' اس تاک میں رہتا تھا کہ وہ انگوٹھی کسی طرح اس کے قبضے میں آ جائے تا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کی طرح تخت پر بیٹھ کر حکومت کر سکے چنانچہ ایک روز جب حضرت سلیمانؑ نے انگوٹھی اتار کر خادمہ کو دی اور خود حوائج ضروری کے لیے چلے گئے تو صحرہ جن نے ان کا روپ دھارا اور خادمہ سے انگوٹھی لے کر پہن لی پھر وہ دربار میں چلا گیا۔

دربار میں کسی کو ذرا سا شک بھی نہ ہوا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام نہیں بلکہ صحرہ جن ہے۔ دربار میں موجود سارے جنات اور انسان اسی طرح مؤدب کھڑے رہے۔ پرندوں نے بھی اس کے سر پر پروں کا سایہ کیا اور صحرہ' حضرت سلیمانؑ کی طرح احکام جاری کرنے لگا۔ ادھر جب حضرت سلیمانؑ نے خادمہ سے انگوٹھی طلب کی تو وہ بولی۔

''انگشتری تو خود حضرت سلیمانؑ لے گئے ہیں اُن کا روپ دھارنے والے تم کون ہو؟''

وہ بولے۔ ''میں ہی سلیمان بن داؤد ہوں۔ تم نے انگوٹھی کسے دے دی؟''

خادمہ پریشان ہو گئی۔ ''اگر آپ سلیمان بن داؤد ہیں تو بالکل آپ ہی کی شکل وصورت اور چال ڈھال والا کون تھا' میں نہیں جانتی۔''

حضرت سلیمانؑ' خادمہ کی پریشانی اور حیرانی دیکھ کر سمجھ گئے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی چنانچہ وہ اپنے دربار میں آئے تو صحرہ کو تخت نشین دیکھ کر بولے۔

''تو کون ہے اور میرے تخت پر کیسے بیٹھا ہے؟''

صحرہ بولا۔ ''میں سلیمان بن داؤد ہوں اور یہ میرا تخت ہے۔'' پھر اس نے چوب دار کو حکم دیا۔

''اس بہروپیے دیوانے کو نکال دو یہاں سے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے درباریوں کو یقین دلانے کی بڑی کوشش کی کہ وہ سلیمان بن داؤد ہیں مگر کسی نے بھی ان کی بات نہ مانی کیونکہ اسمِ اعظم والی انگوٹھی تو صحرہ کی انگلی میں تھی۔ اس طرح انہیں دربار سے نکال دیا گیا۔

حضرت سلیمانؑ وہاں سے سیدھے بیت المقدس پہنچے اور تین شب و روز سجدے میں گر کر اللہ تعالیٰ سے گریہ وزاری کرتے رہے پھر بھوک سے بے تاب اور نڈھال ہو کر بیت المقدس سے نکلے اور بنی اسرائیل کے کئی گھروں پر دستک دے کر کھانا طلب کیا مگر کسی نے بھی انہیں کھانا نہ کھلایا۔ اس کے بعد انہوں نے شہر کے لوگوں سے درخواست کی مگر کسی نے بھی اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ ناچار وہ دریا کی طرف چل پڑے۔

دریا پر ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے ان سے کہا۔

''لوگو! میں بھوکا ہوں' مجھے کوئی کام دو یا ملازم رکھ لو تا کہ میں اس روزی سے رزق حاصل کر سکوں۔''

بہت سے ماہی گیروں نے انہیں ٹال دیا مگر آخر ایک ماہی گیر نے اس شرط پر انہیں ملازمت کی پیشکش کر دی کہ وہ دن بھر کی مزدوری کے بدلے انہیں دو مچھلیاں دے دیا کرے گا۔ حضرت سلیمانؑ نے شرط منظور کر لی۔ شام کو ماہی گیر نے انہیں دو مچھلیاں دیں۔ انہوں نے ایک مچھلی بیچ کر روٹی خریدی اور دوسری بھون کر روٹی کے ساتھ کھائی اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔

اس طرح چالیس روز تک حضرت سلیمان علیہ السلام اسی ماہی گیر کی ملازمت کرتے رہے۔ انہیں دو مچھلیاں روز ملتی تھیں۔ وہ ان سے اپنی کفالت کرتے اور جو کچھ بچ رہتا محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔

ادھر صحرہ ان ایام میں تخت پر بیٹھا حکمرانی کرتا رہا مگر اس کی حرکات وسکنات اور طور طریق پر اہلِ دربار کو بخوبی محسوس ہو گیا کہ وہ انسان نہیں بلکہ جن ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دانا وزیر آصف کو تو شروع ہی میں شک ہو گیا تھا۔ آخر چالیسویں روز وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خادمہ یمینہ سے ملا اور پوچھا۔

''رات حضرت سلیمانؑ نے کس بیوی کے ہاں قیام فرمایا تھا؟''

وہ بولی۔ ''وہ تو چالیس روز سے حرم میں تشریف ہی نہیں لا رہے۔''

یہ جان کر آصف کو یقین ہو گیا کہ تختِ سلیمانی پر بیٹھ کر حکمرانی کرنے والا جن ہے' چنانچہ اس نے چالیس توریت خوانوں کو دربار میں بلایا اور انہیں توریت خوانی کا حکم دیا۔ وہ توریت پڑھنے لگے۔ صحرہ' توریت سن کر تخت سے اٹھ کر بھاگا اور جاتے جاتے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اسمِ اعظم والی انگشتری دریا میں پھینک گیا۔

ایک روز حضرت سلیمانؑ تھک کر دریا کے کنارے لیٹے ہوئے تھے کہ ایک سانپ وہاں سے گزرا۔ اس نے جو انہیں دیکھا تو ایک بڑا سبز پتا منہ میں دبا کر ہوا دینے لگا۔ اُسی وقت ماہی گیر کی جواں سال بیٹی باپ کا کھانا لے کر وہاں سے گزری تو یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اُس نے جا کر باپ سے کہا کہ وہ اُسے حضرت سلیمانؑ سے بیاہ دے ورنہ وہ ساری عمر کسی دوسرے سے شادی نہ کرے گی۔ باپ'

بیٹی کی ضد سے مجبور ہو گیا اور حضرت سلیمانؑ کے پاس پہنچا جو ابھی تک سو رہے تھے مگر آہٹ سے جاگ اٹھے۔ ماہی گیر نے اُن سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم میری بیٹی سے شادی کرلو۔''

آپؑ نے جواب دیا۔ ''میں تو تمہارا ملازم ہوں' مجھے اجرت کے طور پر صرف دو مچھلیاں ملتی ہیں۔ میں تمہاری بیٹی کا مہر کہاں سے دوں گا اور اسے کیا کھلاؤں گا؟''

ماہی گیر بولا۔ ''میری بیٹی مہر نہیں چاہتی اور اس کے کھانے کو میں دیتا رہوں گا۔''

بالآخر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اُس کی بات مان لی اور اُس کی بیٹی سے بیاہ کرلیا۔

صخرہ جن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی جو انگوٹھی دریا میں پھینک دی تھی' اسے ایک مچھلی نگل گئی تھی۔ اُس انگوٹھی کی وجہ سے دریا کی ساری مچھلیاں اُس مچھلی کی مطیع ہو گئی تھیں۔ ایک روز وہ ماہی گیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے گیا تو جال میں انگشتری والی مچھلی بھی پھنس گئی۔ ماہی گیر نے دو مچھلیاں اجرت کے طور پر اور ایک مچھلی اپنی بیٹی کے لیے حضرت سلیمانؑ کو دی۔ انہوں نے دو مچھلیاں بیچ دیں اور تیسری اپنی بیوی کو دی کہ وہ اسے صاف کر کے پکائے۔ جب اُن کی بیوی نے مچھلی کا پیٹ چیرا تو اُس میں سے اسمِ اعظم والی انگشتری نکل آئی اور گھر میں اُجالا ہو گیا۔ وہ مارے حیرت کے چیخ اٹھی۔ حضرت سلیمانؑ اُدھر متوجہ ہوئے تو اپنی انگشتری پہچان لی اور اُسے پہن لیا تب انہوں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ وہ سلیمان بن داؤد ہیں پھر انہوں نے ہوا کو تخت لانے کا حکم دیا اور اُس پر بیٹھ کر اپنے محل پہنچ گئے۔ دربار سجایا گیا اور ہر خاص و عام نے حاضری دی۔

حضرت سلیمانؑ کی پہلی بیوی کا نام صیدونیہ تھا جسے وہ شہر صیدون سے لائے تھے۔ وہ عنکبوت کی بیٹی تھی۔ عنکبوت کی ہزیمت پر صخرہ جن صیدون سے جادوگری کی ساری کتابیں سمیٹ کر لے گیا تھا۔ اسی جادو کے سبب اس نے یمینہ سے حضرت سلیمانؑ کی اسمِ اعظم والی انگوٹھی حاصل کی تھی اور چالیس روز تک حکومت کرتا رہا تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے دکھ جھیلنے کے بعد واپسی پر اُن کتابوں کو پارہ پارہ کردیا۔ ایک روایت سے پتا چلتا ہے کہ ایک کتاب کا ایک ورق یا ٹکڑا کسی طرح ہندوستان پہنچا تھا۔ اس سے لوگ اب تک جادوگری کرتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت سلیمانؑ نے صخرہ جن کو بلوایا مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔ چنانچہ تمام جنات کو حکم دیا گیا کہ وہ اسے تلاش کریں لیکن جن اسے لانے میں ناکام رہے۔ انہوں نے آکر بتایا کہ صخرہ آپ کے خوف سے بیچ سمندر میں چھپا ہوا ہے اور اسے کسی حیلے بہانے کے بغیر آپ کے پاس لانا ممکن نہیں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو ہم کوئی جھوٹا عذر بنا کر اسے پکڑیں اور آپ کے حضور لے آئیں؟ حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں اجازت دے دی۔

جن سمندر میں پہنچے اور انہوں نے آواز لگائی۔

''اے صخرہ..... تو کہاں ہے؟ اب نکل آ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو چکا ہے۔''

یہ سن کر صخرہ سمندر کی گہرائیوں سے نکل آیا' تب جنوں نے اسے پکڑ لیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے حضور لے آئے۔ انہوں نے چالیس روز تک اسے قید و بند میں رکھا اور پھر اسے پتھر کے شکنجے میں جکڑ دیا۔ کہتے ہیں کہ وہ قیامت تک اس شکنجے میں جکڑا رہے گا۔

اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام سکون سے حکومت کرتے رہے اور انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے تعمیر کردہ بیت المقدس کی توسیع شروع کروائی اور جنات کو اس کام پر لگایا۔ ایک روز آپؑ گنبد کے دروازے پر اپنا عصا ٹیکے کھڑے تھے کہ ملک الموت اُنؑ کے پاس آیا۔ آپؑ نے پوچھا۔

''تم میری ملاقات کو آئے ہو یا میری رُوح قبض کرنے؟''

ملک الموت نے جواب دیا۔ ''رُوح قبض کرنے۔''

آپؑ نے فرمایا۔ ''اچھا' مجھے پانی پی لینے دو۔''

موت کے فرشتے نے کہا۔ ''میں حکمِ خداوندی کی تعمیل میں دیر نہیں کرسکتا۔''

چنانچہ حضرت سلیمانؑ جس حالت میں عصا تھامے اور ٹیک لگائے کھڑے تھے' اُنؑ کی رُوح قبض کرلی گئی۔ ایک روایت کے مطابق اُنؑ کا جسدِ خاکی ایک برس تک عصا کے سہارے کھڑا رہا اور کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اُنؑ کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرچکی ہے۔ اس دوران میں جنات بیت المقدس کی تعمیر میں مصروف رہے یہاں تک کہ دیمک اُنؑ کے عصا کو چاٹ گئی اور پھر ایک روز اُنؑ کی لاش گر پڑی' تب لوگوں اور جانت کو احساس ہوا کہ وہ اتنے عرصے سے بے جان کھڑے تھے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ جنات اپنی غیب دانی پر بڑا فخر کیا کرتے تھے مگر انہیں بھی معلوم نہ ہوسکا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمایا تھا۔ اگر وہ غیب کا علم رکھتے تو انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا علم ہو جاتا' پس اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی تھی کہ انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا علم نہ ہو ورنہ وہ بیت المقدس کی تعمیر کا کام چھوڑ کر چلے جاتے۔ ارشادِ ربانی ہے کہ۔

''جب فیصلہ کیا ہم نے اس پر موت کا تو پھر ہم نے کسی کو اُنؑ کی موت کی خبر نہ کی لیکن کیڑے اس کا عصا کھاتے رہے۔ جب وہ گر پڑا تو اس بات کا علم ہوا جنات کو۔''

قصہ مختصر وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ جنات کا وجود نہیں ہے' وہ سراسر غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

اچھے اور بُرے لوگوں سے آباد اس دنیا میں کچھ ایسی ہستیاں بھی موجود ہیں جن کے دلی اور ذہنی رشتے کہیں اُوپر جڑے ہیں' ایسے ہی لوگوں کی زندہ کہانیاں





اشعر جواد

نُورِ ہدایت

صوفی قادر بخش نے اساوری کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے کہ کسی لاش کی طرح پڑی اساوری نے آنکھیں کھول دیں اور پھر اس نے تین بار با آوازِ بلند کلمہ طیبہ پڑھا......

عشق کے ذریعے حقیقی فیض حاصل کرنے والے دو سچے عاشقوں کا قصہ حیرت



میں نے نور پور تھل میں چند برس رہ کر صوفی قادر بخش کے علم سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ سندھ کے اُس علاقے میں ہندو آبادی کی اکثریت تھی۔ صوفی قادر بخش ایک عرصے سے یہاں دینی و رُوحانی تعلیمات کے ذریعے دلوں کی کال کوٹھری میں نُورِ ہدایت کی شمع جلا رہے تھے۔ اپنے حسنِ سُلوک اور اعلیٰ اخلاق کے باعث گاؤں کے ہندو بھی اُن سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ صوفی قادر بخش یہاں بابا حکیم شاہ کے مزار کے نگران تھے جہاں صرف مسلمان ہی نہیں' بے شمار ہندو بھی اپنی منتوں و مرادوں کے سلسلے میں آتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ رَبّ العالمین ہے' رَبّ المسلمین نہیں۔ اس کی عطا ہر ایک کے لیے ہے۔ اس میں کوئی تفریق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کو کسی بھی ذریعے سے نوازے' یہ اس کی عطا و رَضا ہے اور اگر نامراد رکھے تو اِس میں بھی اس کی کوئی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔

وہ دن مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جب صوفی صاحب کا ایک عقیدت مند شاہ مراد صبح فجر سے مزار کے احاطے میں سر نیہوڑائے بیٹھا ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ ''تیرے فیض سے میری مراد پوری ہوگی۔'' یہاں تک کہ جلتے سورج کے ساتھ سخت دھوپ چڑھ آئی تھی۔ شدید گرمی میں پسینہ پسینہ مجذوبانہ انداز میں شاہ مراد کی آواز کبھی بلند ہو جاتی تھی تو کبھی بہت مدہم! فجر کے بعد ظہر اور پھر نمازِ عصر کا وقت ہو گیا مگر شاہ مراد کی بدستور وہی حالت رہی۔ اُس کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور پھر جب نمازِ عصر کے بعد صوفی صاحب احاطے میں آئے تھے تو شاہ مراد نے صوفی صاحب کے پاؤں تھام کر دیوانہ وار یہ سوال پوچھنا شروع کر دیا تھا کہ...... ''بتائیں میری مراد پوری ہوگی نا؟''

صوفی صاحب نے شاہ مراد کو اپنے بازوؤں سے سہارا دے کر کھڑا کرنے کے بعد اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ''بڑی بے تابی اور جنون ہے تجھ میں مگر یاد رکھ' تیری یہ بے تابی اور جنوں تجھے کسی آزمائش میں نہ ڈال دے' صبر کر' صبر!!''

صرف صوفی صاحب یا میں ہی نہیں' سارا گاؤں اس بات سے واقف تھا کہ شاہ مراد کی مراد کیا ہے؟ اس کی مراد گاؤں کی ایک ہندو لڑکی اساوری تھی۔

اساوری اپنے حسن و جمال میں یکتا' گویا اپنی مثال آپ تھی۔ اس کی ذات برادری میں اس کے کئی چاہنے والے تھے مگر اساوری کا دل کسی اور ہی منزل کا مسافر تھا۔ اساوری ایک بار کوئی منت ماننے اس مزار پر آئی تھی' بس اس کے بعد یہاں وہ شاہ مراد کی منت اور مراد بن گئی۔ اساوری کو دیکھ کر شاہ مراد کے دل میں ایک شعلہ عشق بھڑکا تھا اور پھر اس کی چاہ والی نظر کی حدت نے اساوری کے دل کو بھی پگھلا دیا تھا۔ وہ بھی شاہ مراد کے دل اور نظروں کی اسیر ہو گئی تھی۔

وہ جو کہتے ہیں کہ...... عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا' بالکل ایسے ہی شاہ مراد اور اساوری کے عشق کی داستان سارے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ یہ بات ہندوؤں کے لیے ان کی عزت و غیرت کا امتحان تھی' اس وجہ سے اساوری کے گھر والوں نے اس کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی تھی۔

اور پھر اُس رات ایسا ہوا کہ صوفی قادر بخش کی صبر والی نصیحت پر شاہ مراد کی بے تابی اور جنون حاوی ہو گیا...... شاہ مراد اور اساوری نے اُس رات گاؤں سے بھاگنے کی ناکام کوشش کی تھی' اس جرم کی پاداش میں اساوری کے بھائیوں اور برادری کے لوگوں نے اُن دونوں کو بے تحاشہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور نیم مردہ

↹ ⭳⭱ ⇆ ⇉• ⇈

شاخسانے

ایک وہ وقت تھا کہ
محبت کا فریب
کھانا بھی دلفریب
لگتا تھا
اور اب یہ عالم ہے کہ
حقیقی الفت پر بھی
دل کو وسوسے ہیں بہت
یہ ہی تو وقت کے
شاخسانے ہیں......

شگفتہ شفیق

حالت میں اپنے گاؤں سے ذرا دور ایک ویرانے میں مرنے کے لیے پھینک آئے تھے اور پھر جب اِس بات کی خبر صوفی قادر بخش کو ہوئی تھی تو انہوں نے فوراً ہی اپنے خدمت گاروں کو وہاں بھیجا تھا اور خدمت گار اساوری اور شاہ مراد کو نیم مردہ حالت میں اُس ویرانے سے اٹھا کر مزار پر لے آئے تھے۔

اگلی صبح جب اساوری کے گھر والوں اور برادری کو اِس صورت حال کا علم ہوا تو وہ اپنی دانست میں اساوری کی لاش لینے صوفی قادر بخش کے پاس مزار پر آئے تھے۔

صوفی صاحب نے اساوری کے گھر والوں سے کہا تھا۔ ”آپ لوگ تو اپنے خیال کے مطابق انہیں زندگی سے محروم کر چکے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ زندگی کی جانب لوٹ سکتے ہیں۔ میں اللہ کے حکم سے زندہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے آپ کو یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ اللہ کے حکم سے ہوش میں آنے کے بعد یہ اپنے مذہب اور زندگی گزارنے کے بارے میں جو فیصلہ کرے گی، آپ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ نہیں تو آپ اسے یوں اسی حالت میں لے جا سکتے ہیں۔“

صوفی صاحب کی یہ بات سن کر اساوری کے والدین و برادری نے بنا کسی تردد اُن کا یہ موقف تسلیم کر لیا تھا...... اس کے بعد صوفی قادر بخش یکدم کھڑے ہو گئے تھے اور ایک برتن میں مجھ سے پانی منگوایا تھا اور اِس پانی پر زیرِ لب کچھ پڑھ کر بار بار پھونکتے رہے تھے اور پھر اُس پانی کے چھینٹے اساوری کے چہرے پر مارے تھے اور پھر یکایک ہوا یوں تھا کہ کسی لاش کی طرح پڑی اساوری کی آنکھوں میں جنبش ہوئی تھی، آہستہ آہستہ اُس نے آنکھیں کھولی تھیں اور دیکھنے والی آنکھوں نے یہ منظر دیکھا تھا کہ اساوری نے تین بار با آوازِ بلند کلمۂ طیبہ پڑھا تھا۔

شاہ مراد کے سچے عشق نے اساوری کو نورِ ہدایت کی منزل پر پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد صوفی صاحب نے بالکل یہی عمل شاہ مراد کے ساتھ کیا تو وہ بھی ہوش میں آ گیا تھا۔ وہ دونوں مسرت کے عالم میں صوفی قادر بخش کے ہاتھوں کو چومنے کے بعد اللہ کے حضور شکر کے لیے سجدہ ریز ہو گئے تھے۔

صوفی صاحب نے اساوری کے والدین اور برادری سے کہا تھا۔ ”یہ قدرت کا فیصلہ ہے۔ اللہ جسے چاہے، نورِ ہدایت دے، جس دل پہ چاہے، مہر باطل ثبت کر دے۔ یہ اس کے فیصلے ہیں۔“ اور پھر صوفی صاحب نے اساوری کو حقانیہ کا اسلامی نام دیا تھا۔ شاہ مراد نے اپنے عشق کے ذریعے صوفی صاحب سے وہ فیض حاصل کیا تھا جو قسمت والوں کا ہی نصیب ہوتا ہے۔

▽△

عذرا فردوس

روح کی تشنگی

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں دیکھنے لگا۔ کیا واقعی یہ خواب تھا؟ اس کی نظر جونہی رومال پر پڑی تو اسے یقین ہو گیا، وہ خواب نہیں حقیقت تھا۔

ممتا کی ماری ایک ماں کا قصہ، وہ مر کر بھی بیٹے سے ملنے آئی تھی



کال بیل کی مسلسل آواز نے سیفی کو گہری نیند سے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی' رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

'اس وقت کون ہوسکتا ہے؟ کہیں ماہا اپنی امی کے گھر سے واپس تو نہیں آ گئی؟ مگر وہ تو دو دن کا کہہ کر گئی تھی؟' وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازہ کھولا تو سامنے فضیلہ آنٹی کھڑی تھیں۔ سفید کپڑوں میں ملبوس وہ بہت پروقار لگ رہی تھیں البتہ ان کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا جسے سیفی سمجھ نہیں سکا۔

''فضیلہ آنٹی......! آپ اس وقت؟'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''نہ سلام نہ دُعا' اوپر سے مجھ سے اندر آنے کو بھی نہیں کہہ رہے ہو؟''

''اوہ' سوری......السلامُ علیکم! اندر آئیں۔'' سیفی جھینپ سا گیا۔

''وعلیکم السلام!'' وہ اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلی آئیں۔

''آنٹی......! آپ اکیلی آئی ہیں' میرا مطلب ہے' غفار انکل نہیں آئے؟''

''نہیں' انہیں تو کسی سے ملنے کی فرصت نہیں ہے۔ کب سے بیمار ہوں' اتنا دل چاہ رہا تھا تمہیں دیکھنے کا' تم سے ملنے کا مگر تم ہو کہ کبھی بھولے سے ملنے نہیں آتے۔ آخر کو تم میرے رضاعی بیٹے ہو' تمہیں مجھ سے محبت ہو یا نہ ہو' میری ممتا تو تمہارے لیے تڑپتی ہے۔'' سیفی نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں گہری اداسی تھی لیکن جب اُس کی نظریں اُن کی آنکھوں سے ٹکرائیں تو انہوں نے فوراً نظریں ہٹالیں۔

''آنٹی' یقین کریں' آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر آپ کو صائمہ خالہ کا تو پتہ ہے' وہ نہیں چاہتیں کہ میں آپ سے ملوں' اوپر سے ماہا' میں نے کئی دفعہ اس سے کہا ہے کہ آپ کے گھر چلتے ہیں مگر ہر دفعہ بہانہ بنا دیتی ہے' اسے اپنی امی کے گھر کے علاوہ کسی کے گھر جانے کا شوق ہی نہیں ہے۔ اچھا آنٹی' بتائیں' کیا پئیں گی' چائے یا ٹھنڈا؟''

''نہیں بیٹا' کچھ نہیں' تمہیں دیکھنے کا دل چاہ رہا تھا' سو دیکھ لیا' اب میں چلتی ہوں' بس اتنی دیر کی اجازت ملی تھی۔''

''میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں' ایک تو آپ پہلی دفعہ آئی ہیں پھر بیٹھ بھی نہیں رہی ہیں۔ رات کافی ہوگئی ہے' آپ کیسے اکیلی جائیں گی؟ میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔''

''سیفی بیٹا' تم میرے ساتھ نہیں جاسکتے' میں خود ہی چلی جاؤں گی۔'' سیفی اُن کی بات کو سنی اَن سنی کرتے ہوئے ساتھ والے کمرے سے چابی لینے چلا گیا۔ اس نے بالوں پر برش پھیرا' ڈریسنگ ٹیبل پر سے کار کی چابی اٹھا کر جونہی وہ ڈرائنگ روم میں آیا تو وہاں فضیلہ آنٹی موجود نہیں تھیں۔ وہ انہیں آوازیں دیتا ہوا باہر نکلا۔ گلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

'ہوسکتا ہے' باہر غفار انکل موجود ہوں' آنٹی ان کے ساتھ چلی گئی ہوں مگر انہیں مجھے بتا کر جانا چاہیے تھا۔' یہ سوچتے ہوئے وہ آ کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھ کب لگی' اسے پتہ ہی نہ چلا۔

صبح اتوار تھا' اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ آج رات اسے صائمہ خالہ کے گھر دعوت میں جانا تھا۔ ان کے چھوٹے بیٹے نے ایم کام کرلیا تھا' اس کے پاس ہونے کی خوشی میں انہوں نے خاندان بھر کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ دعوت کا خیال آتے ہی اسے فضیلہ آنٹی یاد آ گئیں۔

'آج دعوت میں اُن سے ملاقات ہوگی تو میں اُن سے پوچھوں گا کہ رات کو وہ اس طرح کیوں چلی گئیں؟ صائمہ خالہ کی نند ہونے کے ناطے وہ اس تقریب میں ضرور آئیں گی۔' سیفی نے سوچا۔

رات کو وہ مقررہ وقت پر صائمہ خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ ان کا ہزار گز کا بنگلہ سجاوٹ اور آرائش سے دلہن بنا ہوا تھا۔ بڑے سے لان میں مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ تقریب میں خاصے افراد موجود تھے۔ کھانے کا وقت ابھی دور تھا۔ کیٹرنگ بھی کسی مشہور پکوان ہاؤس کی تھی۔

''ارے' فضیلہ کے ایصالِ ثواب کے لیے بھی دو چار ڈشیں نکال دینا اور نوکروں کو دے دینا۔ اس کی فاتحہ دُرود کس نے کرائی ہوگی؟'' صائمہ خالہ نے کسی کو ہدایت کی تھی۔

''فضیلہ آنٹی کی فاتحہ دُرود؟ صائمہ خالہ! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' سیفی حیران و پریشان تھا۔

''سیفی' تمہیں نہیں معلوم' فضیلہ کا انتقال ہوگیا ہے یہی ایک ہفتے پہلے۔ خیر' تمہیں کیسے پتہ چلتا' ہمیں تو خود اس کے مرنے کے بعد پتہ چلا۔ پتہ نہیں' کب سے بیمار تھی بے چاری؟'' سیفی کو جھٹکا سا لگا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا اگر فضیلہ آنٹی کا انتقال ایک ہفتے پہلے ہوگیا تھا تو پھر کل رات......!

اس لمحے سیفی کو یہ ساری سجاوٹ' آرائش' لوگوں کا ہجوم' رونق' سب کچھ موت کا بازار لگنے لگا۔ سیفی کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر رونا شروع کردے کہ یہ چمک دمک' رونق' شور شرابہ' سب دھوکہ ہے......

•......•......•......•

صائمہ خالہ کے شوہر سہیل خالو کی اکلوتی بہن فضیلہ عام سی شکل و صورت کی مالک تھیں۔ میٹرک کرتے ہی باپ نے اُن کی شادی ایک عام سے شخص سے کردی۔ بظاہر معصوم نظر آنے والا وہ شخص بہت لالچی تھا' اس کی نظریں سسر کی دولت پر تھیں۔ اسے جہیز بھی توقع سے کم ملا تھا اسی لیے اس نے بات بے بات فضیلہ آنٹی کو مارنا پیٹنا شروع کردیا۔ فضیلہ آنٹی بے چاری اپنے میکے آ کر فریاد کرتیں مگر یہاں اُن کی سننے والا کون تھا؟ ماں تو اُن کی شادی کے ایک مہینے بعد ہی فوت ہوگئی تھیں اور باپ نے دوسری شادی کرلی تھی۔ وہ اپنی نئی نویلی بیوی کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے' بیٹی کی کیا سنتے۔ شوہر نے جب دیکھا کہ اس کا ہر حربہ ناکام ہو رہا ہے تو اس نے طلاق کا تحفہ دے کر انہیں گھر سے نکال دیا۔ اُس وقت اُن کا چھ ماہ کا بچہ بھی تھا جسے شوہر نے چھین لیا۔

انہی دنوں سیفی چند ہفتوں کا تھا کہ اس کی امی سخت بیمار ہوگئیں۔ فضیلہ آنٹی نے نہ صرف سیفی کو ایک مہینے اپنے پاس رکھا بلکہ اسے اپنا دودھ بھی پلایا۔

صائمہ خالہ کے گھر سیفی کی امی ہر ہفتے بیٹے سے ملنے جایا کرتیں۔ صائمہ خالہ کو وہ مفت کی نوکرانی ملی ہوئی تھیں۔ بھاوج ہونے کے ناتے وہ ہر وقت اُن پر حکم چلاتیں' کچن کا سارا کام اُن کے سپرد تھا اور کچن سے ملحق ایک اسٹور نما کمرے میں ان کی رہائش تھی۔ فضیلہ آنٹی ہر وقت اپنے بیٹے کے لیے بے قرار رہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح انہیں اُن کا بیٹا مل جائے مگر اُن کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ بھائی نے اُن کا ساتھ نہ دیا کہ وہ کورٹ کچہری کے ذریعے اپنے بیٹے کو حاصل کرتیں۔ دوسرا صدمہ انہیں اُس وقت لگا جب ایک دن اطلاع آئی کہ اُن کا بیٹا ٹینک میں گر کر فوت ہوگیا ہے۔ وہ بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گئیں۔ بیٹا زندہ تھا تو کم از کم اس سے ملنے کی آس تو تھی۔ وہ سیفی کو جب بھی دیکھتیں' بے اختیار گلے لگالیتیں۔

''سیفی......! اب تو تم ہی میرے بیٹے ہو۔ خوب پڑھنا تاکہ کامیاب انسان بنو۔ خدا تمہیں صحت کے ساتھ لمبی عمر دے۔'' وہ سیفی کو ڈھیروں دُعائیں دیتیں۔ عام سے سادہ کپڑوں میں وہ گھر کی نوکرانی لگا کرتی تھیں مگر صائمہ خالہ پھر بھی اُن سے خوش نہیں تھیں پھر اُن کی دوسری شادی کردی گئی۔

اپنی شادی کے وقت وہ سیفی سے لپٹ کر خوب روئی تھیں۔ اُس وقت سیفی خود سات برس کا تھا' اُسے اُن کا رونا سمجھ نہیں آیا تھا۔

اُن کے دوسرے شوہر غفار انکل کسی فرم میں معمولی پوسٹ پر تھے۔ سہیل خالو نے شادی کے وقت ایک فلیٹ اپنی بہن کے نام کردیا' یوں غفار انکل کو شادی کرتے ہی چھت بھی میسر آگئی اور بیوی کی صورت دیکھ بھال کرنے والی ملازمہ بھی مل گئی۔

فضیلہ آنٹی شادی کے بعد بہت کم ملنے آیا کرتیں۔ اُن کا فلیٹ آبادی سے دور ایک نواحی علاقے میں تھا۔ سہیل انکل کے والد کا انتقال ہوا تو باپ کی جائیداد کو انہوں نے اکیلے دبوچ لیا جبکہ فضیلہ آنٹی اپنا حق بھی نہ مانگ سکیں اور باتوں کی طرح فضیلہ آنٹی نے خدا کی عدالت میں یہ مقدمہ بھی دائر کردیا۔

فضیلہ آنٹی کی شادی کے بعد سیفی جب بھی صائمہ خالہ کے گھر جاتا تو اس کمرے میں ضرور جاتا جس میں وہ رہا کرتی تھیں۔ اسے اس کمرے میں ان کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ اس کا بہت دل چاہتا تھا کہ وہ اُن سے ملنے اُن کے گھر جائے لیکن وہ چھوٹا تھا' اکیلے جانا اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ اپنی امی کے ساتھ کئی دفعہ ان کے گھر گیا تھا۔ دو کمروں کا وہ چھوٹا سا فلیٹ جسے انہوں نے سلیقے سے سجایا ہوا تھا' یہ اس بھائی کی اکلوتی بہن کا گھر تھا جس کے نوکر اس سے اچھی حالت میں رہتے تھے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا' سیفی اپنی تعلیم میں ایسا مصروف ہوا کہ اسے کہیں آنے جانے کی فرصت ہی نہ مل پائی۔ صائمہ خالہ نے نیا گھر لیا تو فضیلہ آنٹی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی لپٹ گئیں۔

"سیفی! میرے بیٹے' میں تمہیں کتنا یاد کررہی تھی۔ پہلے تو تم کبھی کبھار میرے گھر آجاتے تھے' اب تو آنا ہی چھوڑ دیا؟"

"سیفی انجینئر بن رہا ہے' کوئی معمولی پڑھائی نہیں کررہا' اسے فرصت ہی کہاں ہے جو تمہارے گھر آئے گا؟" صائمہ خالہ نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

"آنٹی' امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی' جونہی موقع ملا' آپ کے گھر ضرور آؤں گا۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" سیفی نے اُن کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اُن کا رنگ پہلے صرف سانولہ تھا' اب اس پر پیلاہٹ چھا گئی تھی' دبلا پن حد سے بڑھ گیا تھا' چہرے پر ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ دوسرے شوہر سے اُن کے دو بچے ہوئے تھے جو چند دنوں بعد ہی فوت ہوگئے تھے۔ بچوں کی موت نے اُن کی زندگی کو اور دکھی بنا دیا تھا' شاید اولاد کی محبت میں وہ اپنے غموں کو بھول جاتیں مگر ماں بن کر بھی اُن کی ممتا سیراب نہ ہوسکی۔

"بس بیٹا' جی رہی ہوں' میں تو وہ عورت ہوں جسے نہ شوہر کی محبت مل سکی اور نہ ہی اولاد کی۔" وہ بے حد دکھی لہجے میں بولیں۔

"ارے' میں ہوں نا' آپ کی اولاد' آپ میری بھی تو ماں ہیں' میں آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔"

یہ اُن سے ملاقات کا اثر ہی تھا' سیفی دو روز بعد اُن کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اُس کی محبت میں بچھی جارہی تھیں۔

"یہ لو نا سیفی' یہ شامی کباب' بہت مزے دار ہیں' سموسے میں نے خود گھر پر بنائے ہیں۔"

"آنٹی' میں کھا تو رہا ہوں۔ غفار انکل بہت خوش نصیب ہیں جو آپ جیسی بیوی انہیں ملی ہے۔"

وہ اُس کی بات پر بجائے خوش ہونے کے' افسردہ ہوگئیں۔ سیفی کچھ دیر بیٹھ کے چلا آیا۔ غفار انکل کی فطرت کو وہ اچھی طرح سمجھتا تھا' وہ حد درجے لاپروا انسان تھے' انہیں صرف کھانے پینے کی حد تک فکر تھی اور کسی بات سے انہیں سروکار نہ تھا۔ ان کا تعلق ان لوگوں میں سے تھا جو صرف جانوروں کی طرح سانس لینے یا کھانے کے لیے زندہ ہوتے ہیں۔

سہیل خالو نے اُن کا انتخاب ہی اس لیے کیا تھا کہ کوئی اور شخص ہوتا تو اُن کے باپ کے انتقال کے بعد جائیداد میں سے حصہ مانگ لیتا لیکن انہیں اس سے کوئی غرض نہ تھی۔

فضیلہ آنٹی کو تو ویسے ہی اس بے رحم دنیا نے سوائے دکھوں کے' کچھ نہیں دیا تھا' شاید قدرت نے اولاد بھی اس لیے جلدی اٹھالی کہ اس کی پرورش کرنا اُن کے لیے اس محدود آمدنی میں مشکل ہوجاتا۔ فضیلہ آنٹی ان لوگوں میں سے تھیں جو دنیا میں صرف ظلم سہنے کے لیے آتے ہیں۔

تعلیم مکمل ہوتے ہی سیفی کی شادی ہوگئی۔ فضیلہ آنٹی طبیعت کی خرابی کے باعث اس کی شادی میں شریک نہیں ہوئیں۔ شادی کے بعد وہ ماہا کے ساتھ اُن کے گھر ملنے گیا تھا۔

سیفی کو اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی وہ اس دنیا کو چھوڑ جائیں گی اور وہ ان کے جنازے کو کاندھا بھی نہیں دے سکے گا۔

"صائمہ خالہ......! کیا آپ کو فضیلہ آنٹی کی بیماری کا پتہ نہیں تھا؟ آپ نے مجھے اُن کی موت کی اطلاع نہیں دی کہ میں اُن کی قبر پر دو مٹھی خاک ہی ڈال دیتا؟" ماضی کی سوچوں سے نکلتے ہی سیفی کے اندر کی تلخی اس کے لہجے میں در آئی۔

"فنکشن ختم ہو لینے دو پھر بات کرتے ہیں۔ خوشی کا موقع ہے' ایسے موقع پر مہمانوں کے سامنے غم کی باتیں کیا کرنا' جانے والی تو چلی گئی۔" انہوں نے بے پروائی سے کہا۔

"نہیں خالہ......! میں انتظار نہیں کرسکتا' مجھے بتائیں' یہ سب کچھ کب اور کیسے ہوا؟"

"فواد......!" انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز

غزل

میرے خیالوں کے تانے بانے اُلجھ گئے ہیں میں سلجھا رہی ہوں
گئے زمانے کے سارے منظر انہیں کو واپس بلا رہی ہوں

کدھر چلی تھی کہاں رُکی ہوں، کوئی رستہ نہ کوئی منزل
جہاں قدم رکھے زندگی نے، میں اُس ہی رستے پہ جارہی ہوں

کسی سے شکوہ نہ کچھ شکایت، ہے ضبط و غم کی ہمیں تو عادت
اِن آنسوؤں کا سبب نہ پوچھو، میں اپنا ماضی بھلا رہی ہوں

گزشتہ موسم کے رتجگوں میں تمہاری یادوں کے سائے سے ہیں
بھلانا چاہوں بھلا نہ پاؤں، میں کب سے خود کو بتا رہی ہوں

وہ برسات کے دن، وہ خوش کن نظارے جنہیں کھوج کھوج تھک گئی
تیرا تصور وہ چاہت وہ یادیں انہیں سے یادیں سجا رہی ہوں

مجھے بلاؤ نہ اب مجھ کو چاہو، گئے زمانے کی آواز ہوں میں
تمہاری محفل سے دور جاکر، میں خود سے خود کو چھپا رہی ہوں



رضیہ ناز

دی۔ ’’بھئی‘ سیفی کو کمپنی دو‘ بلاوجہ مجھ سے بحث میں الجھا ہوا ہے‘ فضول باتیں کر رہا ہے۔‘‘

سیفی ان کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ بھی اس منافق دنیا کا فرد تھا‘ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ چیخ چیخ کر کہہ سکے کہ وہ بھائی جو اپنے گھر کے فنکشن میں دنیا دکھاوے کے لیے لاکھوں روپے لٹا سکتا ہے لیکن بہن کو بسترِ مرگ پر لاوارثوں کی طرح سرکاری اسپتال میں چھوڑ دیا۔

وہ غفار انکل کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ اسے فضیلہ آنٹی کی موت کے بارے میں بتانے لگے۔

’’فضیلہ بہت بیمار ہو گئی تھی‘ اسے کینسر نے پوری طرح جکڑ لیا تھا۔ جب اسے اسپتال لے کر جا رہے تھے تو میں نے صائمہ کو خبر کر دی تھی لیکن صائمہ نے کسی کو خبر نہ دی۔ بھائی بھتیجے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں سوتے رہے‘ آرام کرتے رہے اور بہن سرکاری اسپتال کے پلنگ پر زندگی کی بازی ہار گئی۔ مرتے وقت کوئی اُن کے پاس نہ تھا۔‘‘

’’سیفی! چلو اٹھو‘ کھانا لگ گیا ہے۔‘‘ صائمہ خالہ کے بیٹے ارباز نے آ کر کہا۔ سیفی کا دل کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر دنیاداری کے تقاضے پورے کرنے کے لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’تم تو غفار پھوپھا کے ساتھ چپک ہی گئے۔ آؤ‘ دوستوں میں چل کر بیٹھو۔‘‘ وہ اسے لے کر دوسری طرف چلا گیا۔ سیفی ٹیبل پر بیٹھ کر بے دلی سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے کزنز کیا گفتگو کر رہے تھے‘ وہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔

’’شیر زمان......! یہ جتنا کھانا بچ گیا ہے‘ ایدھی سینٹر میں بھجوا دو۔ خدا اس کا اجر میری فضیلہ کو دے۔ ویسے بھی میں نے دو دیگیں زیادہ پکوائی تھیں‘ وہ اچار گوشت اور بریانی بڑے شوق سے کھاتی تھی۔ غریب لوگ کھائیں گے تو اس کی روح کو ثواب ملے گا۔‘‘ صائمہ خالہ کی آواز سیفی کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ انہیں حیرت سے دیکھنے لگا۔

سیفی کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہ صائمہ خالہ کو ٹھیک ٹھاک سنا دے کہ جب انہوں نے زندگی میں فضیلہ آنٹی کی کوئی قدر نہیں کی تو اب ان کے مرنے کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے؟ ان پر یہ احسان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں دنیا دکھاوے کے لیے یہ چونچلے بازی کر رہی ہیں؟ لیکن سیفی بھی اس دنیا کا‘ اس معاشرے کا ایک فرد تھا‘ اس میں ہمت نہیں تھی کہ یہ سب کہہ سکتا۔ جب یہ منافقت اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ کسی سے ملے بنا وہاں سے چلا آیا۔ اسے کسی پل قرار نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں بس فضیلہ آنٹی ہی گھوم رہی تھیں۔ ان ہی خیالوں میں جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے سفید لباس میں ملبوس فضیلہ آنٹی نظر آئیں۔

’’آنٹی......! آپ......آپ تو مر چکی ہیں؟‘‘ نیم غنودگی کی حالت میں وہ بڑبڑایا۔

’’سیفی بیٹا! میں تمہیں آخری بار دیکھنے آئی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد میں تم سے نہ مل سکوں۔‘‘

’’آنٹی‘ آپ وہاں آرام سے تو ہیں نا؟‘‘

’’ہاں بیٹا‘ مجھے یہاں سے جا کر بہت سکون ملا ہے۔ اس منافق دنیا نے مجھے دیا ہی کیا ہے؟ یہ رومال تم اپنے پاس رکھنا‘ یہ تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا۔‘‘

اسی لمحے سیفی کی آنکھ کھل گئی‘ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں دیکھنے لگا۔ کیا یہ واقعی خواب تھا یا حقیقت؟ فضیلہ آنٹی کی روح اس سے ملنے آئی تھی‘ اس کی نظر جونہی رومال پر پڑی‘ اسے یقین ہو گیا کہ جو کچھ اس نے دیکھا‘ وہ خواب نہیں‘ حقیقت تھا۔ سیفی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ دیوانہ وار رومال کو چومنے لگا۔ آج بھی وہ رومال سیفی کے پاس موجود ہے۔ اسے اس رومال سے فضیلہ آنٹی کی خوشبو آتی ہے۔



آسیب کہانی

انسانوں کی اس دنیا میں انسان کے علاوہ اور کون‘ کیا کچھ موجود ہے‘ کوئی مکمل طور پر نہیں جانتا‘ آسیب کی صورت انسان سے چمٹ جانے والی خونی کہانیاں

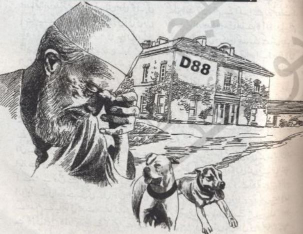


فرزانہ آغا

ڈی اٹھاسی

عمران نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا کہ میں لرز کر رہ گیا۔ وہ آنکھیں عمران کی نہیں تھیں، وہ آنکھیں چاچے جیسی تھیں، باہر نکلی ہوئیں، سرخ جیسے کسی نے اُس کا گلا دبایا ہو......

چار دوستوں کا پراسرار ماجرا، مری کی پہاڑی پر وہ عجیب چکر میں پھنس گئے تھے



بہرام اور میں اسلام آباد کے ایک ہی اسکول سے O لیول کررہے تھے۔ بہرام کے والد ریٹائرڈ کرنل تھے اور ان لوگوں کو اسلام آباد شفٹ ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ میں اور بہرام بڑی جلدی دوست بن گئے تھے اور نوعمری کی ان تمام حرکتوں میں ساتھ ساتھ رہتے تھے جن سے والدین اور اساتذہ عاجز رہتے ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ امتحانات میں گریڈز معقول آجاتے تھے جن کی وجہ سے تلافی ہوجایا کرتی تھی۔ اسکول میں ہماری چار دوستوں کی ٹولی مشہور تھی۔ اس ٹولی میں میرے اور بہرام کے علاوہ شامل دو لڑکے عمران اور مومن بھی ہماری کلاس ہی میں تھے۔

ایک روز لنچ بریک میں باتیں کرتے کرتے اچانک منصوبہ بنا کہ کل ویک اینڈ ہے تو آج شام کو مری چلتے ہیں۔ گھر میں امی کی نئی گاڑی آئے مہینہ ہورہا تھا اور وہ اکثر میرے تصرف میں ہوتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب سے امی کی نئی گاڑی آئی تھی، دل چاہ رہا تھا کہ اسے لے کر مری جاؤں، ویسے شاید پنڈی، اسلام آباد کے ہر نوجوان کے (کم از کم اس عمر میں کہ جس میں ہم تھے۔) زیرِ تصرف جب بھی موٹر سائیکل یا گاڑی آتی ہے تو اس کا یہی دل چاہتا ہے۔ ہمارے منصوبے کو مزید تقویت اس وقت ملی کہ جب بہرام نے یہ کہا کہ اس کے نانا کا گھر مری میں ہے، ہم رات اُدھر رہ لیں گے جبکہ مومن اور عمران نے کہا کہ دیگر اخراجات میں وہ بھی شیئر کریں گے۔ اس کے بعد ان تینوں نے پہلے اپنے گھر والوں سے اجازت لی اور پھر میرے ساتھ میرے گھر آگئے۔ حسبِ توقع مجھے امی کی جانب سے گاڑی ڈرائیو کرنے کی اجازت نہ ملی تھی۔ اس متوقع اعتراض کے بعد ہم نے یہ اجتماعی جھوٹ بولا تھا کہ چلیں ٹھیک ہے، گاڑی بہرام کا ڈرائیور چلائے گا، ہم اسے ایف ایٹ سے پک کرلیں گے۔ اُن دنوں میرے ابو کراچی گئے ہوئے تھے اور امی کو منانا آسان ہی ہوتا ہے، سو امی رضامندی کے بعد جلدی جلدی ہمارے صدقے دینے لگی تھیں اور ہم چاروں آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کررہے تھے کہ یہ ساری فارمیلٹیز پوری ہوں تو ہم نکلیں۔

جب ہم گھر سے نکلے تو شام ڈھل رہی تھی۔ بھارہ کہو کراس کیا تو رش تھوڑا کم ہوا۔ ہم لوگوں نے ایک جگہ رک کر ضرورت کی کچھ چیزیں لیں اور اپنی من پسندی ڈیز سنتے سکون سے مری پہنچے۔ ہم نے ابھی مال پر گاڑی پارکنگ میں لگائی ہی تھی کہ امی کی کال آگئی۔ میں نے انہیں خیریت سے پہنچنے کا بتایا اور کہا کہ ہم لوگ کسی ہوٹل پر کھانے کے لیے جا رہے ہیں، بس کھانا کھاتے ہی بہرام کے گھر چلے جائیں گے۔ وہ مری سے قریب ہی ہے لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم نے ایک اچھے ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا اور جلدی جلدی کھانے کا آرڈر دیا۔ ہم نے یہاں آنے کی فوری پلاننگ کے چکر میں دوپہر میں کچھ ڈھنگ سے کھایا نہ تھا اور اب زوروں کی بھوک ستا رہی تھی۔ خنک ماحول میں کھانے کا لطف دوبالا ہوگیا تھا۔

ہم کھانا کھا کر باہر آئے تو مال پر رش خاصا کم ہوگیا تھا کہ ابھی گرمیاں شروع نہیں ہوئی تھیں اور مری کا مارچ اسلام آباد کے مارچ سے کم از کم اس رات تو کہیں زیادہ ٹھنڈا تھا۔ گیارہ، ساڑھے گیارہ کا وقت تھا اور خوب تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ عمران کو اچانک ٹھنڈ لگنے لگی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی اپنے بیگ میں اپنے گرم کپڑے ٹٹولنے لگا تو بہرام بولا۔

"یار، اُدھر دس پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر تو گھر ہے، وہاں جا کر ایک ہی دفعہ سامان کھولتے ہیں۔" باقی سب نے بھی بہرام کی ہاں میں ہاں ملائی تھی تو عمران چپ ہوگیا تھا اور پھر جب گاڑی چلتے ہی بہرام نے ہیٹر آن کیا تھا تو ہم سب اپنی بے وقوفی پر ہنسنے لگے تھے۔

مال سے تھوڑا باہر نکلے تو بہرام راستہ سمجھانے لگا، ہم کشمیر پوائنٹ کی طرف نکلے پھر تھوڑا آگے جا کر آرمی کی چوکی کے بیریئر کے پاس بہرام بولا۔ "اِدھر لیفٹ پر نیچے جو پتلی سی سڑک جا رہی ہے، اُدھر موڑ لینا، بس اِدھر سے سیدھا سیدھا آخر تک جانا ہے، اینڈ پر بورڈ لگا ہوگا D-88، بس وہاں روک لو۔"

یہ ویران اندھیری سڑک کافی نیچے تک جاتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پہاڑوں کے بیچ اکا دکا گھر تھے جو اس وقت خالی ہی لگ رہے تھے کہ نہ تو برف باری کا موسم تھا اور نہ گرمی کا زور، چہار سو خاموش رات کا راج تھا۔ نیچے جاتی پتلی سی سڑک ایک چوڑے ہموار قطعے پر ختم ہوئی جہاں سامنے اونچی نیچی غیر ہموار پہاڑیوں میں گھری ایک گھر کی پرانی عمارت بالکل ویران لگ رہی تھی۔ وہاں گاڑی روک کر ہم نے اپنے اپنے بیگز اٹھائے اور آگے جاتے بہرام کے پیچھے چلنے لگے۔ پارکنگ سے آگے تین لمبی لمبی کائی زدہ سیڑھیاں تھیں جو رہائشی عمارت کو جاتی تھیں۔ سامنے کے دو روشن دانوں سے مدھم سی روشنی باہر آرہی تھی۔ بہرام دروازے پر کھڑا چوکیدار کو آوازیں دے رہا تھا پر کافی دیر تک دروازہ نہ کھلا تو بہرام نے دو تین بار زور زور سے دروازے پر دستک دی اور پھر بھی خاموشی رہی تو وہ پلٹ کر ہمیں دیکھنے لگا پھر بیگ نیچے رکھا اور سیدھے ہاتھ کی پہاڑی پر اوپر چڑھا اور روشن دانوں سے اندر آوازیں دینے لگا۔ "چاچا......! چاچا......!"

بہت دیر بعد دھیرے سے باہر کا دروازہ کھلا اور دروازے کے دونوں پٹ اکٹھے کھولے چاچا بس خاموش کھڑا سرخ سرخ آنکھوں سے ہم سب کو گھورنے لگا۔ مومن نے فوراً بہرام کو پکارا، پر وہ شاید گھومتا ہوا کسی اور روشن دان سے اندر آوازیں لگا رہا تھا۔ خیر، جب وہ چپ ہوا تو عمران نے اونچی آواز دے کر اسے بتایا کہ دروازہ کھل گیا ہے۔ مجھے عجیب لگا کہ آخر چاچا بول کیوں نہیں رہا؟ اوپر سے اس کا عجیب وغریب حلیہ، ٹوپی والا پرانا سا میلا کوٹ جو پاؤں سے ذرا اوپر تک تھا۔ قدرے جھکا ہوا سر اور وحشت زدہ چہرے پر سرخ آنکھیں جو اس حد تک حلقوں سے باہر تھیں کہ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس کا گلا دبایا ہوا ہو، سونے پر سہاگہ، اس حلیے پر جامد خاموشی۔

بہرام کودتا پھلانگتا مین روڈ پر آیا تو بولا۔ "چاچا، کیا سو رہے تھے؟ ہم کب سے دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں، یہ تینوں میرے دوست ہیں۔ ہم رات کو اِدھر رکیں گے۔ صبح ناشتہ کرنے نتھیا گلی جائیں گے اور پھر اُدھر سے سیدھے اسلام آباد چلے جائیں گے۔" اب ہم گھر کے اندر چھوٹے سے لاؤنج میں موجود تھے، وہاں فرش پر چاچے کا بستر پڑا ہوا تھا۔ بہرام نے وہاں موجود دو کمروں کے بند دروازوں کے ہینڈل گھمائے تھے اور چاچا سے مخاطب ہوا تھا۔ "ان کی چابیاں؟ کوئی ایک کمرہ کھول دیں چاچا......!"

"چابیاں تو نہیں ہیں۔" جواب میں چاچا انتہائی دقت سے بولا تھا۔

"بھائیا! چاچا تو ٹُن لگتا ہے۔" عمران نے میرے قریب ہوتے سرگوشی کی تھی۔

"کیا مطلب؟" بہرام کچھ الجھ کر بولا۔

"چابیاں اب قریشی صاحب کے پاس ہوتی ہیں۔" چاچے کی پھنسی پھنسی آواز آئی۔

"کس کے پاس؟"

"صاحب کے پاس ہوتی ہیں۔"

"کب سے؟ ان دو کمروں کی چابیاں تو ہمیشہ تمہارے پاس ہوتی تھیں۔" بہرام نے پوچھا۔

"اب نہیں ہوتیں۔" چاچا، بہرام کے چہرے

پر نظریں جمائے جمائے بولا۔ بہرام نے ایک بار پھر دونوں دروازوں کے ہینڈل زور زور سے گھمائے' پر دروازے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بہرام ہم سے قدرے شرمندہ شرمندہ سا پھر کمروں کے دروازوں سے زور آزمائی کرنے لگا۔

''کوئی بات نہیں یار' اِدھر لاؤنج میں ہی لیٹ جاتے ہیں۔'' مومن بولا۔

بہرام پلٹا اور کہنے لگا۔ ''ہاں' یہ ٹھیک ہے چاچا' آپ اسٹور سے میٹرس لا دیں۔'' پھر اس نے سائیڈ کا ایک دروازہ کھولا اور لائٹ جلانی چاہی اور بولا۔ ''باتھ روم کی لائٹ بھی نہیں جل رہی' آپ اسٹور سے بلب لا دیں' ہم خود بدل لیں گے اور یہ اپنا بستر بھی لیتے جائیں۔'' بہرام جھک کر پتلا سا گدا اور تکیہ لپیٹ کر گول کرتا ہوا بولا۔

چاچا مڑا' بغیر کچھ بولے بستر پکڑا اور اوپر جاتی تین سیڑھیاں چڑھ کر قدرے فاصلے پر بنے اسٹور میں کھٹر پٹر کرنے لگا۔ ذرا دیر میں بہرام نے باتھ روم کا بلب لگا دیا۔ ہم تینوں نے بہرام سے میٹرس اور تکیے لے کر نیچے ڈبل بیڈ سا بنایا اور اپنے اپنے بیگز پیچھے پڑی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیئے۔

''کمبل دو۔'' بہرام نے سیڑھیوں پر کھڑے چاچے سے کہا۔ وہ کھڑا بہرام کو خاموشی سے گھورتا رہا' چاچے کی آنکھیں ایسی تھیں جیسے اسے سوئے ہوئے کئی برس گزر چکے ہوں پھر بہرام خود ہی اسٹور میں گیا اور جھٹ پٹ دو موٹے موٹے کمبل اٹھا لایا اور جھاڑتے ہوئے بولا۔ ''غلطی ہوگئی' پتا ہوتا کہ کمرے لاک ہوں گے تو میں چابیاں گھر سے لے کر آتا' ویسے سچ بتاؤں؟'' وہ آواز قدرے دھیمی کرتا ہوا بولا۔ ''میں نے گھر بتایا ہی نہیں ہے کہ میں مری جا رہا ہوں' کہا تھا کہ رات ہم سب عمران کے گھر پر جمع ہیں۔''

''کیوں؟ اور جو کسی نے گھر فون کرلیا تو؟''

عمران ذرا گھبر کر بولا۔

''تو دیکھی جائے گی' لو تم لوگ کمبل سیٹ کرو۔'' میرے ہاتھ میں کونٹیکٹ لینسز کی ڈبیہ دیکھتے ہوئے اس نے کمبل مومن اور عمران کو تھمائے۔

''ذرا پرے لے جا کر جھاڑ لو۔'' میں نے فوراً ہی کہا تھا۔ میری آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی' میں نے lenses اتار کر ڈبیہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور منہ دھونے باتھ روم میں گیا تو نلکے ایسے خشک تھے جیسے کسی نے برسوں سے انہیں استعمال نہ کیا ہو۔ میں نے بہرام کو آواز دی اور کہا۔ ''یہاں تو پانی کا قطرہ نہیں' شاید پانی کا مین والو بند ہے۔''

''اچھا!! چاچا' پانی کیوں نہیں آ رہا؟'' اس نے فوراً ہی چاچا سے سوال کیا تھا۔

''پانی نہیں آ رہا؟'' بدقت جواب دیتے چاچے کی آنکھوں کے سرخ سرخ ڈیلے بے تاثر تھے پھر ذرا توقف سے وہ بولا۔ ''اچھا دیکھتا ہوں۔'' ہم چاروں صوفے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے اور جب چاچے کو گئے پندرہ بیس منٹ ہو گئے تو بہرام نے باہر کا دروازہ کھولا۔ ہم بھی اٹھ کر باہر آ گئے۔ باہر چاچا تو کیا' دور دور تک کسی متنفس کا نشان نہ تھا۔

''یار' چاچا کدھر گیا؟'' بہرام اِدھر اُدھر دیکھتا حیرت سے بولا اور پھر وہ اونچی اونچی آوازیں دینے لگا۔ ''چاچا......! چاچا......!'' مگر ہر طرف مکمل خاموشی تھی اور سرد رات کی چپ میں ستاروں کی سوالیہ ٹمٹماہٹ تھی۔

''بہرام' وہ دیکھ' وہ چاچا نہیں؟'' عمران کی آواز پر ہم سب دائیں ہاتھ ایک نسبتاً اونچی پہاڑی کی چوٹی کو دیکھنے لگے جہاں چاچا کھڑا کسی عورت سے باتیں کر رہا تھا۔

''یار' یہ چاچے کا کیا چکر ہے' یہ نارمل ہے؟'' عمران نے بہرام سے پوچھا۔

''ہاں ہاں' ایسی کوئی بات نہیں' یہ برسوں میرے [نانا] کے ساتھ رہا ہے' نانا اس پر بہت بھروسہ کرتے [تھے] وہ کہتے تھے کہ یہ بڑا وفادار آدمی ہے۔ خیر چھوڑو' [آؤ] مومن' اوپر جا کر ہم خود پانی کا والو کھول آتے [ہیں۔''] بہرام اور مومن پانی کا والو کھولنے گئے تو [عمران] آہستہ سے بولا۔ ''یہ چاچا پتا نہیں کیا چکر چلا [رہا ہے] اتنی ٹھنڈ میں وہاں کھڑا نجانے اس عورت [سے] کیا باتیں کر رہا ہے؟''

''چل یار' ہم تو اندر چلیں۔'' میں نے دور [پہاڑی] پر موجود چاچے اور عورت پر ایک نظر ڈالی اور [عمران] کے ساتھ اندر آ گیا لیکن ہمیں اندر آئے ابھی [چند م]نٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اسٹور میں سے کچھ [آوا]زیں آئیں' میں نے اور عمران نے ذرا آگے [بڑھ ک]ر دیکھا تو چاچے کا کوٹ نظر آیا تھا۔ اسی وقت [موم]ن اور بہرام پانی کا والو کھول کر واپس آئے [تھ]ے۔ بہرام نے ہماری حیرت زدہ شکلیں دیکھیں تو [ب]ا پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''یہ چاچا' یہ کچھ دیر پہلے تو پہاڑی پر کھڑا تھا' یہ [اتنی] جلدی اندر کیسے آ گیا؟'' میں حیرت سے بولا۔

میری بات سن کر بہرام کے چہرے پر ایک [رنگ س]ا آ کر گزر گیا پھر بولا۔ ''یہ مقامی لوگ بہت تیز [ہوت]ے ہیں' ہماری طرح تھوڑی۔'' یہ کہتے کہتے وہ [کپ]ڑے بدلنے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔

مومن ڈی وی ڈی پلیئر پر کوئی سی ڈی سیٹ کر رہا تھا پر اس سے پلیئر آن نہیں ہو کر دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ تم آ کر ذرا چیک کرو۔

میں بیگ کی زپ کھولے اپنی عینک ڈھونڈ رہا تھا۔ ''یار میری عینک نہیں مل رہی۔ ٹھہرو' میں lenses لگاتا ہوں پھر دیکھتا ہوں۔'' اب جو میں نے ٹیبل پر نگاہ ڈالی تو lenses کی ڈبیہ غائب تھی۔ اسی وقت چاچا' بہرام کو ایک تکیہ پکڑانے کے لیے میرے پاس سے گزرا تو مجھے اچانک ایسے لگا جیسے اس کے ہونٹوں پر ایک پوشیدہ سی ہنسی تھی۔ خیر' میں نے اپنی تسلی کے لیے میٹرس پر اپنا پورا بیگ الٹ دیا۔ بیگ میں تمام چیزیں تھیں لیکن ان میں lenses کی ڈبیہ نہ تھی۔ میں نے بیگ کی زپ دوبارہ کھولی تو دیکھا کہ میری عینک اپنے case سمیت اندر پڑی تھی' بہت حیرت ہوئی لیکن پھر میں نے دل میں سوچا' شاید میں نے ہی لاپرواہی میں پہلے نظر نہ ڈالی ہو پر lenses کی ڈبیہ؟

بہرام نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کیا ڈھونڈ رہا ہے؟''

''یار' میرے lenses کی ڈبیہ نہیں مل رہی؟''

''ابھی یہیں میز پر تو رکھی تھی تم نے۔'' پھر باقی سب بھی تکیے' کشن اور بیگ الٹا پلٹا کر دیکھنے لگے۔

''میری ڈبیہ چاچے نے تو نہیں اٹھائی ہوگی؟'' میں جھلا کر بولا۔ بہرام ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ مومن اور عمران بھی حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

بہرام بولا۔ ''وہ lenses کا کیا کرے گا؟ تم اطمینان سے دیکھو' ڈبیہ اِدھر ہی ہوگی۔''

''میں ذرا چاچے کے کمرے میں دیکھ آؤں؟ وہ ابھی باہر نکلا ہے۔'' میں نے ذرا دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں آؤ' دیکھ آتے ہیں' تمہاری تسلی ہو جائے گی۔'' عمران اور میں تیز تیز سیڑھیاں پھلانگتے اسٹور میں گئے' وہاں ایک تخت نما چوکی پر چاچے کا بستر گول ہوا پڑا تھا۔ میں نے بستر سیدھا کیا' اس کے بعد چاچے کی ایک چادر جو گودڑ کی شکل میں پڑی تھی' اسے اٹھا کر جھاڑا تو lenses کی ڈبیہ نیچے گری۔ میری اور عمران کی تو حیرت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔

''مجھے یہ چاچا تو mental case لگ ہی رہا ہے پر تو یہ بتا کہ تجھے یہ خیال کیسے آیا کہ ڈبیہ چاچے نے اٹھائی ہوگی؟''

میں نے ڈبیہ کھول کر lenses چیک کیے اور جب اطمینان ہوا تو بولا۔ ''بس ایسے ہی' بس مجھے لگا کہ......''

ہم دونوں نے اسٹور سے باہر آکر جب یہ معاملہ مومن اور بہرام کو بتایا تو بہرام شرمندہ سا بولا۔ ”پتا نہیں‘ ایسے کیسے ہوگیا؟ یہ چاچا تو بہت عرصے سے نانا کے ساتھ تھا‘ وہ کہتے تھے‘ یہ بہت ایماندار آدمی ہے۔“

”تیرے نانا زندہ ہوتے نا تو آج کے بعد یہ کہا کرتے‘ یہ بہت ایمان دار آدمی تھا۔“ عمران مسخرے پن سے بولا۔

اس دوران میں مومن جو بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا‘ بے زاری سے بولا۔ ”اب کوئی سی ڈی لگا دے گا یا باقی رات بھی تم لوگوں نے یونہی ضائع کرنی ہے؟“

”لاؤ میں لگاتا ہوں۔“ میں آگے ہوتا ہوا بولا۔

تھوڑی دیر میں موی شروع ہوگئی۔ ہم چاروں لاؤنج میں بیٹھے تھے جس کے اندر دو کمروں کے دروازے لاک تھے۔ ایک واش روم کا دروازہ تھا اور اسٹور کے علاوہ صرف مین ڈور تھا جو ہم سے پانچ چھ فٹ دور تھا۔ موی شروع ہوئے آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ کسی بات پر ہم سب نے اکٹھے قہقہہ لگایا تو اسٹور کا دروازہ بڑی واضح آواز میں چرچرایا۔ ہم سب نے مڑ کر دیکھا تو چاچا اسٹور کے دروازے کے بیچ کھڑا انتہائی ناپسندیدہ نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

”سوری چاچا‘ اب خیال رکھیں گے‘ لگتا ہے‘ آپ کی نیند خراب ہوگئی۔ یار‘ اب اونچا نہیں ہنسنا اور ٹی وی کی آواز بھی کم کرو بلکہ ٹی وی کے پاس ہو جاؤ‘ چاچا کا موڈ بہت خراب ہے۔“

بہرام کی یہ بات سن کر ہم سب اپنے اپنے تکیے کشن اٹھا کر ٹی وی کے قریب ہو گئے‘ یوں میں تھوڑا سا عمران کے قریب ہوا تو بولا۔ ”عمران! جب ہم lenses ڈھونڈنے اسٹور میں گئے تھے تو چاچا تو نہیں تھا اندر پھر ہم سب اِدھر ہی رہے تو پھر یہ چاچا اندر کب آیا اور کہاں سے؟ باہر کا دروازہ تو سامنے ہے؟“ میری یہ بات سن کر عمران سوچ میں [illegible] تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے وہاں کچھ عجیب سا [illegible] ہو رہا تھا اور عمران سے یہ بات کرنے کی وجہ [illegible] وہ ذرا بڑا اور سمجھدار ہونے کے ساتھ ساتھ ذمہ دار بھی تھا اور ہر قسم کی صورت حال کو سمجھنے کی بہت صلاحیت رکھتا تھا۔ اکتوبر 2005ء میں جب [illegible] ترین زلزلے کے باعث مارگلہ ٹاورز گرے [illegible] اربابِ اختیار کو سانپ سونگھے ڈیڑھ دن گزر چکا [illegible] عمران نہ صرف رضاکاروں کے ساتھ [illegible] موٹے کام کرتا رہا تھا بلکہ بعد میں وہ مارگلہ ٹاورز [illegible] اندر تک گیا تھا اور اس نے ہمیں وہاں کے بارے میں بہت سی باتیں سنائی تھیں۔

میں اپنی انہی سوچوں میں الجھا فلم دیکھ رہا تھا [illegible] اچانک لائٹ چلی گئی تھی۔ بہرام نے اٹھ کر ایمر[جنسی] لائٹ آن کرنا چاہی مگر وہ خراب تھی۔ اس نے [illegible] میز پر پڑی ایک پرانی سی موم بتی روشن کی تو [illegible] مدہم مدقوق روشنی میں ہمارے سائے بنانے لگی [illegible] ماحول مزید ڈپریشن میں چلا گیا۔

”یار‘ ہمارے پاس کمروں کی چابیاں نہیں [illegible] ورنہ یہ سامنے ڈائننگ روم اور اس کے ساتھ [illegible] ہے۔ چائے ہی بنا لیتے۔ چاچے کے موڈ ہی کا [illegible] نہیں چل رہا ورنہ اسٹور میں بھی چولہا تو لگا ہوا [illegible]

بہرام کی یہ بات سن کر میں نے ہولے [illegible] کہا۔ ”یار بہرام‘ یہ چاچا کچھ عجیب behave نہیں کر رہا [illegible]

”ہاں‘ ابو اور ولید بھی ایک بار آئے تھے تو [illegible] سے کہہ رہے تھے کہ شہروز بوڑھا ہو گیا ہے‘ اب [illegible] کھسکا بھی لگتا ہے‘ ملازمت بھی نہیں چھوڑتا اور نہ [illegible] نئے ملازم کو ساتھ رکھنے پر تیار ہوتا ہے۔ گھر [illegible] حالت دیکھو‘ کیسے مٹی سے اٹا ہوا ہے سب کچھ [illegible] امی‘ چاچے سے ذرا سخت لہجے میں بات کرتے [illegible] یہ نانا کی یاد میں ایسی باتیں کرتا ہے کہ امی‘ [illegible] خاموش کر دیتی ہیں لیکن اس بار تو ابو دوسرا ملازم ساتھ نہ رکھنے پر چاچے سے خفا ہو کر گئے ہیں‘ اس کا موڈ تو اب خراب ہی رہتا ہے‘ پر آج تو چاچا......“

”چاچا‘ demon بنا پھر رہا ہے۔“ عمران شوخی سے بولا۔ ”اور بہرام‘ تو مان لے کہ چاچے کو اندر آتے کسی نے نہیں دیکھا۔“

”نہیں یار‘ ہم موی کے چکر میں تھے۔ پتا نہیں [کب آ]یا ہوگا۔“ بہرام نے ابھی اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ [با]ہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ [ا]ن کے حلق سے ایسی مکروہ‘ دلخراش آوازیں نکل رہی [تھ]یں کہ دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔ عمران کھڑکی کی [ط]رف بڑھا تھا تو میں بھی اس کے پیچھے لپکا تھا اور ہم [ن]ے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تو باہر چاند کی روشنی میں کتے نیم دائرے کی صورت میں اکٹھے تھے‘ کالے رنگ کے دبلے پتلے چمکیلی کھال والے ایک جیسے آٹھ کتے‘ ان کے بھونکنے میں عجیب سی وحشت تھی۔

”ان کتوں کی آوازوں نے تو دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے منحوس‘ پتہ نہیں کہاں سے آ گئے ہیں؟ چلو عمران‘ انہیں بھگا کر آتے ہیں۔ ایک تو لائٹ نہیں‘ دوسرے یہ کتے؟ ہم کیا یہاں ان کتوں کا بھونکنا سننے آئے ہیں؟“

”مومن‘ پلیز‘ اب چپ بھی ہو جاؤ اور ان کتوں کو برا بھلا کہنا بند کرو۔“ بہرام ذرا سختی سے بولا تو سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے پھر وہ ذرا نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ”وہ دراصل بہت پہلے ایک بار ولید کے دوستوں نے باہر نکل کر ان کتوں کو مارا تھا تو؟؟؟“ بہرام ہچکچاتا ہوا رک گیا۔ ”وہ ایک بار ہم دونوں بھائی اپنے کچھ کزنز کے ساتھ آئے تھے‘ ساتھ ولید کے کچھ دوست بھی تھے۔ کتوں کے بھونکنے پر ولید کے دوستوں کو بہت غصہ چڑھا تھا۔ ان میں سے ایک باہر نکلا تھا اور جو ہاتھ میں آیا تھا‘ وہ اٹھا کر ان کتوں کو مارنے لگا تھا۔ پر کتے تو نہ بھاگے تھے پر وہ خود اچانک اونچا اونچا رونے لگا تھا۔ وہ پہلے بہت دیر تک خوامخواہ اونچا اونچا روتا رہا تھا اور پھر بھاگ کر اس سامنے والی دیوار پر سیدھا سیدھا یوں سامنے دیوار پر چڑھ گیا تھا جیسے کوئی چھپکلی ہو۔“

”کیا بات کر رہے ہو بہرام! ہوش میں تو ہو؟“ میں جیسے چیخ ہی اٹھا تھا۔

”میں اسی لیے چپ تھا کہ تم لوگ مجھے ہی جھوٹا سمجھو گے۔“

”تو یہ کتے یہیں رہتے ہیں کیا؟“ عمران نے بہرام سے پوچھا۔

”رہتے تو نہیں‘ کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔“

”چلو یار‘ مال کا چکر لگا کر آتے ہیں‘ عجیب بے چینی ہو رہی ہے ان کتوں کے بھونکنے سے۔ دیکھتے ہیں کوئی ہوٹل کھلا ہو تو چائے پیتے ہیں‘ شاید تب تک لائٹ آ جائے۔“

”اس وقت؟ عمران! پونے دو بج رہے ہیں رات کے۔“

”میں ابھی چائے پینا چاہتا ہوں۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا ہے۔ اف......“ عمران دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دباتا ذرا جھنجھلا کر بولا۔

”آرام سے‘ آرام سے‘ چل رہے ہیں‘ اتنے sentimental کیوں ہو رہے ہو؟“ میں نے اٹھتے ہوئے اس کے کندھے پر دھپ مارا۔ سب نے اپنے اپنے لیے سوئٹر کندھوں پر ڈالے۔

بہرام بولا۔ ”چاچے کو بتا آؤں؟“

”سونے دو اسے‘ دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر تو مال ہے‘ آ جائیں گے تھوڑی دیر میں۔“ مومن باہر نکلتا ہوا بولا۔

ہم چاروں جیسے ہی باہر نکلے‘ گاڑی کے قریب نیم دائرے میں بیٹھے کتے اچانک خاموش ہو گئے

جیسے رِنگ ماسٹر نے انہیں کوئی اشارہ دیا ہو۔ مجھے چاند کی دھندلی سی روشنی میں یوں لگا جیسے وہ کتے ہوا میں ہلکا سا تیرتے ہوئے پیچھے ہوئے ہوں۔ ہم سب گاڑی میں بیٹھے تو وہ سب کتے اٹھ کر اِدھر اُدھر ہوگئے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے steap پر چڑھاتا ہوا مین روڈ پر آ گیا۔ فوجی بیریئر سے رائیٹ ہوا اور مال کی طرف جاتے جو پہلا کھوکھا دکھائی دیا' وہاں گاڑی روک لی' کھوکھے والے کو چائے کا کہہ کر ہم سائیڈ پر بنے طویل سیمنٹ کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ نیچے وادی میں ٹمٹماتی روشنیاں گھپ اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح دمک رہی تھیں' اسی وقت گھنے چیڑ کے درختوں میں یخ ہوا سرسرائی اور دور کچھ جنگلی جانوروں کی آوازیں ابھریں۔ عمران اچانک اٹھا' چار چھ قدم چلا اور کچھ عجیب' بے پروا اور شوخ آواز میں اونچا اونچا گانا گانے لگا۔

''یار عمران' خاموش ہوجا' کیسی آواز میں گا رہا ہے؟'' مومن نے اسے ٹوکا۔

''پھر کیسی آواز میں گاؤں' ہیں؟'' وہ اپنی قمیص کا گلا پھاڑتے ہوئے بولا۔ ''اس سینے میں سے ایسی ہی آواز آتی ہے۔ تمہارا سینہ کھولوں؟ ادھر آؤ۔'' اس نے آگے بڑھ کر مومن کی قمیص آگے سے پکڑ کر پھاڑ دی اور زور زور سے ہنسنے لگا۔ کھوکھے والا چائے کی ٹرے پکڑے عمران کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''چائے یہاں دوں کہ اندر پینی ہے؟'' اس نے ایک نگاہ غلط انداز ہم سب پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''بس یہیں دے دو۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ سب چپ چاپ چائے پینے لگے۔ چائے ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ ''اگر تم سب مانو تو اپنے بیگز اٹھاتے ہیں اور واپس چلتے ہیں' سڑکیں خالی پڑی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ گھنٹہ لگے گا۔''

عمران ویسے ہی اونچا اونچا گانا گاتا رہا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ مومن جس کا موڈ عمران کی بدتمیزی کے بعد سخت خراب تھا' اس نے آنکھوں سے ہاں میں ہاں ملائی۔

بہرام جو خاصا اپ سیٹ لگ رہا تھا' دھیرے سے بولا۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''

عمران نے فرنٹ ڈور کھولا اور بیٹھنے کے بعد شیشہ نیچے اتار کر اونچا اونچا گانے لگا۔ بہرام اور مومن پیچھے بیٹھ گئے۔ ہم تھوڑا سا آگے گئے تھے کہ پولیس کی پیٹرولنگ اسکواڈ گزری۔ جب کراس کیا تو رفتار ڈیڈ slow کر لی۔

''یار' چپ ہوجا یا شیشہ اونچا کر لے۔ حالات جا رہے ہیں' کہیں کسی اور مشکل میں نہ پڑ جائیں۔'' میں نے بیک ویو مرر میں اسکواڈ کو دیکھ کر تنبیہ کی' جواباً عمران نے ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ بخدا' میں لرز کر رہ گیا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایسی لہر اٹھی کہ میں پسینے میں شرابور ہوگیا۔ وہ آنکھیں عمران کی آنکھیں نہیں تھیں بلکہ وہ آنکھیں چاچے جیسی تھیں' باہر نکلی ہوئیں' سرخ' جیسے کسی نے اس کا گلا دبایا ہو۔ میں نے دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد شروع کیا۔ کچھ دیر بعد حواس بحال ہوئے' پر میں نے سوچا کہ اب کچھ دیر میں عمران کی طرف دیکھوں گا ہی نہیں۔

دس پندرہ منٹ بعد میں نے بہرام سے کہا۔ ''یار' وہ موڑ اب تک آیا ہی نہیں' ہم آگے تو نہیں آ گئے؟'' سب چونک کر اندھیری سڑک کی طرف متوجہ ہوئے۔

''یہ تو...... یہ ہم آگے آ گئے ہیں۔'' بہرام اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بولا۔ ''یہ جنگل تو مجھے انجانا سا لگ رہا ہے تو کس طرف نکل آیا؟''

''میں تو سیدھا ہی آ رہا ہوں' لیفٹ سائیڈ پر کوئی چوکی آتی تو لیفٹ ٹرن لیتا۔''

بہرام گہری سوچ میں مستغرق بولا۔ ''گاڑی واپس موڑ لو' اس وقت یوں آگے جانا مناسب نہیں۔''

یہاں سڑک بہت ہی کٹی پھٹی اور تنگ تھی' میں نے مہارت سے گاڑی موڑ لی۔ ابھی گاڑی پوری طرح مڑی بھی نہ تھی کہ دھم سے آگے دو بندر کودے۔ بہرام اور مومن کی دبی دبی سی چیخیں نکلیں۔ عمران زور زور سے ہنسنے لگا۔

میں نے ذرا غصے سے کہا۔ ''عمران' شیشہ اوپر چڑھاؤ' یہ بندر خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔'' شکر ہے کہ عمران نے میری بات مان لی۔ میں نے گاڑی ویسے ہی کھڑے رکھی۔ تین چار منٹ بندر آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہمیں گھورتے رہے پھر نیچے کسی کھائی سے مزید بندروں کی چیخ پکار پر دونوں بندر متوجہ ہوئے اور جیسے ہی انہوں نے کھائی کی طرف دو چار قدم بڑھائے' میں نے تیزی سے گاڑی آگے نکال لی۔

گاڑی میں ایک سناٹا تھا اور میرے دل کی اونچی دھڑکن گویا میرے کانوں میں بج رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بہرام بولا۔ ''وہ دیکھو' سامنے وہ کھوکھا جہاں چائے پی تھی' اِدھر سے گاڑی موڑ کر بالکل آہستہ آہستہ چلاؤ' میں موڑ پر نظر رکھتا ہوں۔'' کھوکھا بند ہو چکا تھا۔ میں نے اسپیڈ آہستہ کرتے ہوئے گاڑی موڑی تو میرے پاؤں جیسے ایکسی لیٹر پر جم کر رہ گئے۔

''کیا ہوا' چلتے کیوں نہیں؟''

''میں نے اِدھر ایک سیکنڈ کو یہاں وہ کتے بیٹھے دیکھے تھے' اس سیمنٹ کے چبوترے پر' پر اب تو نہیں ہیں۔''

مومن ایک دم سے بولا۔ ''میں نے بھی' میں نے بھی دیکھے تھے۔ یار بہرام' آج کی رات بہت گڑبڑ ہے۔ خدا کرے' ہم خیریت سے گھر واپس پہنچ جائیں۔'' مومن کی روہانسی آواز آئی۔

''نیچے پان کی دکان' اوپر گوری کا مکان۔'' عمران ایسی بھاری آواز میں گا رہا تھا جیسے نشہ میں ہو۔ میں نے عمران کی طرف گھور کر دیکھا تو بولا۔ ''نہیں پسند؟ یہ گانا تمہیں نہیں پسند؟ چلو کوئی اور گانا گا لیتے ہیں۔''

بہرام بولا۔ ''یار' تم لوگ پریشان نہ ہو' کوئی کتے وتے نہیں تھے' تم لوگوں کو وہم ہوا ہوگا' تم چلو سیدھا' اسپیڈ آہستہ رکھو۔ بیریئر قریب ہی ہوگا۔''

اس دوران میں بادل اتنے نیچے اتر آئے تھے کہ دائیں بائیں کے سارے منظر ان میں اوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ میں چپ چاپ گاڑی چلانے لگا۔ تقریباً پونے چار بج رہے تھے' میں جوں جوں آگے جاتا رہا' دھند بالکل اندھا کرنے لگی۔ میں نے مجبوراً گاڑی سائیڈ میں لگائی۔ ہیزرڈ لائٹس آن کیں اور پلٹ کر بہرام کو تکنے لگا۔

''ہم پھر بہت آگے آ گئے ہیں۔ یہ جو ''آرمی سگنلز'' کا لال بورڈ تھا نا' پہلے بھی ہم اس کو گزار کر آگے گئے تھے۔''

مومن بولا۔ ''سامان کو دفعان کرو' اسلام آباد نکلو یار' مری آئے ہیں کہ کسی desert میں بھٹک گئے ہیں؟ ایسے کون سے پیچیدہ راستے ہیں یہاں؟''

''تم آ جاؤ ڈرائیونگ سیٹ پر' مجھے تو بھٹکانے کا شوق ہو رہا ہے۔'' میری آواز میں خاصہ غصہ تھا۔

''کیا ہو گیا ہے؟ تم دونوں کیوں الجھ رہے ہو؟ ابھی راستہ مل جائے گا۔ تھوڑی دھند چھٹ جائے۔'' خلاف توقع عمران بالکل نارمل لہجے میں بولا۔ ہم کافی دیر سڑک کنارے کھڑے رہے۔ اس دوران کسی ایک گاڑی نے ہمیں کراس نہ کیا۔ کچھ دیر کے بعد بادل چھٹے اور منظر کچھ واضح ہوا' میں بورڈ پڑھتا پڑھتا بالکل آہستہ گاڑی چلاتا بالآخر مین ہائی

وے تک پہنچ گیا۔ اللہ جانتا ہے کہ کیسے سب کی جان میں جان آئی' میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ عمران کو دیکھو ذرا' ایسا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا' آج کیسا رنگ دکھایا ہے اور یہ مومن' دوسری بار راستہ بھولنے پر بس اونچا اونچا رویا ہی نہیں اور یہ بہرام' آتے ہوئے کس قدر چونچال تھا اور اب...... اف' گاڑی نہ لاتا تو ذمہ داری بھی نہ ہوتی۔ میں نے سر جھٹکا' اترائی اترے تو کم گہرے بادلوں میں گاڑی چلانا ذرا آسان ہوا۔ میں نے سڑک کے سائیڈ میں ایک صاف شفاف بہتے چشمے کو دیکھ کر سوچا' ٹریک تو پکڑ ہی لیا ہے۔ ذرا منہ پر پانی کے چھینٹے مار لوں۔ آنکھوں میں جلن سے برا حال تھا۔ میں نے گاڑی سڑک کے سائیڈ میں لگائی اور بند کرتا ہوا بولا۔ ''میں منہ دھو کر آیا پانچ منٹ میں۔''

چشمہ جو سڑک کے قریب لگ رہا تھا' کافی اوکھی اترائی میں تھا۔ یہاں پر بادل بہت کم ہونے سے ہلکی ہلکی بارش پھیلی ہوئی تھی۔ میں پتھروں پر کودتا' پھلانگتا نیچے اترا اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے۔ یخ برف پانی سے جلتی انگارہ آنکھوں کو کچھ سکون ملا اور ذرا میرے ہوش بحال ہوئے ورنہ تو گھپ اندھیری سڑک پر گاڑی چلاتے میرا ابھر کس نکل گیا تھا۔ جب سے گھر سے نکلے تھے' آدھا گھنٹہ بھی آرام کرنے کو نہ ملا تھا پھر پیچھے گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' وہ تینوں بھی اتر کر ادھر آ رہے تھے۔

''گاڑی لاک کر دی؟''

''ہاں۔'' بہرام نے نیچے آ کر مجھے چابی پکڑا دی۔ ہم چاروں کچھ دیر چشمے پر رکے اور جب اچھی طرح فریش ہو کر اوپر آئے تو سڑک پر ایک چھوٹے سے کھوکھے والا کھوکھا کھول رہا تھا۔ بہرام نے پوچھا۔ ''چائے مل جائے گی؟''

''کیوں نہیں صاحب' منہ اندھیرے آئے گر لیے ہیں؟'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''بس چائے پلا دو پھر نکلیں۔''

''لاہور واپسی ہے؟''

''نہیں' نہیں' اسلام آباد جانا ہے۔'' بہرام بولا۔

''اچھا۔'' کھوکھے والا حیرت سے بولا۔ ''دراصل اتنی صبح سویرے عام طور پر لوگ پنجاب نکلتے ہیں۔ ان کا سفر لمبا ہوتا ہے نا جی!''

''ساتھ کچھ کھانے کو ملے گا؟''

''انڈے ابال دیتا ہوں۔''

''یار بہرام' اب قورمے کا آرڈر نہ دے دینا' بس چائے پی کر نکلتے ہیں۔ میں انگلی میں چابی گھماتا ہوا بولا۔ سب ہنسنے لگے اور پھر اچانک ہی میری انگلی میں گھومتی چابی تیزی سے گھومنے لگی۔ میں ہاتھ روکے حیرت سے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ گھومتی گھومتی انگلی سے نکلی اور کچھ دیر میرے منہ کے آگے گول گھومتی اونچی ہوتی گئی۔ میری گھبرائی ہوئی حالت پر سب متوجہ ہوئے' چابی ایک بگولے کی طرح کچھ دیر میرے سر پر گھومی اور پھر چشمے کے پیچھے کسی کھائی میں جا گری۔

''یہ کیا ہوا؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے تھے؟ اتنی تیزی سے چابی کیوں گھمائی؟'' بہرام کی ہذیانی آواز آئی۔

''میں نے کب اتنی زور سے گھمائی' وہ تو...... وہ تو خود ہی اتنی تیزی سے گھوم رہی تھی۔'' سب خاموش ہو کر مجھے گھورنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ تینوں آگے پیچھے چلتے چشمے تک گئے اور موبائل کی روشنیاں ڈال ڈال کر چابی ڈھونڈنے لگے۔ میں بھاری دل سے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد تینوں بھی ناکام اوپر آ گئے۔

مومن بولا۔ ''بہرام' مجھے تو لگتا ہے' چائے demon نے کوئی بددعا دی ہے ہمیں۔''

بہرام بولا۔ ''مجھے ابھی خیال آیا' میں نے ریسکیو پولیس کو فون کیوں نہیں کیا؟ میں کال کرتا ہوں' وہ کچھ کر سکے تو ٹھیک ورنہ ابو کو کال کرتا ہوں۔ اِدھر سے تو نکلیں۔'' بہرام نے فون ملایا۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہوئی کہ کال فوراً ہی مل گئی اور ''ریسکیو اسکواڈ'' دس منٹ میں پہنچ بھی گئی۔

بہرام اپنا اور ہم سب کا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔ ''میں کرنل ذکا کا بیٹا ہوں' یہ ان کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی' آج رات اُدھر اپنے گھر آئے تھے' کچھ دیر پہلے چائے پینے آئے تو گاڑی کی چابی نیچے گر گئی' آپ اگر کوئی ہیلپ کر سکیں؟'' ریسکیو اسکواڈ والے بڑی ٹارچ لے کر نیچے چشمے پر گئے۔ سب نے بہت ڈھونڈا پر چابی کو نہ ملنا تھا نہ ملی لیکن یہ ضرور ہوا کہ اُن لوگوں کے خصوصی تعاون کے باعث بہرام مین مری اسٹاپ جا کر گاڑی کی ڈپلیکیٹ چابی بنوا کر لے آیا تھا۔

•......•......•......•

خدا خدا کر کے جب ہم اسلام آباد پہنچے تو یہ فیصلہ ہوا کہ پہلے مومن کو ڈراپ کر دیں پھر میں اور بہرام' عمران کو اس کے گھر چھوڑیں کیونکہ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ہم اسے باہر سے چھوڑ کر نکل جاتے۔ بہرام کو اور مجھے زیادہ ٹینشن نہیں تھی۔ ہم دونوں گھر والوں سے مسلسل رابطے میں تھے۔ میں نے امی کو بتا دیا تھا کہ میں دوستوں کو ڈراپ کر کے گھر آؤں گا۔

عمران کے گھر صرف آنٹی تھیں۔ وہ باہر آئیں اور عمران کو جس طرح گاڑی سے اترتے دیکھا تو فوراً پوچھا۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے عمران؟''

بہرام دھیمی سی آواز میں بولا۔ ''آج صبح سے کچھ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔'' عمران نے پلٹ کر بہرام کو اور مجھے آنکھیں دکھائیں تو ذرا تسلی ہوئی کہ کچھ نارمل ہے۔

میں شام کو تھکا ہارا گھر پہنچا اور دل ہی دل میں شکر کے کلمے پڑھے۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا اور آنکھیں سرخ تھیں۔ کچھ دیر بعد میں نے امی کو اے ٹو زیڈ سب کچھ صاف صاف بتا دیا اس یقین کے ساتھ کہ امی عام عورتوں کی طرح نہ تو بحث کرتی ہیں اور نہ فوری ڈانٹ پھٹکار۔

میری بات کے دوران وہ فکرمندی سے مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔ ''ابھی کچھ کھا کر تم سونے چلے جاؤ۔ جب سو کر اٹھو گے تو تفصیلاً بات کریں گے۔''

اگلی صبح امی نے بتایا کہ وہ رات کمرے میں آئیں تو میں تیز بخار میں تھا اور سوتے میں بار بار ڈر کر جاگتا' یہی کہتا رہا کہ کتوں کو باہر نکال دیں' یہ بار بار اندر آ کر بھونکتے ہیں۔'' امی نے بتایا کہ وہ اور باجی رات بھر سرہانے بیٹھی رہیں اور مجھے دم کرتی رہیں۔

میں اگلے دو تین روز بھی بخار میں پھنکتا رہا۔ مجھے سوتے میں یہی لگتا تھا کہ میں جاگ رہا ہوں۔

تین چار روز بعد کہیں جا کر میری حالت نارمل ہوئی تو پتا چلا کہ عمران بھی گھر آ کر بہت بیمار ہو گیا تھا' اس کے سارے جسم میں شدید درد رہا' اتنا کہ وہ کئی راتیں سو نہ سکا۔ کچھ دن بعد ہم سب اکٹھے ہوئے تو مری کی رات کی خواری یاد کر کے سب اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے خوب ہنسے تھے۔

میں اُس روز شام کو گھر آیا تو گھر پر کچھ مہمان بیٹھے تھے۔ امی نے مسٹر اینڈ مسز کرنل شجاعت کے نام سے ان کا تعارف کروایا۔ ان کی بیٹی باجی کی دوست تھیں۔ وہ لوگ پہلے بھی آتے ہوں گے پر میری ملاقات نہ تھی۔ اُس وقت آنٹی' امی کو بتا رہی تھیں۔ ''شجاعت مری میں ایک گھر دیکھنے میں انٹرسٹڈ تھے' ہم اسی سلسلے میں مری گئے ہوئے تھے واپسی میں سوچا' آپ کی طرف ہوتے جائیں۔''

"یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا' اس دور میں مصروفیات ہی کچھ ایسی ہیں کہ وقت نکالنا مشکل ہوجاتا ہے۔" امی بولی تھیں۔

انکل کہنے لگے۔ "ایک کوٹھی بہت ہی اچھے داموں فروخت ہورہی ہے' یہ کوٹھی مال روڈ سے زیادہ دور نہ ہونے کے باوجود بے حد پرسکون لوکیشن میں ہے۔ کوئی شور شرابہ نہیں۔ پہاڑوں کے بیچ میں سڑک ہے اور آخر سے ذرا پہلے D-87 ہے very well kept."

"تو پھر بات بنی کوئی؟" امی نے پوچھا۔

"بھابی! کوٹھی تو بہت خوبصورت اور آرام دہ ہے' پر مسئلہ یہ ہے' اس کے ساتھ والی کوٹھی "haunted" مشہور ہے۔ actually' وہ کوٹھی کرنل ذکا کے پاس ہے' وہ میری ہی یونٹ کے تھے۔ پہلے وہ کوٹھی ان کے سسر حیدر قریشی کے پاس تھی۔ کہتے ہیں' قریشی صاحب کی زندگی تک تو کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔" پھر ذرا رکتے ہوئے بولے۔ "میں تو ان چیزوں پر believe نہیں کرتا' پر سننا تو پڑتا ہے' خاص طور پر جب عمر بھر تنکا تنکا جوڑ کر گھر خریدنا ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ قریشی صاحب اور ان کی بیگم کینیڈا بیٹے کے پاس شفٹ ہوگئے تو یہ کوٹھی بہت عرصہ خالی رہی' بعد ازاں ان دونوں کے یکے بعد دیگرے انتقال کے بعد دیگر جائیداد کے ساتھ یہ کوٹھی کرنل ذکا کی بیگم کے حصے میں آئی پر یہ برسوں خالی ہی رہی' کوئی ایک چوکیدار وہاں رہتا ہے' جس کی حرکات وسکنات کافی پراسرار ہیں۔ کبھی کبھی آدھی رات کو پہاڑیوں پر کھڑا عورتوں سے باتیں کرتا دکھائی دیتا ہے' کبھی کسی رات وہاں اس قدر کتے بھونکتے ہیں کہ اردگرد کے رہنے والوں کا سونا محال ہوجاتا ہے۔" میں نے امی کی طرف دیکھا' وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔

انکل ہنستے ہوئے بولے۔ "چوکیدار رات کو عورتوں سے باتیں کرے یا آدمیوں سے' ہمیں کیا سروکار لیکن کتوں کے بھونکنے والی بات نے پریشان کردیا ہے۔ ہل اسٹیشن پر بھی سکون نہ ملا تو جانے کا فائدہ؟ لوگ بتا رہے تھے کہ جن روحوں یا بدروحوں کے وہاں 'ڈیرے' ہیں' وہ "outsiders" کو پسند نہیں کرتے۔ کچھ لوگ تو صاف صاف کہتے ہیں کہ وہاں کا چوکیدار "possessed" ہے' بدروحوں میں رہ رہ کر خود بدروح بن گیا ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگے۔ "بیٹے' میرا نام تو شجاعت ہے' میں تو گھر لینے کو تیار ہوں' پر نیند...... نیند کا کیا ہوگا؟" اس بات پر سب ہنسنے لگے۔

آنٹی بولیں۔ "شجاعت' آپ ڈیلر کو صاف منع کردیں' اس نے تو ہمیں کوٹھی کے "haunted" ہونے کا بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ سب تو نجانے کیا کیا باتیں کرتے رہے تھے اور مجھے بیٹھے بیٹھے چاچا demon کی آنکھیں یاد آتی رہیں اور میں سوچتا رہا کہ بہرام نے مری کے نام پر خوامخواہ کی پھنے خانی دکھائی۔ اگر اس روز عمران کو کچھ ہوجاتا' اگر گاڑی......؟

انکل' آنٹی کچھ دیر اور بیٹھے پھر چلے گئے۔ ہم نے خدا حافظ کے بعد گیٹ بند کیا تو امی بہت سنجیدگی سے بولیں۔ "شکر کرو' اللہ نے تم سب کی حفاظت فرمائی۔ یہ زندگی کے "lessons" ہوتے ہیں۔"

میرا دل شرمساری میں ڈوب گیا۔ ہم کس ڈھٹائی سے جھوٹ بول کر گئے تھے کہ گاڑی بہرام کا ڈرائیور لے کر جائے گا۔ اگر واقعی کوئی ایک بڑا ساتھ ہوتا......

"اف D-88" تاریک رات میں چمکیلی آنکھوں اور چمکیلی سیاہ کھال والے سیاہ آٹھ کتے نظروں کے سامنے آگئے۔ میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا اور سوچنے لگا۔ 'شکر ہے' آٹھ کتے تھے' اگر اٹھاسی ہوتے تو؟'



رضوان قیوم



انوکھی سزا

میں آنکھیں بند کیے اُس کا منتظر تھا اور پھر اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ میں نے فوراً اپنی آنکھوں کو کھولا تو میری گھگھی بندھ گئی۔ میری نگاہوں کے سامنے اب لڑکی نہیں بلکہ......

نفس کے ایک غلام کا قصہ' اسے اپنی ہوس کی عبرت ناک سزا ملی تھی

مجھے یہ کہانی ایک ایسے بزرگ نے سنائی تھی جو مجھے دورانِ سفر بس میں ملے تھے۔ ہماری بس کی منزل ایبٹ آباد تھی۔ اس سفر کے دوران سنائی گئی کہانی میں انہی بزرگ قربان علی کی زبانی پیش کررہا ہوں۔

"میں 1943ء میں امرت سر شہر میں سائیکل





رکشہ چلایا کرتا تھا۔ میں اپنا یہ سائیکل رکشہ زیادہ تر ریلوے اسٹیشن سے بازار شیخاں کے درمیان چلاتا تھا۔ سخت جاڑے کے دنوں میں اُس روز میں معمول کے مطابق ریلوے اسٹیشن پر رات دس بجے پشاور سے امرت سر آنے والی ٹرین کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس ٹرین کا کوئی نہ کوئی مسافر مجھے ایک اچھی سواری کی صورت میں ضرور مل جاتا تھا۔ مذکورہ ٹرین اُس رات اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آدھ گھنٹہ لیٹ آئی تھی۔ میں اپنے آپ کو کمبل میں لپیٹے رکشہ میں بیٹھا اپنے روٹ سے متعلقہ سواری کا انتظار کرنے لگا لیکن میری جانب میرے روٹ کی کوئی سواری نہ آئی اور رفتہ رفتہ پلیٹ فارم کی جانب سے مسافروں کی آمد کم ہونے لگی مگر میری نگاہیں امید کے عالم میں پلیٹ فارم پر لگی ہوئی تھیں اور پھر میری امید اُس وقت بر آئی جب مجھے ایک انتہائی خوبصورت تقریباً بیس' بائیس سال کی لڑکی اپنے سائیکل رکشہ کی جانب آتی نظر آئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سفری بیگ تھا۔ وہ جب میرے قریب آئی تو وہ دیکھنے میں مجھے پٹھانی لگی۔ میرے خیال کے مطابق غالباً سرحد کے کسی علاقہ سے آئی تھی۔ وہاں موجود اور لوگوں کی نگاہیں بھی اُس پر جمی ہوئی تھیں۔

اُس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ''قریش پورہ جاؤ گے؟'' اور میرے ہاں کہنے پر وہ کرایہ طے کیے بغیر بڑی بے باکی سے میرے سائیکل رکشہ میں بیٹھ گئی تھی۔ میں نے سائیکل رکشہ چلاتے ہوئے کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ وہ تو میری توقعات سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ میرے دل نے چاہا تھا کہ میں اُس سے کچھ بات کروں لیکن تعظیم سواری کا احساس مجھے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔

''آپ کا رکشہ بہت آہستہ چل رہا ہے۔'' اُس نے انتہائی شیریں آواز میں کہا تھا۔ میں دلی طور پر بہت خوش ہوا تھا کہ اُس نے اس طرح مجھے بات چیت کا آغاز کرنے کے لیے اچھا موقع فراہم کر دیا ہے۔

میں نے جواباً کہا تھا۔ ''بی بی! میں جان بوجھ کر سائیکل رکشہ اس لیے آہستہ چلا رہا ہوں کہ آپ کو جھٹکے محسوس نہ ہوں کیونکہ اس سڑک میں کھڈے بہت ہیں۔ میں آپ کو تکلیف سے بچانا چاہ رہا ہوں۔''

اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''اب میں اتنی کمزور بھی نہیں ہوں۔'' اب وہ بات چیت میں کھلنے لگی تھی۔ میں نے اپنا سائیکل رکشہ اور آہستہ کر لیا تھا کہ اُس کی منزل دیر سے آئے اور میں اس حسین پٹھانی دوشیزہ سے زیادہ سے زیادہ باتیں کر سکوں کیونکہ باتیں کرتے اور مسکراتے ہوئے اُس کے گلابی گالوں پر جو ڈمپل پڑ رہا تھا' وہ میرے دل پر گھاؤ کر رہا تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ لڑکی میرے پوچھے بغیر اپنے بارے میں گفتگو کیے جا رہی تھی۔

اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں قریش پورہ میں ایک سرکاری ملازم کی بیوی بن کر آئی ہے۔ ''میں یہاں اکیلی ہوتی ہوں۔ میرا خاوند جالندھر میں اپنی ڈیوٹی دے رہا ہے۔'' اُس نے جماہی لیتے ہوئے مجھ سے نشیلی نگاہیں ملاتے ہوئے کہا تھا۔

لڑکی کے اس انداز پر میرے اندر چھپا شیطان مجھے اس امر پر اکسانے لگا تھا کہ میں اُس کی طرف سے برتی جانے والی راہ بے تکلفی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے اپنے جال ہوس میں پھنساؤں۔ میرا دل مجھ سے بار بار کہہ رہا تھا کہ میرے لیے یہ بہت

آسان ہدف ہے۔ میں اُسے بلا کسی مشکل اپنی ہوس کا نشانہ بنا سکتا ہوں۔ مجھے یہاں یہ اقرار کرنے میں کوئی تعامل نہیں کہ میں اس علت کا دیرینہ شکار تھا اور میں یہ گھناؤنا فعل ایک خوبصورت بیوی ہونے کے باوجود چوری چھپے سرانجام دیتا تھا۔

میں نے صورت حال جاننے اور اپنا مقصد آسان بنانے کے لیے اس سے پوچھا تھا۔ ''آپ اکیلی کہاں سے آ رہی تھیں؟ اور آپ کو کیا تنہا سفر کرنے سے ڈر نہیں لگتا؟''

''میں اپنے والد کی بیماری کی وجہ سے اپنے گھر گئی تھی اور اب تنہا سفر سے کیا ڈرنا' جب زندگی ہی زیادہ تر تنہا گزارنی پڑ رہی ہے' ویسے مجھے ذرا یہ تو بتائیں کہ کیا آپ شادی شدہ ہیں؟''

اُس کے اِس اچانک کیے گئے سوال پر میں چونک گیا تھا۔ میں حالانکہ شادی شدہ تھا لیکن میں نے اُس سے جھوٹ بولا تھا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔

''کاش آپ سے کچھ عرصہ قبل میری ملاقات ہو جاتی تو میں آپ سے اپنی زندگی منسلک کر دیتی مگر اب مجبوری یہ ہے کہ آپ شادی شدہ ہیں۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ میری شادی مجبوری کا سودا تھی۔ میرا خاوند مجھ سے کافی بڑی عمر کا اور بدشکل ہے' مجھے اُس سے نفرت ہے۔'' اور پھر باتوں باتوں میں اس نے مجھے ایک بار پھر یہ احساس دلایا تھا کہ ویسے بھی میں اکیلی ہوں۔''

شیطان میرے وجود میں اپنا گھر کر چکا تھا۔ سخت جاڑے کے دنوں میں قریش پورہ کے باسی اپنے اپنے بستروں میں دبکے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اس زمانے میں لوگ ویسے بھی جلدی سو جایا کرتے تھے۔ اُس نے مجھے ایک پرانے سے مکان کے پاس رکنے کا اشارہ کیا تھا' گریبان سے چابی نکالی تھی اور مکان کا تالا کھولنے

زندگی

جو مانگے زندگی
اُسے میسر نہیں
بنا مانگے ہم
جیے جا رہے ہیں

ثمرین ادریس۔ کراچی

کے بعد مجھے چپکے سے اوپر والی منزل کی سیڑھیاں چڑھنے کو کہا تھا۔

میں چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک کمرے میں پہنچا تھا جو کہ دیکھنے میں بالکل ویران سا تھا' وہاں صرف ایک بڑی چارپائی اور ٹین کے بکسے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ پہلی نگاہ میں مجھے ماحول بڑا عجیب اجاڑ سا لگا تھا لیکن میرے ذہن میں شیطان ہوس کے نشے کی صورت میں ایسا چڑھا ہوا تھا کہ میں نے اس وقت اُس ماحول کا خاص نوٹس نہ لیا تھا۔

اُس نے مجھے اُس چارپائی پر چڑھ جانے کے بعد ایک شیطانی انگڑائی لیتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں اور ہاں' تم اپنی آنکھیں اُس وقت تک بند رکھنا جب تک میں تمہاری بانہوں میں نہیں آ جاتی۔'' میں نے اس کی بات مان کر فوراً ہی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

میں آنکھیں بند کیے اُس کا منتظر تھا اور پھر اچانک ہی اُس نے آ کر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میری ناک سے کسی بچے کے سڑے ہوئے پوتڑے کی سی بدبو ٹکرائی تھی' میں نے فوراً ہی اپنی بند آنکھوں کو کھولا تھا تو میری گھگھی بندھ گئی تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے اب کچھ دیر پہلے والی وہ خوبصورت لڑکی نہیں بلکہ انتہائی بھیانک' جھریوں کے جالوں سے بھرے چہرے والی کالی سیاہ رنگت لیے ایک چڑیل قسم کی بوڑھی عورت کھڑی تھی۔



بلندی پہ اک گھر بنانے لگا ہوں
ہواؤں کو میں پر بنانے لگا ہوں

ترے در پہ سر کو جھکا کر میری جاں
میں اپنا مقدر بنانے لگا ہوں

مری کوششوں کو داد دے تُو
میں قطرے سے ساگر بنانے لگا ہوں

نگاہوں میں تیری جو جانِ غزل ہو
وہ مصرعہ میں سُندر بنانے لگا ہوں

مری سوچ پر سوچ اِک روز جاناں
زمیں کو میں امبر بنانے لگا ہوں

غریبوں سے یہ وارثِ شہر بولا
میں لڑکے کو افسر بنانے لگا ہوں

ستم ہنس کے سہہ لوں گا سینے پہ راناؔ
میں دل کو قلندر بنانے لگا ہوں

قدیر راناؔ

اس کے کالے پیلے بدبودار دانتوں سے نیلے رنگ کا پیپ مائل لعاب نکل رہا تھا۔ اس نے مجھے اس سختی سے بھینچا ہوا تھا کہ ایسا لگتا تھا جیسے میری جان نکل جائے گی۔ مجھے اس وقت جتنی سورتیں، کلمے آتے تھے، میں نے پڑھنا شروع کر دیئے تھے اور پھر جیسے ہی اس چڑیل نما بلا نے مجھے اپنے شکنجے سے آزاد کیا تھا، میں ہانپتا کانپتا الٹے پاؤں سیڑھیوں سے نیچے بھاگا تھا، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ چڑیل میرا پیچھا کرتی آ رہی ہے۔ قصہ مختصر میں اس گھر سے باہر آ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

مجھے ہوش اُس وقت آیا تھا جب کسی نے میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے پھر میں نے دیکھا تھا کہ میرے اردگرد خاصے لوگ موجود ہیں۔ میں نے انہیں گھما پھرا کر اس چڑیل نما بلا اور اس گھر کے بارے میں بتایا تھا تو وہاں موجود ایک بڑے میاں بولے تھے۔

''تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے، یہ مکان تو برسوں سے ویران، بے آباد پڑا ہوا ہے، اس کی ملکیت کے لیے تو ہائی کورٹ میں دو پارٹیوں کے درمیان مقدمہ لگا ہوا ہے۔ ذرا غور سے دیکھ، اس مکان کے دروازے پر تو نجانے کتنے سالوں سے دو موٹے موٹے جرمن تالے پڑے ہوئے ہیں۔''

•......•......•......•

اپنی کہانی سنانے کے بعد مجھے اُن بزرگ نے اپنی جانب حسرت بھری نظروں سے تکتا پا کر کہا تھا۔

''رضوان میاں! تمہیں میری اس کہانی پر یقین نہیں آیا ناں؟ کسی کو بھی نہیں آتا لیکن میں بھلا اپنے ساتھ پیش آئے حقیقی واقعے کو کیسے جھٹلاؤں؟ کیونکہ اس چڑیل نے میرے جسم کو اس برے طریقہ سے جکڑا تھا کہ اس کے بعد میں اپنی مردانہ قوت سے محروم ہو گیا تھا اور آج تک ہوں......''



جادو ٹونے کی حقیقت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے انسان کو تباہ و برباد کر دینے والے اس عمل سے جڑی ان کہانیوں کے کچھ کردار ابھی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں

نفیسہ فضل



شیطانی قوتیں

قبرستان میں ہو کا عالم تھا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھ رہا تھا، اچانک کوئی چیز میرے سر پر سے گزر گئی۔ میں ڈر گیا تب ہی حافظ صاحب کی آواز سنائی دی......

جادو ٹونے اور سفلی علم کے شیطانی چکروں میں پھنسے ایک گھر کا قصہ



یہ جو کہانی یا قصہ جسے میں قارئین کی نذر کر رہی ہوں‘ میرے بچپن کا ہے مگر اسے آپ میرے بڑے بھائی جہانگیر خان کی زبانی سنیے۔

”غالباً یہ 1962ء کا ذکر ہے‘ ہم دہلی کالونی میں رہتے تھے‘ آس پاس کچے پکے مکانات تھے جہاں دہلی سے ہجرت کر کے آنے والے اور انڈیا کے مختلف گاؤں‘ شہروں کے لوگ آباد تھے۔ اُس زمانے میں آپس میں پیار و محبت بہت تھا۔ ہمارے گھر کے ایک طرف ماسٹر جی کی فیملی تھی‘ سامنے کے گھر میں لیاقت نامی لڑکا اور اس کے دادا دادی رہتے تھے‘ ان کے برابر میں آپا بیگم اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ سکونت پذیر تھیں۔ اُن سے ذرا آگے کے مکان میں خاص دہلی سوداگران مور والوں کی بیٹی داماد زاہدہ اور خلیق اپنے سات آٹھ بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ محلے میں سب ہی ایک دوسرے سے بہت خلوص اور محبت سے ملتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہم سب ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔

ہماری نانی اماں ذرا سوشل قسم کی خاتون تھیں۔ اُس زمانے میں بیگم رعنا لیاقت علی کی این جی او ”اپوا“ کے نام سے تھی۔ نانی اماں اس کی ممبر تھیں۔ انہوں نے محلے میں بھی ایک سماجی تنظیم بنائی ہوئی تھی۔ ”انجمنِ مفادِ نسواں“ کے ذریعے عورتوں کے مسائل حل کیے جاتے تھے‘ غریبوں میں مفت آٹا‘ گھی‘ دودھ تقسیم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے زاہدہ خالہ کا بھی ہمارے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ زاہدہ خالہ کا میکہ کافی امیر تھا۔ ان کے میاں اپنے سسرال سے کم کم ہی ملتے تھے۔ خلیق خالو کی صدر بازار میں گھڑیوں کی دکان تھی۔

صبح دس گیارہ بجے جب تمام گھریلو خواتین گھر کے کام کاج سے فارغ ہوتیں‘ بچے اسکول اور مرد حضرات اپنے اپنے کام پر چلے جاتے تو سب کی سب ہمارے گھر اکٹھی ہو جاتی تھیں اور خوش گپیاں ہوتی تھیں۔ ہمارے بھائی جان کونسلر بنے تو گھر میں اور بھی رونق ہوگئی۔ کسی کا کچھ مسئلہ‘ کسی کا کچھ‘ ہر وقت گھر میں میلہ سا لگا رہتا تھا۔ خالہ زاہدہ کو ہماری بڑی خالہ سے کچھ زیادہ ہی محبت ہوگئی تھی۔ جب بڑی خالہ بیوہ ہوئیں تو محلے کی عورتیں ہر وقت اُن کے پاس رہتی تھیں۔ خالہ کو کوئی بھی اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔ زاہدہ خالہ اور لیاقت کی دادی تو اکثر اپنا دوپہر کا کھانا لے کر آجاتی تھیں۔ سب لوگ ساتھ کھانا کھاتے پھر شام چار بجے چائے پی کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ بسا اوقات رات میں بھی سب آجاتے تھے۔ زاہدہ خالہ اور اُن کے بچے بے حد خوبصورت تھے‘ سب ہی اُن سے بہت پیار کرتے تھے۔ زندگی اسی طرح اپنی ڈگر پر چل رہی تھی کہ زاہدہ خالہ کے گھر میں عجیب و غریب واقعات شروع ہوگئے۔ ابتدا چھٹی والے دن سے ہوئی تھی۔ زاہدہ خالہ نے خوب مزے مزے کے کھانے بنائے تھے۔ دسترخوان لگایا اور آواز لگائی۔

”جس جس کو بھوک لگی ہے‘ آجاؤ۔“ ابھی بچوں نے کھانا شروع کیا تھا کہ دسترخوان خالی ہوگیا۔ خالہ نے اور کھانا لگایا پھر صفایا ہوگیا یہاں تک کہ پتیلیاں خالی ہوگئیں۔

خالہ حیران ہوتے ہوئے بولیں۔ ”اے بچو......! کیا جن اتر آیا ہے پیٹ میں؟“

پھر تو اکثر ایسا ہونے لگا‘ کبھی گھر سے پیسے غائب ہو جاتے تو وہ اپنے بیٹوں نسیم اور نعیم پر شک کرتیں جو کہ دس اور بارہ برس کے تھے۔ زاہدہ خالہ کے گھر شام کا کھانا بھی دوپہر کے کھانے کے ساتھ پکتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ پتیلیاں خالی ملتیں۔ وہ شروع میں یہی سمجھتی رہیں کہ بچے کھانا کھا جاتے ہیں۔ اُن کی بڑی بہنیں گھر میں ہوتی تھیں جن کی عمریں سولہ اور چودہ سال کی تھیں۔ وہ بتاتی تھیں۔

”کسی نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔“

اُس روز تو حد ہوگئی جب اُن کی بیٹی بھاگتی ہوئی ہمارے گھر آئی۔ ”خالہ......! جلدی چلیں‘ امی بلا رہی ہیں۔“ جب نانی اماں اور خالہ وہاں پہنچے تو دیکھا‘ کچن میں خالی برتن ہیں اور غلاظت بھری ہوئی ہے۔

نانی اماں بولیں۔ ”یہ تو کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ تم کسی مولوی کو دکھاؤ۔“

”نسیم کے ابا تو ان باتوں پر یقین نہیں کرتے اور میں کسی مولوی کو بھی نہیں جانتی۔“ خالہ زاہدہ نے پریشانی سے کہا۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کمرے میں کچھ گرنے کی آواز آئی۔ سب لوگ فوراً کمرے میں گئے تو دیکھا‘ قرآنِ کریم کمرے کے فرش پر تھے۔ مارے خوف کے سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آپا نے لپک کر قرآنِ کریم اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ سب حیران و ششدر کھڑے تھے۔

نانی اماں بولیں۔ ”زاہدہ......! یہ سب شیطانی کام ہیں......“ اتنے میں زور زور سے ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بچے ڈر کر رونے لگے جبکہ بڑوں کا بھی خوف سے برا حال تھا۔ ان حالات میں خالہ زاہدہ بچوں کو لے کر اپنی ماں کے گھر چلی گئیں مگر کب تک وہاں رہتیں‘ اپنے گھر تو آنا ہی تھا۔ گھر آئیں تو ایک ایک کر کے پورا گھر بیمار ہوگیا۔ بے چارے بچے تین چار روز میں کمہلا کر رہ گئے۔ لگتا تھا‘ خون تو اُن کے بدن میں ہے ہی نہیں۔ سرخ و سفید چہروں پر زردی چھا گئی تھی‘ ساتھ ہی ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگیا‘ خلیق خالو کی دکان جو کہ بہت اچھی چلتی تھی‘ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آمدنی کم ہونے لگی۔ گھر میں عجب پریشانی تھی‘ ہر وقت خوف و دہشت چھایا رہتا۔ رات بھر چھت پر دوڑتے گھوڑوں اور ہنہنانے کی آوازیں گونجتی رہتیں۔ گھر والوں کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ اب تو خالو بھی کسی اللہ والے کی تلاش میں تھے۔ دن میں تو زاہدہ خالہ بچوں کو لے کر بمع اپنا کھانا ہمارے گھر آجاتی تھیں یا پھر اکثر اپنے میکے چلی جاتیں۔

میری عمر اُس وقت اٹھارہ یا انیس برس تھی۔ میٹرک کے بعد میں ایک پرائیویٹ فرم میں بطور ٹائپسٹ جاب کرتا تھا۔ والد صاحب کی وفات کے بعد چاروں بہن بھائیوں اور والدہ صاحبہ کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ شام کو آفس سے آکر بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا پھر مغرب کی نماز کے بعد میں ایک مولوی صاحب حافظ اسماعیل کے پاس چلا جاتا تھا۔ دراصل مجھے رُوحانی علوم سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ حافظ صاحب بہت اچھے اور پہنچے ہوئے عامل تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ وہ بہت پیار و محبت سے مجھے رُوحانی علم کے بارے میں بتاتے تھے۔

اُس روز زاہدہ خالہ کے بیٹے نسیم و نعیم میرے پاس پڑھنے آئے تو اُن کی حالت دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے خالہ زاہدہ کی خیریت معلوم کی تو نسیم نے کہا۔ ”بھائی جان! دو دن سے امی آپ کو بلا رہی ہیں‘ میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔ امی کہہ رہی تھیں‘ جہانگیر سے کہنا‘ گھر ضرور آئے۔“

دراصل انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ میں حافظ اسماعیل کے پاس جاتا ہوں۔ مغرب کی نماز کے بعد رات کے کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنی والدہ کے ساتھ خالہ زاہدہ کے یہاں گیا۔ گھر میں عجب وحشت تھی۔ میں نے اپنے گھر سے نکلتے ہوئے اپنا اور والدہ کا حصار باندھ لیا تھا کیونکہ مجھے اسماعیل صاحب کی خاص ہدایت تھی۔ جب میں اُن کے گھر پہنچا‘ تب تک خالو بھی آچکے تھے۔

انہوں نے کہا۔ ”بیٹا جہانگیر......! ہمیں پتہ چلا

ہے کہ تم کسی عامل کے پاس جاتے ہو۔ بیٹا......! اُن سے ہمارے مسئلے کا حل معلوم کرو۔"

"خالو......! میں اُن کے پاس ہی جا رہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔" میں نے کہا۔

جب ہم حافظ صاحب کے پاس پہنچے تو وہ عبادت میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد وہ فارغ ہوئے تو مسکراتے ہوئے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ "تو آپ آ ہی گئے حالانکہ آپ کو تو بہت پہلے آنا چاہیے تھا۔ آپ کے گھر کا بچہ بچہ اس شیطانی چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ بہرحال کل نمازِ مغرب کے بعد ہم آپ کے گھر آئیں گے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "جہانگیر میاں......! کل آپ نماز کے بعد آ کر ہمیں خلیق صاحب کے گھر لے چلیے گا۔"

اگلے دن شام کو جب میں دفتر سے واپس آیا تو پتہ چلا' خالہ زاہدہ کی پانچویں نمبر کی بیٹی عائشہ عرف عاشی گھر سے غائب ہے' عاشی سب بہن بھائیوں میں بے انتہا خوبصورت بچی تھی' دلکش نقوش' سرخ سفید رنگت' سنہرے بال' ہاتھوں میں ہر وقت مہندی لگی رہتی تھی۔ وہ ننھی پری لگتی تھی۔ خالہ خالو خود بہت حسین تھے۔ خالہ کی بڑی بڑی موٹی آنکھوں میں بہت کشش تھی۔ میں اُسی وقت حافظ صاحب کے پاس پہنچا اور انہیں عاشی کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تو وہ مسکرائے۔

"گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب ان ہی خبیث جنات کی کارستانی ہے مگر اس کے لیے ہمیں اپنے استاد مولانا حنیف کی مدد درکار ہے اور ہمیں عاشی کے والدین کے ساتھ اُن کے پاس اسی وقت جانا ہوگا۔"

"مولانا صاحب کی رہائش کہاں ہے؟" میں نے پوچھا تھا۔

"قریب ہی گذری قبرستان کے پاس ہی وہ رہتے ہیں۔" آج گذری میں بڑی بڑی کوٹھیاں ہیں لیکن پچاس سال پہلے وہ ویران علاقہ تھا۔ وہاں جو قبرستان تھا' اب ختم ہو چکا ہے۔ ہم لوگ اسماعیل صاحب کے ہمراہ مولانا حنیف صاحب کے پاس پہنچے۔

انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ "مجھے علم ہو گیا تھا' آپ لوگ آ رہے ہیں لہٰذا پہلے سے ہی انتظام شروع کر دیا تھا۔ آپ سب بیٹھ کر دُرودِ پاک کا وِرد کریں اور حافظ صاحب! آپ میرے پاس آ جائیں۔" پھر مولانا حنیف اور حافظ صاحب نے اپنا عمل شروع کر دیا اور ہم تینوں دُرود شریف کا وِرد کرنے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد مولانا حنیف صاحب نے آنکھیں کھولیں اور مولانا اسماعیل صاحب اور مجھے حکم دیا کہ باہر جاؤ' خالو خلیق کو بھی ہمارے ساتھ جانے کو کہا گیا۔ ہم نے باہر نکل کر دیکھا' سامنے ہی چھوٹی سی پہاڑی پر عاشی کھڑی تھی۔ خالو نے دوڑ کر اُسے گود میں اٹھا لیا اور گلے لگا کر رونے لگے۔ جب ہم اندر آئے تو زاہدہ خالہ سجدے میں تھیں اور زار و قطار رو رہی تھیں۔ عاشی کو کچھ یاد نہیں تھا کہ اُسے کون لے گیا تھا یا وہ کہاں تھی؟ مولانا صاحب نے منع کیا تھا' اُس سے کچھ نہ پوچھا جائے۔

ہم سب مولانا کا شکریہ ادا کر کے گھر واپس آئے تو اسماعیل صاحب نے بتایا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں تھا پھر باقی کا کام مولانا حنیف نے کیا' اُن کے عمل سے خالہ کا گھر خبیث جنات سے پاک ہو گیا۔ مولانا نے اس کام کے لیے کچھ ضروری چیزوں کا خرچہ لیا۔ اس کے علاوہ کوئی پیسہ نہ لیا۔ اُس زمانے میں سچے اور اچھے لوگ ہوتے تھے۔ آج تو جگہ جگہ جعلی عامل اپنی دکان سجائے بیٹھے ہیں اور خوب لوٹ رہے ہیں۔ بہرحال زاہدہ خالہ کے گھر میں سکون ہو گیا۔ عجیب واقعات ہونا بند ہو گئے اور خالو کی دکان بھی پہلے کی طرح چلنے لگی' یوں حالات بہتر ہوتے چلے گئے۔ اسی دوران بڑی بیٹی نگہت کی منگنی ہو گئی۔ اگلے برس شادی ہونا طے پائی۔

ایک دن میں عشاء کے بعد حافظ صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ خالہ زاہدہ کا بیٹا نسیم گھبرایا ہوا آیا۔

"آپ لوگوں کو امی نے اسی وقت بلایا ہے۔" ہم نے جو نسیم کی حالت دیکھی تو فوراً اُس کے ساتھ چل دیئے۔ جب اُن کے گھر پہنچے تو خالہ نے کمرے کی دیواریں دکھائیں جن پر تازہ تازہ خون کے چھینٹے تھے۔ گھر والوں پر خوف طاری تھا۔ ہم صورتِ حال پر غور کر رہے تھے کہ کسی نے باہر سے زاہدہ خالہ کا نام لے کر پکارا۔ جیسے ہی وہ جانے لگیں تو حافظ صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا پھر دوسری آواز آئی تو حافظ صاحب کو جلال آ گیا۔

وہ چیخ کر بولے۔ "تیری اتنی ہمت تو نے ہماری موجودگی میں حملہ کیا؟" اور پھر حافظ صاحب نے زور زور سے قرآنی آیات کا وِرد شروع کر دیا۔ مجھے بھی اشارے سے پڑھنے کو کہا۔ گھر والے اور بچے دم سادھے تھے۔ دس منٹ بعد ہی صحن سے ایسی آواز آئی جیسے کچھ گر کر ٹوٹا ہے۔ بچے گھبرا کر رونے لگے پھر ہم حافظ صاحب کے کہنے پر باہر گئے۔ گیس بتی کی زرد روشنی میں دیکھا کہ مٹی کی ہنڈیا ٹوٹی ہوئی پڑی تھی جس میں کپڑے کی گڑیا' ثابت ماش کی دال' ہڈیاں' تعویذ اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

حافظ صاحب بہت دیر تک پڑھائی کرتے رہے اور پھر بولے۔ "بیٹا......! آج تم بچ گئیں ورنہ نجانے تمہارا کیا حشر ہوتا۔ شکر کرو اس ذاتِ باری کا کہ تم نے ہمیں بلایا اور ہم اس وقت یہاں موجود ہیں۔ تم پر سفلی علم کا وار ہوا ہے۔" گڑیا میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر حافظ صاحب نے کہا۔ "اگر کبھی بھی کسی کا نام لے کر آواز آئے تو تین آواز کے بعد دیکھا کرو۔ یہ چیزیں تین آوازیں دیتی ہیں۔" حافظ صاحب کے پوچھنے پر پتہ چلا کہ زاہدہ خالہ کے بہنوئی سے بہت عرصہ سے تعلقات کشیدہ تھے۔ دراصل ان کے بہنوئی ان پر عاشق تھے اور ان سے ناجائز تعلقات رکھنا چاہتے تھے۔ اب بے چاری زاہدہ خالہ کا حال آسمان سے گرا' کھجور میں اٹکا کے مصداق تھا۔

حافظ صاحب نے کچھ پڑھ کر تمام چیزیں ایک تھیلے میں ڈالیں پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "جہانگیر بیٹا......! یہ اسی وقت قبرستان میں دفن کرنا ہے۔" پہلے تو میں ڈر گیا کہ اس وقت اکیلے قبرستان کیسے جاؤں؟ حافظ صاحب نے میرا حصار باندھا اور فرمایا۔ "اب تم بے دھڑک چلے جاؤ۔" دل میں خوف تو بہت تھا مگر استاد کا حکم اور کام سیکھنے کا شوق خوف پر غالب آ گیا۔ میں حافظ صاحب کا بتایا ہوا وِرد کرتا ہوا سائیکل پر قبرستان کی طرف چل پڑا۔

قبرستان میں ہو کا عالم تھا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھ رہا تھا' اچانک کوئی چیز میرے سر پر سے گزر گئی۔ میں ڈر گیا اور وہیں رُک گیا۔ دوبارہ پھر وہی چیز آئی' دیکھا تو بڑی سی چمگادڑ تھی' تب ہی حافظ صاحب کی آواز سنائی دی۔

"بیٹا! گھبرانا نہیں' یہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی' تجھے روکا جا رہا ہے۔" آواز سن کر مجھ میں ہمت آ گئی اور میں نے آگے بڑھ کر وہ تمام سامان ایک گڑھا کھود کر اس میں دبا دیا۔ جلد ہی واپسی کے لیے پلٹا تب ہی ایک خوفناک چیخ فضا میں گونجی جیسے کوئی شدید اذیت میں ہو۔ میں نے سائیکل سنبھالی اور تیزی سے گھر کی جانب چل پڑا۔ حافظ صاحب میرے انتظار میں وہیں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جب اُن کی پڑھائی مکمل ہوئی تو وہ خالو اور خالہ زاہدہ سے مخاطب ہوئے۔

''بیٹا......! آپ لوگوں کو دو طرف سے شیطانی قوتوں کا مقابلہ کرنا ہے اور ہم اس جنگ میں اللہ عزوجل کی مہربانی سے آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ رحمٰن و رحیم ہے' وہی اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ آپ دین دار لوگ ہیں۔ وہ مالکِ دو جہاں آپ پر اپنا خاص کرم فرمائے گا انشاء اللہ! آپ بے فکر رہیں' میں اس سلسلے میں کل ہی اپنے استادِ محترم مولانا حنیف صاحب سے رجوع کرتا ہوں۔'' تسلی و تشفی دے کر حافظ صاحب رخصت ہو گئے۔ میں اپنے گھر آ گیا۔

تیسرے دن ہی زاہدہ خالہ نے بتایا کہ صبح سویرے اُن کے دروازے پر کالی ماش کی دال پڑی تھی۔

''خالہ......! یہ سب کالا علم ہو رہا ہے۔ آپ فکر نہ کریں' حافظ صاحب اس کا توڑ کر رہے ہیں۔ آپ کو کوئی نقصان نہیں ہو گا انشاء اللہ!'' میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

کچھ عرصہ تو سکون سے گزرا۔ اُس دن نمازِ مغرب کے بعد میں حسبِ معمول حافظ اسماعیل صاحب کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ نسیم و نعیم گھبرائے ہوئے آئے۔ ''جلدی گھر چلیے' امی نے ابھی اسی وقت بلایا ہے۔'' خوف سے دونوں کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ ہم فوراً اٹھ گئے کہ ضرور کوئی معاملہ ہوا ہے۔ گھر پہنچنے پر دیکھا کہ صحن میں کالے بکرے کی سری پڑی ہوئی تھی۔ سب بچے اور خالہ کمرے میں سہمے بیٹھے تھے۔

حافظ صاحب نے فوراً اپنا عمل شروع کر دیا پھر ایک تھیلہ لے کر وہ سری اس میں ڈال کر بولے۔ ''جہانگیر بیٹا! چلو' ابھی استادِ محترم کے پاس جانا ہے۔'' ہم فوراً گنذری قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ پہلے حافظ صاحب نے اس بکرے کی سری کو دفن کیا پھر ہم مولانا حنیف صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

مولانا صاحب ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ ''ہم نے پہلے ہی اس کا بندوست کر لیا تھا۔ دشمن کا وار اللہ کے فضل و کرم سے خالی جائے گا۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا' اس کے بعد خالہ کے گھر کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ خالہ نے چھ ماہ بعد اپنی بڑی بیٹی نگہت کی شادی کر دی۔ چھوٹی رفعت کی منگنی ہو گئی۔ نگہت کی شادی کے ایک سال بعد اللہ تعالیٰ نے اُسے ایک بیٹی سے نوازا۔ سب بہت خوش تھے۔ پندرہ بیس دن بعد نگہت کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ ابھی ڈاکٹر کے یہاں لے جایا جا رہا تھا کہ نگہت نے آخری ہچکی لی اور اپنی جان' جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔ سب لوگ اس کی ناگہانی موت پر نوحہ کناں تھے۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کا برا حال تھا۔

کچھ عرصہ بعد ہم لوگ ملیر شفٹ ہو گئے تو زاہدہ خالہ سے ملنا کم ہی ہوتا تھا پھر سنا' خالو کا انتقال ہو گیا ہے تو ہم سب افسوس کے لیے گئے۔ خالو اپنی جواں سال بیٹی کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے۔ اُن ہی دنوں نسیم کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ لوگ بھی دہلی کالونی کا مکان بیچ کر ملیر میں ابراہیم ولاز میں آ گئے تھے۔ خالہ زاہدہ غم و الم کی تصویر بن گئی تھیں۔ خاوند اور جوان بیٹی کی موت نے انہیں نیم پاگل کر دیا تھا۔ نماز پڑھتی تھیں تو لمبے لمبے سجدے کرتی تھیں۔ ہنستی تھیں تو ہنستی رہتی تھیں۔ روتیں تو انہیں چپ کرانا مشکل ہو جاتا۔ ان کے گھر کے برابر میں چھوٹے بھائی منیر کا گھر تھا۔ اکثر آ جاتی تھیں۔ خالہ کے بہو بیٹے کا سلوک خالہ کے ساتھ بہت برا تھا۔ انہیں اکثر کمرے میں بند کر دیتے' کئی وقت کھانا نہیں دیتے تھے۔ خالہ پان شوق سے کھاتی تھیں' پان لا کر نہیں دیتے۔ منیر اور اس کی بیوی صائمہ ان کی دلجوئی کرتے' کھانا کھلاتے' پان لگا کر دیتے۔ صائمہ کے پاس پان دان تھا' وہ پان دان دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ ایک زمانہ تھا' اُن کے منہ میں پان رہتا تھا جس کی لالی اُن کے ہونٹوں پر ہر وقت رہتی تھی' ایک یہ وقت تھا کہ اپنی ہی اولاد نے اُن کا یہ حشر کیا کہ وہ پاگل سی ہو گئیں...... اُن کی زبانی اور بھی بہت سی باتیں پتہ چلیں کہ اُن کے بیٹے انہیں مارتے ہیں' کہتے ہیں' تم کمرے میں گندگی کرتی ہو۔ ایک مرتبہ اپنا بازو صائمہ اور منیر کو دکھایا کہ یہ میرے بیٹے نے زخمی کیا ہے۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ ایسا سلوک اپنی ماں کے ساتھ کیوں کرتے تھے؟ اگر اُن کا کمرا یا کپڑے گندے ہو جاتے تھے تو مارتے تھے۔ وہ آخر تو ماں تھی' اس نے بھی اُن کو پالا تھا' اُن کا گند صاف کیا تھا۔

پھر کچھ عرصہ بعد منیر نے اطلاع دی' خالہ زاہدہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ والدہ کے ساتھ ہم بھی گئے۔ اُن کے جنازے میں شرکت کی۔ بعد میں میری والدہ نے بتایا۔ ''خالہ کے چہرے پر بے حد نور تھا' چہرے پر مسکراہٹ تھی جیسے وہ بہت پرسکون ہوں۔''

اُن کی بیٹی عاشی کی شادی خالہ کے کسی جاننے والوں کے ہاں ہو گئی تھی۔ اب اُس کے بچے جوان ہیں' بڑی بیٹی اُسی کی طرح حسین و جمیل ہے مگر عاشی کا اپنے خاوند طفیل سے اکثر جھگڑا رہتا ہے' وہ لڑ کر گھر سے چلا جاتا ہے اور مہینوں نہیں پلٹتا۔ سنا ہے کہ عاشی کے ساتھ بھی بچپن سے جن ہے جو ان میاں بیوی کو خوش نہیں رہنے دیتا۔

ایک بار منیر کے گھر عاشی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب وہ پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔ چاند سا روپ ماند پڑ چکا ہے مگر اس کی بیٹی جسے پیار سے گڑیا کہتے ہیں' اپنی ماں کی کاپی ہے۔ سرخ سفید رنگت' سنہرے بال اور دلکش نقوش۔ آپ سب قارئین دُعا کریں کہ اللہ پاک عاشی کی پریشانیاں ختم کرے اور اُس کی بیٹی گڑیا کو ہر بلا سے محفوظ رکھے (آمین!)

غزل

غم کے سائے اگر نہیں ہوتے
ہم بھی جاناں اِدھر نہیں ہوتے

اُن سے ناطہ بھی ہم نہیں رکھتے
جو کہ اہلِ نظر نہیں ہوتے

کیسے پنچھی وہاں پہ ٹھہریں گے
جس جگہ پر شجر نہیں ہوتے

تیری فرقت میں ہم سے جانِ جاں
تنہا یہ دن بسر نہیں ہوتے

تو اگر راستہ دکھا جاتا
ہم کبھی دربدر نہیں ہوتے

اِس طرح منزلیں نہیں ملتیں
آپ اگر ہم سفر نہیں ہوتے

پختہ جن کے ارادے ہوں فرہاد
وہ کبھی بے ہنر نہیں ہوتے



محمد راشد فرہاد

سمیعہ غزالہ نہال

میری انجانی سوکن

جب ہم میاں بیوی خوشگوار موڈ میں تنہا ہوتے تو اس وقت ایسا لگتا جیسے کوئی اور بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگتی اور شوہر کا چہرہ......

میاں بیوی کے درمیان آنے والی ایک نادیدہ سوکن کا دلچسپ احوال

میری زندگی میں اتفاقات کا عمل دخل بہت رہا ہے' ویسے اتفاق تو کسی کے ساتھ کسی بھی وقت ہوسکتا ہے اور ہوتا رہا ہے لیکن میرے ساتھ جس طرح ہوتا رہا ہے' اس کو میں محض اتفاق نہیں سمجھتی کیونکہ میرے ساتھ جس طرح واقعات یا حادثات پیش آتے رہے ہیں' وہ اتفاق نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے لگتے ہیں۔ میری یہ کہانی پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے ہیں' وہ محض اتفاق ہے یا اس میں کوئی اللہ کی مصلحت تھی۔ خیر' اللہ کی مصلحت تو ہر کام کے پیچھے کارفرما ہوتی ہے۔ میرے ساتھ جو بھی گزری' وہ بھی اللہ کی مصلحت تھی۔

میری زندگی میں حیرت انگیز اتفاقات کا سلسلہ جس روز سے شروع ہوا' وہ میری شادی کا دن تھا بلکہ یوں کہیے کہ شادی کی رسومات شروع ہوتے ہی اتفاقات سامنے آنے لگے۔ ہمارے معاشرے میں شادی سے چند دن پہلے دلہن کے گھر ایک رسم ہوتی ہے جس کو رسمِ مایوں کہا جاتا ہے۔ مایوں والے دن دلہن کو پیلے رنگ کا جوڑا پہنا کر بٹھا دیا جاتا ہے پھر سات سہاگنیں دلہن کا منہ میٹھا کرواتی ہیں۔ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتی ہیں اور شگن کے لیے ابٹن پہلے اپنے سیدھے گال پر تھوڑا سا لگا کر دلہن کے چہرے کے دائیں طرف لگا دیتی ہیں۔ اسی مناسبت سے ڈھولک گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ خیر' اب تو مووی بنانے کے چکر میں سات سہاگنوں کے علاوہ کنواری لڑکیاں بلکہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی یہ رسم ادا کرنے لگی ہیں اور سات سہاگنوں کی پابندی بھی ختم ہوگئی ہے ورنہ پہلے زمانے میں ایسی سات سہاگنوں سے رسم کی ابتدا کی جاتی تھی جو اپنے گھر میں خوش باش ہوں اور صاحبِ اولاد بھی ہوں۔ اس ضمن میں بوڑھی سہاگنوں کی بڑی اہمیت تھی یعنی خاندان کی وہ بزرگ خواتین جو بڑھاپے میں بھی سہاگن ہوں جن کے شوہر زندہ سلامت ہوں اور جو نانی' دادی کے عہدے پر بھی فائز ہوچکی ہوں۔



ارے......! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہاں تو میں یہ بتا رہی تھی کہ مایوں کی رسم ادا کرنے کے لیے مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا جہاں مجھے شادی کے دن تک بیٹھے رہنا تھا اور دن میں کئی کئی بار ابٹن ملا جانا تھا۔ مایوں والی اس رسم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ لڑکی کو کچھ دن گھر کے کاموں سے آزاد کرکے صرف اور صرف اس کے رنگ روپ کو نکھارنے کی کوشش کی جائے تاکہ دلہن بن کر اس کے اوپر خوب روپ چڑھے' وہ بہت خوب صورت نظر آئے۔

مایوں کی یہ ہی رسم دلہا والوں کے یہاں رسم برائے رسم ہوتی ہے کیونکہ دلہا کو کون سا مخصوص جگہ بیٹھنا ہوتا ہے' یہ تو ہلہ گلہ کرنے کا بہانہ اور بہنوں اور بھاوجوں کو نیگ وصولنے کا موقع ہوتا ہے۔ رسم مایوں کے موقع پر زیادہ تر تو شادی والے دونوں گھروں کو ایک دوسرے کی رسم میں بلایا جاتا ہے اور دعوت کا انتظام ہوتا ہے' گویا یہ شادی کی رسمیں شروع ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔ قصہ مختصر' دلہا والوں کے یہاں اس رسم کے موقع پر میرے گھر سے میری بہنیں' کزنز اور بھاوجیں وغیرہ گئی تھیں لیکن وہاں جا کر پتہ چلا تھا کہ دلہا میاں کو اتفاق سے صبح ہی سے بخار چڑھا ہوا ہے' سو اس صورت میں کسی رسم کا سوال ہی نہیں تھا' ویسے بھی میرے سسرال والے ایسی رسموں کو ہندوانہ طریقہ اور بدعت سمجھتے تھے مگر میری بہنوں اور بھابیوں کی خوشی کی خاطر اس کے لیے تیار ہوگئے تھے لیکن دلہا کو اتفاقی طور پر بخار چڑھ جانے کی وجہ سے رسم کی ادائیگی نہیں ہوسکی تھی اور میری بہنیں وغیرہ منہ لٹکا کر واپس آگئی تھیں۔

گھر واپسی پر ہر ایک کی زبان پر یہ ہی تھا کہ یہ پہلا اتفاق ہے کہ دلہا عین شادی کے موقع پر بخار میں جل رہا ہے جبکہ میری کچھ کزنز کا خیال تھا کہ کوئی بخار وخار نہیں' یہ سب رسم نہ کرنے کا بہانہ تھا کیونکہ دلہا تو سامنے آیا ہی

نہیں' یہ انہوں نے ہماری انسلٹ کی ہے۔

اب عالم یہ تھا کہ سب لوگ اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ کچھ لوگ پریشان بھی تھے جس میں میرے والد' والدہ' نانی اور دادی سرِفہرست تھیں کیونکہ دوسرے ہی دن شادی تھی لیکن اب یہ بھی ایک حسین اتفاق ہی تھا کہ میرا نکاح چھ مہینے پہلے ہو چکا تھا۔ یہ رخصتی کی تیاری تھی ورنہ شاید بڑی پریشانی ہوتی کیونکہ نکاح میں کافی وقت لگتا ہے اور دلہا کی طبیعت خراب ہونے کے باعث بڑی مشکل ہو جاتی۔ بہرحال دوسرا دن رخصتی کا تھا۔

اور پھر یہ ہوا کہ بارات دلہا کے بغیر آ گئی کیونکہ دلہا میاں کو بخار کے ساتھ یرقان کا مرض بھی لاحق ہو گیا تھا یعنی پھر وہی اتفاق...... شادی کے رنگ میں بھنگ پڑ گیا' خوشیاں اور ہنگامے ماند پڑ گئے' بھلا دلہا کے بغیر رخصتی کا عمل ہو سکتا ہے!!

شادی ہال میں آتے ہوئے مہمان بغیر دلہا کے بارات دیکھ کر عجیب عجیب سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کسی نے کہا۔ "لڑکا شادی کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔" تو کوئی دلہا کی پسند کوئی اور بتا رہا تھا۔ کوئی جہیز اور لین دین کا مسئلہ بتا رہا تھا۔ غرض کہ لوگ اپنی طرف سے جو دل میں آ رہا تھا' بلاتکلف اظہار کر رہے تھے مگر دلہا کی والدہ یعنی میری ساس نے سب کو سمجھایا کہ......

"طبیعت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے دلہا کو بارات کے ساتھ نہیں لایا گیا ہے مگر رخصتی کے وقت ضرور بلوا لیا جائے گا۔ ویسے بھی نکاح تو ہو ہی چکا ہے۔" یوں لوگوں کی زبانیں بند ہوئیں۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد جب مجھے اسٹیج پر لایا گیا تو اس سے ذرا دیر پہلے دلہا صاحب بھی تشریف لا چکے تھے لیکن بیماری کے بہانے کوئی رسم نہیں ہو سکی تھی۔ سالیوں کا دلہا کو پان کھلانے' جوتا چرانے اور نیگ وصولنے کا ارمان دل ہی میں رہ گیا تھا یعنی جیسے ہی مجھے اسٹیج پر لایا گیا' اُسی وقت رخصتی کے لیے کھڑا کر دیا گیا۔ میری سب کزنز' دوستیں اور بھابیاں ہنسی ہنسی میں کہہ رہی تھیں۔

"یہ پہلی دلہن ہے جو اپنی ناز برداری اٹھوانے کے بجائے شادی کے پہلے ہی دن دلہا کی تیمارداری کرے گی۔" پھر وہی اتفاق ہوا' سسرال میں نہ منہ دکھائی کی رسم ہوئی نہ کھیر کھلائی کی نہ سلامی ملی۔ دلہا میاں تو اپنے کمرے میں جا کر ایسے بے سدھ ہوئے کہ ساری رات ان کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹی مجھے ہی رکھنی پڑی اور ٹائم دیکھ کر دوا کھلانی پڑی اور یہ اتفاق بھی مجھ دلہن کے ساتھ ہی ہوا کہ شادی کی پہلی رات میرے کمرے میں میری نند بھی ساتھ ہی رہی تھی اور ہاں' اُن کی بیماری کے پیشِ نظر...... ولیمہ بھی ملتوی ہو گیا تھا۔

•......•......•......•

اُن کی صحت یابی میں تقریباً ایک مہینہ لگ گیا تھا اور میرے ساتھ وہی ہوا تھا جو میری بہنوں' بھابیوں اور دوستوں نے کہا تھا یعنی یہ پہلی دلہن ہو گی جس کی سسرال میں پذیرائی کے بجائے اس کو دلہا کی خدمت کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے' یہ سب میرے ساتھ اتفاق ہی تو تھا!

اس کے بعد تو اتفاق نے گویا میرا گھر دیکھ لیا تھا' میرے ساتھ ہر وقت اتفاقی طور پر عجیب و غریب حالات پیش آنے لگے تھے۔ زیادہ تر کوئی نہ کوئی اتفاق اس وقت ہوتا جب ہم میاں بیوی خوشگوار موڈ میں تنہا ہوتے اور جب بھی کوئی اچھی' محبت بھری یا ہنسی مذاق کی بات ہوتی' اس وقت غیر محسوس طریقے پر ایسا لگتا جیسے کوئی اور بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ میرے شوہر کا چہرہ فق ہو جاتا' اُن کی رنگت پیلی پڑ جاتی اور مجھے بھی ایک عجیب بے چینی اور خوف محسوس ہوتا پھر میرے شوہر کی طبیعت اچانک بگڑ جاتی اور اس کے بعد کئی دنوں تک اُن کی طبیعت خراب رہتی' وہ بہت نڈھال اور کمزور لگنے لگتے۔

مجھے کبھی کبھی خیال آتا' شاید میرے ساتھ دھوکہ ہوا ہے' میرے میاں یا تو نفسیاتی مریض ہیں یا یہ شادی اُن کی مرضی سے نہیں ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے' اُن کی پسند کوئی اور ہو اور مجھے سامنے دیکھ کر اُن کو وہی یاد آ جاتی ہو جو ان کی پسند ہے اس لیے ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ میں یہ سب سوچتی مگر اُن کا نارمل رویہ اور اپنے ساتھ حسنِ سلوک دیکھ کر مجھے خود ہی اپنے خیالات کی نفی بھی کرنی پڑتی تھی۔

•......•......•......•

ایک دن بہت سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی کسی عزیز دوست کو اس راز میں شریک کر کے اپنی یہ الجھن اور پریشانی اس کے سامنے بیان کروں گی اور کسی پیر فقیر سے رُوحانی علاج کے لیے مشورہ بھی کروں گی۔ یہ سوچ کر میں بہت مطمئن ہو گئی تھی۔

اُس دن میرے شوہر آفس سے جلدی گھر آ گئے تھے۔ کھانا وغیرہ کھا کر ہم آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور A.C. چلا کر کمرے کا دروازہ لاک کر دیا تھا لیکن ابھی ہم بیڈ پر بیٹھے ہی تھے کہ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی بند دروازے سے اندر آیا ہو۔ میں نے اپنی نظروں سے ایسا دیکھا نہیں مگر محسوس یقینی طور پر ہوا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنے میاں کی طرف دیکھا تھا تو وہ خود بھی بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ کسی کو دیکھ رہے ہوں اور بغیر الفاظوں اور آواز کے کسی سے گفتگو کر رہے ہوں۔ اُس وقت میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی اور میں نے جلدی جلدی آیت الکرسی کا وِرد شروع کر دیا تھا۔ آیت الکرسی پڑھتے ہی میں نے محسوس کیا تھا جیسے وہ مشکل سے نکل آئے ہوں' وہ ہلکے پھلکے نظر آنے لگے تھے اور نارمل انداز میں بیڈ پر آرام کے لیے لیٹ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے صاف محسوس ہوا تھا جیسے کوئی غصے کے عالم میں تیزی سے کمرے سے نکلا ہو اور پھر نجانے کب تک میں چاروں قُل اور آیت الکرسی کا وِرد کرتی رہی تھی اور اسی عالم میں مجھے غنودگی آ گئی تھی پھر غنودگی کی کیفیت میں ہی میں نے دیکھا تھا کہ کوئی حسین و جمیل عورت میرے پاس کھڑی ہے جس کے بال اس کے گھٹنوں سے نیچے آ رہے تھے اور وہ میرے پاس کھڑی کہہ رہی تھی۔

"تم کچھ بھی کر لو' حسن میرا ہے' صرف میرا......"

اور پھر فوراً ہی میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میرے شوہر بڑے مزے سے بے خبر سو رہے تھے۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اُن پر کچھ اثرات مسلط ہیں۔

اس کے بعد قرآنی آیات کا وِرد میں نے اپنا معمول بنا لیا تھا اور ہر وقت خود پر اور اپنے شوہر پر دَم کر کے حصار بھی باندھنے لگی تھی یہاں تک کہ جب وہ گھر پر نہ ہوتے' تب بھی میں اُن پہ تصور ہی تصور میں دَم کرتی اور حصار کھینچ دیتی تھی۔ اب مجھے صاف محسوس ہونے لگا تھا کہ کوئی اُن کے قریب آتا ہے مگر فوراً ہی اُن سے دور چلا جاتا ہے۔

•......•......•......•

ایک دن میں نے بہت ہمت کر کے اُن سے پوچھا تھا کہ...... "آپ کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے جو اچانک آپ کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے؟" یہ سوال کرنے سے پہلے اُن کے اور اپنے گرد حصار باندھنا نہیں بھولی تھی۔

میرے اس سوال کے جواب میں وہ کچھ دیر تو خاموش رہے تھے جیسے سوچ رہے ہوں کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں؟ پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ...... "مجھے نہیں معلوم' یہ میرے ساتھ کب سے اور کیوں ہو رہا ہے؟ ایک عورت بہت سریلی آواز میں میرا نام لے کر مجھے پکارتی ہے' میں صرف اس کی ایک جھلک دیکھتا

ہوں جو بہت ہی خوبصورت ہے اور اس کے بے انتہا لمبے بال ہیں۔ اس کے بعد اس کا سراپا غائب ہو جاتا ہے' صرف چہرہ نظر آتا ہے پھر وہ چہرہ آہستہ آہستہ میرے قریب آتا ہے۔ اُس کے بعد مجھے پتہ نہیں چلتا کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟ میں سب بھول جاتا ہوں پھر میری طبیعت سخت خراب ہو جاتی ہے۔ میں کئی دنوں تک ماؤف ہو جاتا ہوں۔"

میرے میاں نے اپنی زندگی سے جڑا یہ راز میرے سامنے افشا تو کر دیا تھا لیکن شاید یہ راز کھلنے کے بعد وہ غیر انسانی مخلوق بھی نڈر ہو گئی تھی کیونکہ اب اس کے' میرے میاں حسن کو پکارنے کی آواز مجھے بھی آنے لگی تھی۔ میں اُس کے غصے کی علامات کو بھی محسوس کرنے لگی تھی۔ اب تو وہ غصے بھری آواز میں کہنے لگی تھی۔ "حسن میرا ہے' صرف میرا ہے......" جبکہ پہلے صرف محسوس ہی ہوتا تھا۔ میں نے بھی قرآنی آیات کے ورد کو اپنا معمول بنا لیا تھا۔

•......•......•......•

ایک روز میری ایک نہایت قریبی عزیز دوست نے مجھے ایک رُوحانی علم رکھنے والی خاتون باجی کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اس طرح کے مسائل یعنی آسیبی اثرات وغیرہ کا علاج کرتی ہیں مگر وہ صرف عورتوں سے ہی بات اور ملاقات کرتی ہیں۔ میں نے فوراً ہی اُن خاتون کے پاس جانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا لیکن پھر وہی اتفاق آڑے آ گیا تھا۔

جس دن میں نے اپنی اُس دوست کو بلایا تھا کہ اُس کے ساتھ اُن باجی کے پاس جا کر اپنا مسئلہ بتاؤں گی' عین اُس دن میرے شوہر کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور وہ آفس نہیں گئے۔ اس صورتِ حال میں' میں اُن کو تنہا چھوڑ کر تو نہیں جا سکتی تھی اور پھر اسی طرح کے اتفاقات میرے ساتھ پیش آتے رہے۔ میں اپنی تمام کوشش کے باوجود اپنے شوہر کے مسئلے کے لیے کہیں نہیں جا سکی مگر اس دوران میں وہ مخلوق پابندی سے آتی اور حسن پر اپنا حق جتاتی کہ...... "حسن میرا ہے' صرف میرا......" لیکن اب یہ ضرور ہوا تھا کہ وہ مخلوق حسن کے پاس پابندی سے آتی تو تھی مگر فوراً واپس بھی چلی جاتی تھی۔ ایسا یقیناً میرے قرآنی آیات پڑھنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

•......•......•......•

اس طرح سے تین سال گزر گئے تھے' میری گود ابھی تک ہری نہیں ہو سکی تھی۔ میری ساس نے ایک دو ڈاکٹروں سے میرا چیک اپ کروایا تھا' سب کا ایک ہی جواب تھا۔ "کوئی کمی نہیں' کوئی خرابی نہیں' سب کچھ نارمل ہے۔ اللہ پر بھروسا رکھیں' اُس کی رضا پر راضی رہیں۔" اس دوران میں وہ مخلوق ہفتہ دس دن کے وقفے سے حسن کے پاس آتی رہی تھی۔ اب تو مجھے بھی اُس کا وہ انسانی روپ والا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔ اکثر رات کو جب ہم لوگ بے خبر سو رہے ہوتے' ایک انجانی آہٹ سے میری آنکھ کھل جاتی تھی اور میں دیکھتی کہ وہ مخلوق میرے شوہر کے چہرے کے قریب جھکی ہوتی مگر میرے جاگنے اور متوجہ ہونے پر فوراً غائب ہو جاتی پھر ایک دو دن تک میرے شوہر نڈھال اور کمزور محسوس ہوتے تھے۔ گزرتے وقت اور حالات کے ساتھ میں نے اُس غیر انسانی مخلوق کو اپنی انجانی سوتن کے طور پر قبول کر لیا تھا اور اُس کے مقابلے پر اتر آئی تھی۔ قرآنی آیتوں کے ورد کی وجہ سے ہی وہ میرا کوئی نقصان تو نہیں کر پا رہی تھی مگر اپنے اس دعوے کو بہت شدت کے ساتھ میرے کان میں ایک سرگوشی کی صورت دہرانے لگی تھی کہ...... "حسن میرا ہے' صرف میرا......"

ایک روز میری ساس صاحبہ نے مجھے ایک ایسی لیڈی ڈاکٹر کا بتایا تھا جو دوا کے ساتھ رُوحانی علاج بھی کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔

"دلہن! تم کل میرے ساتھ چلنا' میں تمہیں اُن بزرگ ڈاکٹر صاحبہ کے پاس لے جاؤں گی جو تمہارا چیک اپ کرنے کے ساتھ کچھ دم وغیرہ بھی کر دیں گی۔"

میں "جی' اچھا۔" کہہ کر خاموش ہو گئی تھی مگر دل میں خوش بہت ہوئی تھی کہ اگر وہ ڈاکٹر صاحبہ واقعی کوئی بزرگ ہستی ہوئیں تو میں انہیں اصل مسئلہ بتا دوں گی کیونکہ میرے دل میں بھی یہ شدید خواہش تھی کہ میری کوئی اولاد ہو لیکن پھر وہی اتفاق آڑے آ گیا تھا۔ جس دن ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا تھا' اُس روز صبح ہی صبح میری ساس باتھ روم میں گر گئی تھیں اور اُن کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ انہیں آپریشن کے لیے اسپتال میں داخل کروانا پڑا تھا' یوں پھر وہ بات ٹل گئی تھی۔

•......•......•......•

اُسی دن میں گھر کا کام ختم کر کے' کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے گئی تھی اور ابھی بیڈ پر دروازے کی دوسری جانب کروٹ لے کر لیٹی ہی تھی کہ ایک آہٹ پر میں نے پلٹ کر دیکھا تھا' کوئی لڑکی میرے کمرے کا دروازہ بند کر رہی تھی' اُس کے لمبے بال اس کی پشت پر لہرا رہے تھے۔ میں فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسی اثناء میں وہ پلٹی تھی...... اور میں نے اُسے پہچان لیا تھا...... وہی انجانی مخلوق انسانی روپ لیے میرے سامنے تھی...... اُس نے میرے بہت قریب آ کر کہا تھا۔

"میں تم کو پھر یہ بتا رہی ہوں کہ حسن میرا ہے' صرف میرا...... اور اگر تم چاہتی ہو کہ حسن تمہارے پاس رہے تو تمہیں اولاد کی خواہش سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ تم حسن کے بچے کی ماں کبھی نہیں بن سکتیں۔ اگر تم میری بات مان لو گی تو بہت فائدے میں رہو گی' دولت میں کھیلو گی لیکن اگر تم نے حسن سے اولاد کے لیے کوئی کوشش کی تو یاد رکھنا' میں حسن کو تم سے چھین کر لے جاؤں گی اور تم حسن کے بچے کی



کچھ پھول میں نے رکھے ہیں دل کی کتاب میں
یہ دیکھنا ہے آتے ہیں کس کس کے خواب میں

مہکا ہے بوئے عشق سے گلشن حیات کا
جس دن سے وہ آئے ہیں میرے انتخاب میں

جیسی کشش ہے چہرۂ محبوب میں میرے
ایسی کشش نہ پائی کسی کے شباب میں

ہر نگاہ بزم میں تکتی تھی غور سے
کوئی تو بات یار تھی اُن کے حجاب میں

آتا نہیں سکون کسی طور بھی مجھے
جب سے بسے وہ دِل خانہ خراب میں

اسحاق کیا سناتا انہیں اپنا حالِ دل
تلخی نمایاں آج تھی اُن کے جواب میں

اسحاق خان اسحاق

ماں بننے کے چکر میں بیوہ ہونا کبھی پسند نہیں کروگی' یہ میں جانتی ہوں۔'' یہ دھمکی دے کر وہ پلٹ گئی تھی اور مجھے شاید کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا......

•......•......•......•

حسن کا سلوک میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ میں اُن سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ میں بہت دنوں تک اسی کشمکش میں رہی تھی کہ اس مخلوق کی دی ہوئی دھمکی کا تذکرہ حسن سے کروں یا نہ کروں کہ میری ساس بے چاری پوتے کی خواہش دل میں ہی لیے ملکِ عدم سدھار گئی تھیں۔ اب گھر میں بس ہم دونوں میاں بیوی ہی رہ گئے تھے۔

زندگی کا سفر جاری رہا۔ اس دوران میری حسن سے اولاد کے موضوع پر کبھی بات نہ ہوئی' نہ کبھی انہوں نے اس کا تذکرہ کیا۔ جب سے میری اُس مخلوق سے وہ دھمکی کی صورت آخری بات ہوئی تھی' وہ بہت مصروف رہنے لگے تھے' حیرت انگیز طور پر اُن کی بہت زیادہ ترقی بہت اونچی پوسٹ پر ہوگئی تھی' بہت اعلیٰ تنخواہ کے ساتھ کافی مراعات بھی ملی تھیں پھر ہم نے عزیز آباد کا ایک سو بیس گز والا گھر چھوڑ کر ڈیفنس میں ایک بڑا شاندار بنگلہ لے لیا تھا اور پھر میری زندگی میں ایک اور اتفاق ہوا' اس کو میں حسین اتفاق کہوں گی کیونکہ اس نے میرے ممتا کے جذبے کو تسکین دی تھی۔

میری ساس کی رشتے کی ایک بھتیجی کا انتقال بچے کی پیدائش کے دوران ہوگیا تھا۔ اتفاق سے اس کے شوہر کا انتقال بھی چند ماہ پہلے ہی ہوا تھا اور یہ اُس کا پہلا بچہ تھا۔ نومولود ایک بچی تھی' بہت پیاری سی چونکہ اُس کا کوئی سگا رشتہ دار نہیں تھا اس لیے اس بچی کو یتیم خانے میں داخل کرنے کا فیصلہ ہوا مگر میں نے حسن سے مشورہ کرکے اس بچی کو گود لے لیا تھا۔

ہم نے اُس بچی کا نام ارمان رکھا اور اس کی پرورش میں جی جان سے لگ گئے۔ حسن بھی اس کو اپنی سگی اولاد کی طرح پیار کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بچی بڑی ہوگئی۔ ہم نے اس کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی نہ کبھی اُس کو یہ پتہ چلا کہ وہ ہماری لے پالک ہے اور پتہ چلتا بھی کیسے' اُس کی ولدیت کے خانے میں ''حسن'' کا نام لکھا تھا۔ جی ہاں' اُس کے حقیقی باپ کا نام حسن ہی تھا۔ آپ اس اتفاق پر حیران نہ ہوں کیونکہ مزید حیرت انگیز اتفاق یہ بھی ہے کہ اس کی ماں کا نام بھی راحت ہے یعنی میرا' اس کو گود لینے والی ماں کا نام بھی راحت ہے۔ ہے نا اتفاق!!

ہم نے اس بچی ارمان کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے ساتھ بہترین اخلاق اور دینی تعلیم بھی دلوائی اور ایک اچھا رشتہ دیکھ کر اس کی مناسب وقت میں شادی کردی۔ اب اس کے بچوں کو نواسہ' نواسی سمجھ کر اُس سے بھی پیار کرتے ہیں۔ حسن اب ریٹائر ہوچکے ہیں اور تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میرا بھی اب بڑھاپا ہی ہے لیکن وہ مخلوق...... نادیدہ ہستی اور میری انجانی سوکن...... اب بھی حسن کے پاس آتی ہے...... اور اس کے آنے کے بعد حسن کی طبیعت اب بھی خراب ہوجاتی ہے لیکن اب مجھے اس سے بالکل ڈر نہیں لگتا ہے۔ قرآن کی تلاوت اور قرآنی آیات اب بھی میرے وردِ زباں ہیں مگر اب میں یہ سب اس مخلوق کو بھگانے کی نیت سے یا اس سے ڈر کر نہیں کرتی۔ میں نے اپنی سوکن کو دل سے قبول کرلیا ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ محبت کا جذبہ ہر مخلوق کے دل میں موجزن ہوتا ہے حتیٰ کہ جانور بھی محبت کی زبان سمجھتے ہیں اور محبت کا جواب محبت سے دیتے ہیں۔ میری انجانی سوکن کو میرے شوہر سے واقعی محبت ہے اس لیے اس نے مجھے یا ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور ہاں! اب مجھے اِس بات کا بھی یقین ہوگیا ہے کہ...... میرے ساتھ اتفاقی واقعات یا حادثات اسی مخلوق کا کرشمہ ہیں۔


عمران خان

آسیب زدہ مکان

مجھے واقعی ایسے مکانات سے دلچسپی تھی، جن کے بارے میں مشہور ہو کہ وہاں آسیب کا بسیرا ہے یا ارواحِ خبیثہ رہتی ہیں جو زندہ انسانوں کو پریشان کرتی ہیں......

ایک نئے لکھاری کی حیرت و تجسس سے بھری پراسرار کہانی



فضلِ حق صاحب سے میری ملاقات ایورنیو اسٹوڈیو کی جاب کے درمیان ہی ایک روز ڈراما سیریل کی ریکارڈنگ کے درمیان ہوئی تھی۔ وہ ایک معروف اداکارہ کے ساتھ مہمان کی صورت ہمارے اسٹوڈیو آئے تھے۔ انتظار کے اُن لمحات کے دوران جب وہ اُن اداکارہ کی ریکارڈنگ ختم ہونے کا لمبا انتظار کر رہے تھے' وہاں موجود کچھ لوگوں کے درمیان پُراسرار اور ہارر ڈراموں کے حوالے سے گفتگو چلی تھی تو انہوں نے ہمیں نہ صرف یہ بتایا تھا کہ وہ پُراسرار قسم کی چیزوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اُن کی زندگی سے بہت سے ایسے واقعات جڑے ہوئے ہیں' ساتھ ہی انہوں نے ہمیں یہ اسرار بھری کہانی بھی سنائی تھی۔

میرے دوست ہادی صاحب ایک تعلیم یافتہ اور سنجیدہ قسم کے انسان ہیں۔ ایک رات وہ مجھ سے ملنے آ گئے اور بتایا۔ “میں کئی روز سے آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔”

“خیریت؟ میری ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟” میں نے پوچھا۔

“آپ کو بھوت پریت اور آسیب زدہ گھروں میں بڑی دلچسپی ہے ناں تو اس شہر کے وسط میں مجھے ایک آسیب زدہ مکان سے واسطہ پڑ گیا ہے۔”

میں یہ سن کر خوش ہو گیا کیونکہ مجھے واقعی ایسے مکانات سے دلچسپی تھی جن کے بارے میں مشہور ہو کہ وہاں آسیب کا بسیرا ہے یا ارواحِ خبیثہ رہتی ہیں جو زندہ لوگوں کو پریشان کرتی ہوں۔ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ “واقعی؟ کیا آپ کا کسی آسیب یا بدروح سے سابقہ پڑا ہے؟”

“میرے پاس اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے' میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ دو مہینے قبل مجھے اور میری بیوی کو شہر میں کچھ دنوں کے لیے ایک فرنشڈ اپارٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ سڑک پر سے گزرتے ہوئے ایک مکان نظر آیا جس پر “فرنشڈ اپارٹمنٹ برائے کرایہ” لکھا ہوا تھا۔ اطلاعی گھنٹی بجانے پر ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور ہمیں گھر دکھایا۔ گھر ہمیں پسند آیا' کرایہ بھی واجبی تھا۔ ہم نے اسے کرائے پر لے لیا لیکن تین ہی روز کے بعد ہمیں اس مکان کو اس حالت میں چھوڑنا پڑا کہ دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں وہاں رہنے پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔”

“آپ نے وہاں کیا دیکھا تھا جس سے آپ اس قدر گھبرا گئے؟”

“میرے دوست! میں نہیں چاہتا کہ میں جو کچھ کہوں' آپ اسے من وعن مان لیں یا اسے پُراسراریت کا غیر معقول خوف سمجھ کر میرا مذاق اڑائیں اس لیے آپ کا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ لازمی ہے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ جو کچھ ہم نے سنا یا دیکھا' اس کی اتنی اہمیت نہیں ہے بلکہ جس چیز نے ہمیں خوف زدہ کر کے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا' وہ ایک عجیب اور دہشت خیز ڈر تھا جو ہمیں ایک خالی کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے محسوس ہوتا تھا اور ہم پر کپکپی سی طاری ہو جاتی تھی حالانکہ نہ تو اس کمرے سے کوئی آواز آتی تھی اور نہ ہی اس میں کوئی دکھائی دیتا تھا۔ ان حالات میں' میں اپنی بیوی کے خیال سے متفق تھا کہ ہمیں یہ گھر جلد از جلد چھوڑ دینا چاہیے چنانچہ تین راتیں گزارنے کے بعد ہماری ہمت جواب دے گئی اور ہم کسی طرح بھی وہاں چوتھی رات گزارنے کو تیار نہیں تھے لہٰذا ہم نے اس بوڑھی ہاؤس کیپر کو بلایا اور کہا۔ “اب ہم اس گھر میں نہیں ٹھہر سکتے اور جانا چاہتے ہیں۔”

“مجھے معلوم ہے۔” وہ بولی۔ “میں حیران تھی کہ تم ابھی تک گئے کیوں نہیں؟ تم واحد فیملی ہو جس نے

اس گھر میں تین راتیں گزاری ہیں ورنہ تم سے پہلے آنے والے تو ایک یا زیادہ سے زیادہ دو راتیں ہی گزار سکے۔ میرے خیال میں وہ تم پر مہربان رہے ہوں گے۔”

“وہ کون؟” میں نے پوچھا۔

“وہ جو اس گھر میں بسیرا کرتے ہیں' جو مافوق الفطرت طریقے سے ظاہر ہوتے ہیں اور لوگوں کو پریشان کرتے ہیں۔ بہرحال وہ جو بھی ہیں' مجھے ان سے کوئی ڈر نہیں لگتا۔ ان کے بارے میں مجھے اس وقت سے معلوم ہے جب میں یہاں ملازمہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک معزز کرائے دار کے طور پر رہتی تھی اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ وہی میری موت کا سبب بنیں گے پھر بھی مجھے کوئی فکر نہیں۔ میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ میں مروں گی بھی تو انہی کے ساتھ اسی گھر میں رہوں گی۔ اس عورت نے یہ سب کچھ ایسی خواب ناک آواز میں کہا کہ میں گھبرا گیا اور اس کو پورے مہینے کا کرایہ دے کر ہم لوگ وہاں سے بھاگ آئے۔”

“آپ کی باتیں میرے تجسس کو ہوا دے رہی ہیں' اس سے اچھی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ میں جلد از جلد اس آسیب زدہ گھر میں رات گزاروں۔ برائے مہربانی مجھے اس گھر کا پتا بتائیں۔” میں نے ہادی صاحب سے کہا۔

میں اپنے دوست سے اس گھر کا پتا لے کر وہاں پہنچا تو گھر کو بند پایا۔ سڑک پر کھیلتے ہوئے ایک بچے نے مجھے گھنٹی بجاتے دیکھ کر پوچھا۔ “جناب' آپ یہاں کس سے ملنے آئے ہیں؟”

“سنا ہے' یہ گھر خالی ہے' میں اسے کرائے پر لینا چاہتا ہوں۔”

اس نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ “خالی تو ہے مگر جو عورت یہاں ہاؤس کیپر تھی' اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس گھر میں کوئی بھی رہنے کو تیار نہیں ہے۔ اس گھر کی صفائی اور اسے ہوا لگنے کے لیے میری ماں کو خاصی بڑی رقم آفر کی گئی ہے لیکن میری ماں نے صاف انکار کر دیا ہے۔”

“آخر کیوں؟”

“یہ گھر آسیب زدہ ہے' اس گھر میں بدروحیں رہتی ہیں۔ وہ بڑھیا جو یہاں ہاؤس کیپر تھی' ایک دن اپنی چارپائی پر مردہ پائی گئی۔ خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں' اسے بدروحوں نے ہلاک کیا ہے۔”

“تم اس گھر کے مالک کا پتا بتا سکتے ہو؟”

“ہاں' کیوں نہیں' وہ یہاں سے چوتھی گلی کے ساتویں مکان میں رہتا ہے۔”

میں نے لڑکے کو کچھ انعام دیا اور مالک مکان کی تلاش میں چل پڑا۔ خوش قسمتی سے وہ گھر پر ہی مل گیا۔ وہ درمیانی عمر کا خوش باش قسم کا آدمی تھا اور اکیلا ہی رہتا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور واضح الفاظ میں اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔

“یہ گھر جو آسیب زدہ سمجھا جاتا ہے' میری خواہش ہے کہ میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچوں۔ کیا آپ مجھے اپنا مکان کرائے پر دے سکتے ہیں؟ میں منہ مانگا کرایہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔”

“یہ گھر آپ کے لیے حاضر ہے۔ جب تک چاہیں' قیام کریں۔ کرائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ذاتی طور پر آپ کا مشکور اور زیرِ احسان رہوں گا اگر آپ اس کی پُراسراریت کی تہہ تک پہنچ سکیں۔ یہ گھر میرے لیے مصیبت بن گیا ہے' آسیب زدہ مشہور ہونے کے باعث نہ تو کوئی نوکر وہاں ٹکتا ہے اور نہ ہی کوئی کرائے دار پھر یہ بدروحیں یا جو کچھ بھی ہیں' رات کو ہی نہیں بلکہ دن کو بھی باز نہیں آتیں۔ وہ غریب عورت جو اس گھر میں مر گئی ہے' بچپن سے

میرے خاندان والوں کی واقف تھی۔ ایک وقت وہ اتنے اچھے حال میں تھی کہ اس نے یہ گھر میرے چچا سے کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مضبوط ارادے کی مالک تھی اور صرف وہی اس گھر میں رہنے کو تیار ہوئی تھی۔ اس کی موت کے بعد تو یہ گھر اور بھی بدنام ہو گیا ہے۔ اگر کوئی رہنے کو تیار ہو تو میں اسے بغیر کرائے کے دینے کو تیار ہوں۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں، کب سے یہ گھر آسیب زدہ قرار دیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے لیکن وہ بوڑھی عورت کہتی تھی کہ جب اس نے چالیس، پینتالیس سال قبل اسے کرائے پر لیا تھا تو یہ اس وقت بھی آسیب زدہ تھا اور یہاں روحوں کا بسیرا تھا۔ دراصل میں زیادہ تر ملک سے باہر رہا۔ جب میں واپس آیا تو میرے چچا مرحوم کی وصیت کے مطابق یہ گھر مجھے ملا۔ اس وقت یہ بند پڑا تھا اور غیر آباد تھا۔ اس وقت مجھے بتایا گیا کہ یہ گھر آسیب زدہ ہے اور کوئی بھی اس میں رہنے کو تیار نہیں ہوتا۔ میں نے اس بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔ کافی رقم خرچ کر کے اس کی مرمت کروائی اور کچھ نیا فرنیچر بھی ڈالا پھر "کرائے کے لیے خالی ہے" کا اشتہار دیا تو ایک کرنل نے اسے کرائے پر لے لیا اور اپنی بیوی، بیٹی، بیٹے اور کئی نوکروں کے ساتھ رہنے کے لیے آ گیا۔ وہ ایک دن اور ایک رات اس گھر میں ٹھہرے اور دوسرے دن گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ ہر شخص نے کہا، اس نے کچھ دیکھا اور ڈر گیا ہے۔ اس کرائے دار نے یہاں کوئی روح، بھوت یا جو کچھ بھی دیکھا، بہت خوف ناک تھا اور وہی اس ڈر کا باعث بنا۔ اس کے بعد میں نے اس بوڑھی عورت کو ہاؤس کیپر کے طور پر رکھ لیا اور اسے گھر کرائے پر چڑھانے کے تمام اختیارات دیے لیکن اس گھر میں کوئی بھی ایک یا دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہرا سوائے آخری کرائے دار کے جس نے اس گھر میں تین دن گزارے۔ میں ان کرائے داروں کی کہانیاں نہیں بتاؤں گا اس لیے کہ کبھی بھی دو کرایہ داروں نے ایک جیسی چیز نہیں دیکھی۔ بہتر ہے کہ آپ اس گھر میں کھلے ذہن سے داخل ہوں اور اپنے دیکھنے اور سننے کے لیے مناسب احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔"

"کیا خود آپ نے اس گھر میں رہنے یا اس نامعلوم چیز کو دریافت کرنے کی کوشش کی؟"

"ہاں، میں نے ایک رات نہیں بلکہ دن کو تین گھنٹے قیام کیا اور میری اس چیز کو دریافت کرنے کی نہ صرف آرزو پوری ہوئی بلکہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ مجھے اس تجربے کو دہرانے کی کوئی خواہش نہیں بلکہ میں آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ آپ بھی وہاں شب بسری کا ارادہ ترک کر دیں۔" اس نے بتایا۔

"میں نے اس معمے کو حل کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھا ہے۔ میں اتنا بزدل بھی نہیں کہ یہ باتیں سن کر پیچھے ہٹ جاؤں۔ میں اس قسم کے حالات سے کئی مرتبہ نبرد آزما ہو چکا ہوں۔"

مالک مکان نے اس کے بعد بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور مکان کی چابیاں مجھے دے دیں۔ میں اس تجربے کے لیے کافی بے صبر تھا۔ گھر پہنچتے ہی میں نے اپنے ملازم کو آواز دی جو میرے ساتھ کئی ایسی مہمات میں حصہ لے چکا تھا۔ وہ اونچے قد اور طاقت ور جسم رکھتا تھا، نڈر تھا اور مضبوط ارادے کا مالک تھا۔ میں نے اسے بتایا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ اس شہر میں ایک آسیب زدہ گھر ہے۔ میرا ارادہ آج رات اس گھر میں رہنے کا ہے۔ مجھے یقین ہے، کچھ نہ کچھ دیکھنے یا سننے میں آئے گا۔ ہو سکتا ہے، یہ خطرناک ثابت ہو۔ اگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں تو کیا میں تمہاری حاضر دماغی اور جرأت پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "سر! مجھ پر بھروسہ کیجیے۔ کیا وہ مہم کم خطرناک تھی جب بے سر کے عفریت ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ آخر ہم نے اس مہم کو بھی تو سر کیا تھا۔"

"تو لو یہ چابیاں اور یہ گھر کا ایڈریس۔ جاؤ اور میرے اور اپنے لیے کمرے پسند کر لو۔ کھڑکیاں، دروازے کھول کر گھر کو ہوا لگوا لو۔ انگیٹھی میں آگ روشن کرو۔ میرے لیے میرا ریوالور اور خنجر لیتے جاؤ اور اپنے لیے بھی ہتھیار خود پسند کر لو۔"

میں دن بھر مصروف رہا۔ شام کو اطمینان سے کھانا کھایا، پڑھنے کے لیے ایک کتاب اٹھائی اور اپنے وفادار بل ٹیریئر کتے ٹائیگر کو ساتھ لے کر اس آسیب زدہ گھر کی طرف چل دیا۔ گھنٹی بجانے پر میرے نوکر نے دروازہ کھولا اور میرے پوچھنے پر بتایا۔ "سب ٹھیک ہے اور کمرے بھی آرام دہ ہیں۔"

"کیا تم نے ابھی تک کچھ دیکھا یا سنا؟"

"سر! میں نے ایک عجیب اور بے ڈھنگی سی آواز سنی ہے جیسے کوئی میرے پیچھے پاؤں گھسیٹ کر چل رہا ہو اور کسی سے سرگوشی میں باتیں کر رہا ہو۔"

"تم ڈرے یا گھبرائے تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔"

ہم اس وقت گراؤنڈ فلور کے ڈرائنگ روم میں تھے۔ باہر سڑک کی طرف کھلنے والا دروازہ بند تھا۔ کتا پہلے تو میرے آگے بھاگا پھر ایک دم پلٹ کر بھونکتا ہوا دروازے پر پنجے مارنے لگا جیسے باہر نکل جانا چاہتا ہو۔ میں نے اسے پچکارا اور سر پر تھپکی دی تو وہ ڈرتے ہوئے میرے ساتھ چلنے لگا۔

ہم نے کچن دیکھا جس کے پیچھے ایک بے رونق سا بیک یارڈ تھا جس کی دیواریں اور روشیں سیلن زدہ تھیں اور مٹی سے اٹی ہوئی تھیں۔ جہاں جہاں ہمارا پاؤں پڑتا، وہاں مٹی میں پاؤں کے نشان بن جاتے تھے۔ اب پہلا حیران کن اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ میں نے دیکھا، میرے آگے آگے مٹی میں کسی کے ننگے پیروں کے نشان ابھرتے جا رہے تھے جیسے کوئی میرے آگے آگے چل رہا ہو۔ یہ نشان کسی بچے کے پاؤں کے تھے۔ سامنے کی دیوار تک جا کر یہ نشان غائب ہو گئے۔ واپسی پر ایسا کوئی نقش پا نظر نہ آیا۔

ہم دوبارہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور کچن کا دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ اس کے ایک طرف ڈائننگ روم اور دوسری طرف گیسٹ روم تھا۔ بند رہنے کی وجہ سے گھٹن اور سیلن کا احساس ہوتا تھا۔ ان کمروں میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم قدرے صاف ستھرا تھا۔ میں اس کمرے میں بیٹھ گیا اور نوکر سے کہا کہ موم بتی جلا کر باقی سب دروازے بند کر دے۔

جیسے ہی وہ دروازے بند کرنے کو مڑا، کسی نادیدہ ہاتھ نے سامنے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی اٹھا کر میرے سامنے گز بھر کے فاصلے پر رکھ دی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ "میز الٹ پلٹ کرنے کی بجائے کرسی اٹھا کر رکھنا بہتر ہے۔"

جیسے ہی یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے، میں نے دیکھا، میرے کتے کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ اٹھ کر غرانے لگا۔ میرا نوکر جب دروازے بند کر کے آیا تو اس نے کرسی کی تبدیل شدہ جگہ کے بارے میں کچھ محسوس نہ کیا بلکہ کتے کو سنبھالنے لگا۔ میں اس دوران میں سامنے رکھی ہوئی کرسی کو تک رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کرسی میں مجھے زردی مائل ہلکے نیلے رنگ کی روشنی کا ایک دھندلا سا ہیولہ نظر آیا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ انسانی خاکہ تھا یا کچھ اور۔ وہ ہیولہ

اتنا دھندلا تھا کہ مجھے اپنی بینائی پر شک ہونے لگا تو میں نے اپنے ملازم سے کہا کہ وہ کرسی کو سامنے والی دیوار کے پاس رکھ دے۔ وہ کرسی اٹھا کر دیوار کی طرف جانے لگا تو اچانک مڑ کر بولا۔ ”سر‘ کیا یہ آپ تھے؟“

”کیا ہوا‘ کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کسی نے میرے کندھے پر ضرب لگائی ہے۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کچھ مداری اپنا تماشہ دکھانے میں مشغول نظر آتے ہیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہمیں ڈرائیں‘ ہم انہیں پکڑ لیں گے۔“

اس کے بعد ہم ڈرائنگ روم سے اٹھ کر پہلی منزل پر آئے جہاں بیڈ رومز تھے۔ چلنے سے پہلے ہم ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں دروازے بند کرنا نہ بھولے جو ہمارے حفاظتی انتظام کا حصہ تھے۔ میرے لیے جو خواب گاہ ملازم نے منتخب کی تھی‘ وہ اس حصے کا بہترین کمرا تھا۔ اس کشادہ کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان آتش دان تھا جس میں اس وقت آگ روشن تھی۔ اس کے سامنے میرا ڈبل بیڈ تھا۔ ڈبل بیڈ اور کھڑکی کے درمیان ایک دروازہ تھا جو اس کمرے میں کھلتا تھا جسے میرے ملازم نے اپنے لیے پسند کیا تھا۔ اس کمرے میں کوئی اور کھڑکی یا دروازہ نہیں تھا۔ اس میں آنے جانے کے لیے وہی ایک دروازہ تھا جو میرے کمرے میں کھلتا تھا۔ ہم نے ان دونوں کمروں کی دیواروں کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھا‘ یہ پکی دیواریں تھیں اور کوئی خفیہ راستہ نہیں تھا۔ یہ کمرے اچھی طرح دیکھنے کے بعد میں اور میرا نوکر راہداری اور دوسرے کمروں کو دیکھنے کے لیے نکلے۔ سیڑھیوں کے پاس ایک دروازہ نظر آیا جو بند تھا۔

میرے نوکر نے کہا۔ ”سر‘ آتے وقت میں نے یہ دروازہ کھلا چھوڑا تھا پھر یہ اندر سے بند کیسے ہو گیا؟“ اس کا یہ فقرہ ختم ہونے سے پہلے ہی یہ دروازہ خاموشی سے کھل گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا‘ یقیناً ہم دونوں کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ اندر کوئی آدمی ہوگا۔ میں ایک جست میں کمرے کے اندر پہنچ گیا اور میرے پیچھے میرا نوکر بھی داخل ہوا‘ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک کھڑکی تھی جو بند تھی اور وہی ایک دروازہ تھا جس سے ہم اندر آئے تھے‘ اندر آنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کمرے میں کوئی قالین نہیں تھا‘ فرش ننگا‘ کافی پرانا اور جگہ جگہ سے مرمت شدہ تھا۔ اس کمرے میں نہ تو ہمیں کوئی آدمی نظر آیا اور نہ ہی کوئی ایسی جگہ جہاں کوئی چھپ سکتا۔ ہم اس خالی کمرے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ جس دروازے سے ہم داخل ہوئے تھے‘ وہ آہستگی کے ساتھ باہر سے بند ہو گیا۔ اس طرح جیسے وہ کچھ دیر پہلے کھلا تھا۔ اب ہم اس کمرے میں قید تھے۔ میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی لیکن بظاہر میرے نوکر پر کسی قسم کے خوف کا کوئی اثر نظر نہ آیا۔ اس نے کہا۔ ”اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں پھانس لیا تو وہ غلطی پر ہیں‘ میری لات کی ایک ہی ضرب سے دروازہ ٹوٹ جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”پہلے ہاتھوں سے کھولنے کی کوشش کرو‘ میں کھڑکی کھول کر دیکھتا ہوں۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کھولے اور باہر جھانکا۔ یہ کھڑکی پچھلے صحن میں کھلتی تھی۔ کھڑکی اور زمین کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ دیوار پر کہیں بھی ہاتھ یا پاؤں جمانے کی جگہ نہیں تھی۔ کھڑکی سے کودنے والا نیچے روش کے پتھروں پر گر کر ہڈیاں تڑوا بیٹھتا۔ اس دوران میں میرے نوکر نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن بے سود پھر اس نے مجھ سے طاقت استعمال کرنے کی

اجازت مانگی۔

اگرچہ وہ لمبا چوڑا اور طاقت ور آدمی تھا لیکن اس کے پاؤں کی ٹھوکروں سے دروازے میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی پھر ہم دونوں نے ساتھ مل کر زور لگایا تو بھی نتیجہ صرف رہا۔ زور لگا کر ہم تھک کر ستانے لگے تو مجھے محسوس ہوا کہ ٹوٹے ہوئے فرش سے گیس یا اس قسم کی چیز نکل رہی ہے جو انسانی زندگی کے لیے مضر اور خطرناک ہو سکتی ہے۔ ایک بار پھر مجھ پر خوف غلبہ پانے لگا پھر اچانک ہی دروازہ خاموشی اور آہستگی سے خود بخود کھل گیا اور ہم دونوں نے ایک ساتھ راہداری میں چھلانگ لگا دی۔ راہداری میں ہمیں دھندلی سی زردی مائل روشنی نظر آئی جو انسانی جسم کے برابر تھی۔ اس کی کوئی واضح شکل نہیں تھی‘ بس ایک دھندلا سا خاکہ تھا جو ہمارے آگے چلتا ہوا اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میں اس روشنی کے اور میرا نوکر میرے پیچھے چلا۔ یہ روشنی چھت پر بنے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوئی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم دونوں بھی اس روشنی کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں داخل ہوئے۔ اب اس روشنی نے ایک گول شعلے کی شکل اختیار کر لی جو سامنے پڑے ہوئے بستر پر جا کر بھڑکا اور غائب ہو گیا۔ ہم بستر کے قریب پہنچے۔ یہ ایک عام قسم کا بستر تھا جو عموماً نوکر وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ اس بستر کے قریب ایک چیسٹ آف ڈراز رکھی ہوئی تھی جس کے اوپر ایک رومال پڑا ہوا تھا اور مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ بظاہر یہ کوئی سرونٹ کوارٹر تھا اور غالباً اس عورت کے زیر استعمال تھا جو پچھلے دنوں اس گھر میں مری تھی۔ میں نے دراز کا خانہ کھولا تو اس میں عورتوں کے بوسیدہ کپڑے تھے جن کے نیچے دو خط ایک پرانے ربن میں بندھے رکھے تھے جو میں نے اٹھا لیے۔

جب تک ہم اس کمرے میں رہے‘ نہ تو پھر کوئی روشنی دکھائی دی اور نہ ہی کوئی غیر معمولی بات ہوئی البتہ جب ہم واپس جانے لگے تو ہمارے آگے آگے فرش پر پاؤں گھسیٹ کر چلنے کی آواز آتی رہی۔ جب ہم سیڑھیاں اترنے لگے تو مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے مجھ سے وہ خطوط چھیننے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی گرفت کمزور تھی اور وہ خط چھیننے میں کامیاب نہ ہوا۔

جب ہم واپس خواب گاہ میں آئے تو میں نے کہا۔ ”حیرانی کی بات ہے کہ کتا ہمارے ساتھ نہیں آیا اور اب یہ آگ کے قریب بیٹھا کانپ رہا ہے۔“

میں خط پڑھنے کے لیے بے تاب تھا۔ کتے کی طرف دھیان دیئے بغیر میں نے وہ خط پڑھنا شروع کیے۔ میرے ملازم نے میرا ریوالور اور خنجر بیڈ سائیڈ پر رکھا اور پھر کتے کو پچکارنے لگا۔

خطوط مختصر تھے‘ ان پر پڑی تاریخ آج سے چالیس سال قبل کی تھی۔ وہ کسی شخص نے اپنی محبوبہ یا بیوی کو لکھے تھے۔ ان میں سمندری سفر کا اشارہ اور انداز بیاں ظاہر کرتا تھا کہ لکھنے والے کا تعلق کسی بحری جہاز کے عملے سے ہے۔ لکھائی اور املا سے پتا چلتا تھا کہ لکھنے والا اتنا پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن الفاظ اور انداز تخاطب سے محبت ٹپکتی تھی اور ایسے اشارے بھی ملتے تھے جس سے محبت کے علاوہ کسی سنگین جرم میں ملوث ہونے کا اندازہ بھی ہوتا تھا مثلاً ہمیں ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہیے ورنہ اگر لوگوں کو وہ بات معلوم ہو جائے تو لوگ کیا سمجھیں گے؟ یا اپنے کمرے میں کسی اور کو نہیں سونے دینا اس لیے کہ تمہیں نیند میں بولنے کی عادت ہے‘ کہیں تمہارے منہ سے ایسی بات نہ نکل جائے جسے ہم چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہے یا پھر جو کچھ ہو چکا ہے‘ اسے لوٹایا نہیں جا سکتا۔ (what is done, can not be undone.)

ہمارے خلاف اس وقت تک کوئی ثبوت نہیں جب تک کہ مردہ زندہ ہوکر ہمارے خلاف کچھ نہ بتائے۔ (یہاں پر کسی عورت کی تحریر میں لکھا تھا۔ مردے زندہ بھی ہوسکتے ہیں۔)

پھر خط کے آخر میں بھی زنانہ تحریر تھی۔ ''وہ سمندر میں لاپتا ہوگیا یعنی اسی دن چار جون کو۔''

میں نے خط پڑھنے کے بعد انہیں بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ان کے بارے میں سوچنے لگا پھر بستر پر لیٹ کر اپنے ملازم سے کہا کہ وہ بھی آرام کرلے لیکن درمیان کا دروازہ کھلا چھوڑ دے۔

میں نے دو موم بتیاں جلا کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھیں اور اپنی گھڑی بھی اتار کر وہیں اپنے ہتھیاروں کے پاس رکھ دی اور حالات کا مقابلہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ آتش دان میں آگ روشن تھی اور اس کے قریب ہی کتا لیٹا ہوا تھا' غالباً وہ سو رہا تھا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یخ بستہ ہوا کا جھونکا میرے رخسار کو چھوتا ہوا گزر گیا ہو۔ میں 'سمجھا' دروازہ کھلا ہوگا۔ ادھر نظر ڈالی تو دروازے کو بند پایا پھر بائیں طرف دیکھا تو موم بتیوں کی لو کو پھڑپھڑاتے ہوئے پایا جیسے وہ ہوا میں رکھی ہوں۔

عین اسی وقت میری گھڑی میز پر پھسلتی نظر آئی مگر اسے کھینچنے والا نظر نہ آیا۔ میں نے فوراً ایک ہاتھ سے ریوالور اور دوسرے ہاتھ سے خنجر اٹھالیا کہ مبادا غیر مرئی ہاتھ انہیں اٹھالے۔ ہتھیاروں کو قبضے میں لینے کے بعد میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو میری گھڑی غائب ہوچکی تھی۔ اسے یقیناً کسی نادیدہ ہاتھ نے اٹھا لیا تھا پھر بیڈ سائیڈ ٹیبل سے تین مرتبہ ٹھک' ٹھک' ٹھک کی واضح آواز آئی جیسے کوئی ٹیبل کو کسی چیز سے بجا رہا ہو۔

یہ آواز سن کر میرے ملازم نے بلند آواز میں کہا۔ ''کیا آپ میز کو بجا کر یہ آواز پیدا کررہے ہیں؟''

''غالباً مداری اپنے کرتب دکھا رہے ہیں۔ تم ذرا ہوشیار رہنا۔'' میں نے جواباً کہا اور پھر میری نظر کتے پر پڑی۔ وہ اب پچھلی ٹانگوں پر بیٹھا تھا۔ اس کے کان ہل رہے تھے اور جسم کے بال کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ خونخوار نظروں سے مجھے تک رہا تھا جیسے مجھ پر جھپٹ پڑے گا۔ میں ابھی کتے کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ میرا نوکر اپنے کمرے سے نکلا۔ خوف اور دہشت سے اس کے چہرے کے خدوخال اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ اگر میں اسے اس حال میں کہیں اور دیکھتا تو پہچان بھی نہ پاتا۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے وہ چلایا۔ ''بھاگو' یہاں سے بھاگو وہ اس وقت میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔'' وہ دروازے کی طرف لپکا اور ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول کر راہداری میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے راہداری میں آیا اور اسے رکنے کے لیے آواز دی لیکن وہ بیک وقت کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اتر گیا پھر باہر کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ اب میں اس آسیب زدہ گھر میں اکیلا تھا۔

لمحے بھر کے لیے میں تذبذب کا شکار رہا اور فیصلہ نہ کرسکا کہ میں اپنے نوکر کی طرح یہاں سے بھاگ جاؤں یا یہاں پر رک کر آنے والے واقعات کا مقابلہ کروں؟ پھر تجسس' انا اور ہٹ دھرمی نے مجھے بھاگ جانے سے روک دیا۔

میں خواب گاہ میں واپس آیا اور احتیاط سے نوکر والے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا تو وہاں مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس نے میرے نوکر کو اس قدر دہشت زدہ کردیا تھا۔ میں حیران تھا کہ آخر کون سی چیز تھی جس سے ڈر کر وہ

بھاگ گیا تھا؟ اگر وہ چیز اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا راستہ صرف میرے کمرے سے ہی تھا پھر وہ مجھے کیوں نظر نہ آئی؟ میں کمرے میں موجود ہوتے ہوئے بھی اسے کیوں نہ دیکھ سکا؟

درمیانی دروازہ بند کرکے میں آتش دان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور آنے والے خطرات سے نمٹنے کے بارے میں سوچنے لگا پھر بستر پر لیٹ کر ساتھ لائی ہوئی کتاب کی ورق گردانی شروع کردی۔ ذرا دیر گزرنے کے بعد موم بتی کی روشنی اور کتاب کے درمیان سایہ حائل ہوگیا اور کتاب کے الفاظ اندھیرے میں ڈوب گئے۔ میں نے نگاہ اٹھائی اور جو کچھ میں نے دیکھا' اسے صحیح طور پر بتانے سے قاصر ہوں۔ وہ سیاہ بگولے کے مانند کوئی چیز تھی جو آہستہ آہستہ ایک مدہم ہیولے میں تبدیل ہورہی تھی۔ وہ اتنی بڑی تھی کہ فرش سے چھت تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے خدوخال واضح نہیں تھے لیکن اس پر انسانی خاکے کا گمان ہوتا تھا پھر مجھے محسوس ہوا' چھت کے قریب سے اس عفریت کی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ لمحہ بھر کے لیے وہ آنکھیں مجھے صاف نظر آئیں پھر غائب ہوگئیں۔ اب وہاں سے وقفے وقفے کے بعد زردی مائل نیلی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

میرا جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا اور خوف میری رگوں میں سرایت کررہا تھا۔ میں نے بولنا چاہا تو میری آواز نہ نکلی۔ اب میں بول تو نہیں سکتا لیکن سوچ سکتا تھا۔ میں نے سوچا' کیا یہ خوف ہے؟ نہیں' یہ خوف نہیں ہوسکتا۔ میں اس سے خوف زدہ نہیں ہوں پھر میں نے اٹھنا چاہا تو اٹھ نہ سکا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ قوت نے مجھے جکڑ رکھا ہو۔

پھر میرے ذہن میں آواز ابھری۔ 'یہ تمہاری اور اس عفریت کی قوت ارادی کا امتحان ہے۔ تم جیت گئے تو اس پر فتح پالو گے اور ہار گئے تو فنا ہوجاؤ گے۔'

میری سوچ نے کہا۔ 'یہ صرف نظر کا دھوکہ ہے' میں خوف زدہ نہیں ہوں' میں تم سے نہیں ڈرتا۔ جب تک میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں' تم مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔' پھر میں بھرپور کوشش سے اپنے ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف بڑھانے میں کامیاب ہوگیا۔

اس سے پہلے کہ میں ریوالور اٹھاتا' میرے کندھے اور بازو کو جھٹکا لگا جیسے بجلی کا شاک لگا ہو اور میرا بازو شل ہوکر یوں گرا جیسے فالج زدہ ہوکر ناکارہ ہوگیا ہو۔ میرے خوف کو مزید بڑھانے کے لیے موم بتی کی لو مدہم ہوکر ٹمٹمانے لگی اور موم بتی کے سرے پر ایک ننھی سی چنگاری بن کر رہ گئی نہ صرف یہ بلکہ آتش دان میں جلتی ہوئی آگ کا یہ حشر ہوا جیسے اس کی روشنی کشید کرلی گئی ہو' اب وہ راکھ کا ڈھیر تھی۔ اس کے ساتھ ہی کمرا تاریکی میں ڈوب گیا۔ اب خوف مجھ پر غالب آگیا اور یوں محسوس ہوا کہ حواس میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ میں نے ساری قوت جمع کرکے بولنا چاہا۔ نامعلوم کتنی دیر کے بعد میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ ''میں تم سے نہیں ڈرتا' مجھے تم سے کوئی خوف نہیں ہے۔''

میرے لاشعور نے کہا۔ ''روشنی' یہ بلا اندھیرے کی ہے' روشنی سے بھاگے گی۔'

اب میری پہلی آرزو روشنی تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح کھڑکی تک پہنچا اور اس کے پٹ کھول دیئے' باہر چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور کھڑکی کھلنے سے روشنی کمرے کے اندر آرہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ چیز' وہ عفریت غائب تھی لیکن اس کا سایہ سامنے کی دیوار پر پڑ رہا تھا۔ اب میری نظر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی تو مجھے کلائی تک ایک زندہ سلامت ہاتھ نظر آیا جو

جھریوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کی پشت پر نیلی رگیں نظر آ رہی تھیں۔ ہاتھ کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے میرا اندازہ تھا کہ یہ کسی عورت کا ہاتھ ہے اور جھریوں کی وجہ سے کسی بوڑھی عورت کا ہاتھ لگ رہا تھا غالباً اسی ہاؤس کیپر کا جو اس گھر میں مردہ پائی گئی تھی۔ اس ہاتھ نے میز پر رکھے ہوئے خطوط مٹھی میں دبائے اور غائب ہو گیا۔

اب ایک مرتبہ پھر تین بار ٹھک ٹھک کی آواز آئی اور پھر کمرا یوں ہلنے لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ کمرے کے پرلے کنارے سے رنگا رنگ روشنی کے بلبلے سے اٹھنے شروع ہوئے، سرخ، سبز، نیلے، پیلے بلبلے سارے کمرے میں گردش کرنے لگے۔ اس دوران میں نادیدہ ہاتھوں نے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی اٹھا کر بیڈ سائیڈ ٹیبل کے پاس رکھ دی۔ اس پردھند میں گھرا ہوا ہیولہ سا نمودار ہوا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک عورت کی شکل اختیار کر لی، جیتی جاگتی خوب صورت مگر غم زدہ عورت پھر وہ اپنے بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کرنے لگی۔ اس کی نگاہیں دروازے کی طرف تھیں جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ سامنے کی دیوار پر پڑتا ہوا عفریت کا سایہ کچھ اور گہرا ہو گیا۔ میں نے نظر اٹھائی تو چھت کے پاس دو آنکھوں کو اس عورت کی طرف دیکھتے پایا۔ اتنے میں میری خواب گاہ کے بند دروازے سے ایک سایہ نمودار ہوا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نوجوان کی شکل اختیار کر لی۔

جونہی وہ اس عورت کے پاس پہنچا تو عفریت کا سایہ جو دیوار پر پڑ رہا تھا، آگے بڑھا اور ان دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ دونوں اس سائے کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ چند لمحوں بعد اندھیرا چھٹا اور مدہم سی روشنی ابھری تو سائے کی بجائے وہ عفریت ان دونوں پر جھکا ہوا تھا۔ عورت کے سینے سے خون ٹپک رہا تھا اور نوجوان اپنے ہی خون میں نہایا ہوا تھا پھر روشنی کے بلبلے دوبارہ ظاہر ہوئے اور انہوں نے کمرے میں چکر لگانا شروع کر دیے۔

اب میرے نوکر والے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک بوڑھی عورت باہر آئی۔ اس کے ہاتھ میں وہی خطوط تھے جو کسی ہاتھ نے میری بیڈ سائیڈ ٹیبل سے اٹھائے تھے۔ اس کے پیچھے کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور سر جھٹک کر خط پڑھنے لگی۔ اس کے کندھے پر سے جھانکتا ہوا ایک بھیانک اور بدرنگ چہرہ نظر آیا جو پھولا ہوا تھا جیسے پانی میں ڈوب مرنے والے کا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس عورت کے قدموں میں ایک لاش نظر آئی جس کے قریب ایک سوکھا سڑا فاقہ زدہ لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ اس عورت کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کی جھریاں غائب تھیں۔ اب وہ ایک نوجوان عورت کا چہرہ تھا۔ ایک بار پھر وہ سایہ آگے بڑھا اور اس نے ان سب پیکروں کو اپنے اندھیرے وجود میں چھپا لیا۔

اب پورے کمرے میں اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں ابھی تک اس اندھیرے سائے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس میں سے دو آنکھیں ابھریں جو سانپ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں اور ان میں سے ہلکے نیلے رنگ کی شعاعیں نکل رہی تھی۔ اب ایک مرتبہ پھر ٹھک ٹھک کی تین آوازیں آئیں پھر وہ اندھیرا یا عفریت غائب ہو گیا جیسے یہ سب کچھ اندھیرے سے نکلا اور اندھیرے کی نذر ہو گیا۔ اب ایک اور عجوبہ ظہور پذیر ہوا۔

جس طرح موم بتی کی لو گم ہوتے ہوتے ایک سرخ نقطہ بن کر رہ گئی تھی، اسی طرح آہستگی کے ساتھ واپس آنے لگی اور موم بتی دوبارہ جل اٹھی۔ اسی طرح آتش دان کی آگ بھی دوبارہ روشن ہو گئی۔

اب میں نے اپنے کتے کی طرف دیکھا جو آگ کے پاس خاموش پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے پکارا تو کوئی جواب نہ پا کر میں اس کی طرف بڑھا۔ دیکھا تو اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ مر چکا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید خوف اور دہشت کی وجہ سے مرا تھا لیکن جب ہاتھ لگایا تو اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ نادیدہ ہاتھوں نے اس کی گردن توڑ دی تھی۔ مجھے اس کی موت پر بہت افسوس ہوا۔ دوسری حیران کن بات یہ تھی کہ میری گھڑی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر موجود تھی لیکن وہ بند تھی۔

اس کے بعد کچھ نہیں ہوا اس لیے کہ جلد ہی صبح ہو گئی اور سورج کی روشنی سے کمرا منور ہو گیا۔

•......•......•......•

مجھے شک تھا کہ جو کچھ میری خواب گاہ میں ہوا تھا اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس چھوٹے کمرے سے ہے جس میں میرا نوکر اور میں کچھ دیر کے لیے قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جانے سے پہلے اس شک کو ثابت کرنے یا دور کرنے کی خاطر ایک بار پھر میں اس کمرے میں گیا۔ اس مرتبہ میرے داخل ہوتے ہی وہ کمرا ہلنے لگا اور میں نے فوراً ہی باہر راہداری میں چھلانگ لگا دی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ان تمام واقعات اور آسیب زدگی کا مرکز یا منبع یہی کمرا تھا۔ جب میں نیچے اتر رہا تھا تو مجھے میرے آگے پاؤں گھسیٹ کر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ جب میں باہر کا دروازہ کھول کر سڑک پر آیا تو مجھے پیچھے سے ہنسی کی آواز سنائی دی۔

وہاں سے میں سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ وہاں میرے نوکر کے بجائے اس کا خط رکھا تھا جس میں اس نے اپنی بزدلی اور بھاگ جانے کی معافی مانگی تھی۔ وہ اتنا ڈر گیا تھا کہ اس نے یہ شہر چھوڑ دیا۔ اب میں مالک مکان کے گھر پہنچا تو وہ مجھے گھر پر ہی مل گیا۔ میں نے اسے رات کے واقعات بتائے اور اس بوڑھی عورت کے بارے میں تفصیل پوچھی تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایک ہفتے بعد معلوم کر کے بتائے گا پھر اس نے کہا۔ ”اس گھر کا کیا فائدہ جس کا عقدہ حل نہیں ہو سکا۔“

میں نے اسے بتایا کہ میں اپنا نظریہ اور اس کا علاج پیش کرتا ہوں، اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ میرے نزدیک یہ جو سب کچھ ہو رہا ہے، یہ وہم اور فریب نظر ہے جو ایک دماغ سے دوسرے دماغ میں لہروں کے ذریعے منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ لہریں زندہ انسانوں یا مردہ روحوں کے دماغوں سے پیدا کی جا سکتی ہیں۔ ان کے توڑ کے لیے ہمیں پس منظر کی ضرورت ہے۔ جب آپ اس عورت کے بارے میں معلومات مہیا کریں گے تو ہم کچھ لائحہ عمل بنا سکیں گے۔“

”اگر پھر بھی کچھ نہ ہوا تو میں اس گھر کو کیا کروں گا؟“

”میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو کیا کرتا۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ یہ جو چھوٹا کمرا اس خواب گاہ کے ساتھ زاویہ قائمہ بنا ہوا ہے، یہی ان منحوس روحوں کا مرکز ہے۔ آپ انہیں بھوت پریت یا سایہ پیکر خیالی phantom یا illusion یعنی سراب یا فریب نظر کہہ سکتے ہیں۔ ان روحوں سے چھٹکارا پانے کے لیے میں اس کمرے کا وجود ہی ختم کر دیتا۔ یہ کمرا پچھلے صحن میں خواب گاہ والے کمرے کے ساتھ زاویہ قائمہ پر بنایا گیا ہے اور اس کا اصل عمارت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے خیال میں اسے گرانے سے لہروں کا تسلسل ٹوٹ جائے گا اور یہ قصہ ختم ہو جائے گا۔“ پھر ایک ہفتے بعد اس سے ملنے کا وعدہ کر کے گھر آ گیا۔

پانچویں دن مجھے اس کا خط ملا جس میں لکھا تھا۔

"آپ کے جانے کے بعد میں اس گھر میں آ گیا۔ وہاں مجھے آپ کے بتائے ہوئے خطوط اس عورت کے کمرے میں رکھی دراز کے خانے سے ملے۔ انہیں پڑھنے کے بعد مجھے اس عورت کے بارے میں تجسس پیدا ہوا۔ مزید معلومات کرنے پر پتا چلا کہ اس کا تعلق اچھے خاندان سے تھا اور وہ تعلیم یافتہ اور خوب صورت تھی۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا جو کافی دولت مند تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو پانچ چھ سال کا تھا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کی بہن یعنی عورت اس بچے کی سرپرست تھی اور بچے کے مرنے کی صورت میں تمام دولت اور جائیداد کی وارث تھی۔ خطوں پر پڑی تاریخ سے ایک سال قبل اس نے خاندان کی مخالفت کے باوجود ایک ایسے شخص سے شادی کر لی تھی جو اپنے آپ کو کسی بحری جہاز کا کپتان کہتا تھا لیکن لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بحری قزاق ہے۔ اس شادی کے تین ماہ بعد اس کا بھائی قتل ہو گیا۔ لوگوں کو شک تھا کہ اسے اس کی بہن یا اس کے خاوند نے قتل کیا ہے لیکن ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے انہیں کچھ نہ ہوا پھر چھ ماہ بعد وہ لڑکا پچھلے صحن کی دیوار کے پاس نیم مردہ حالت میں ملا۔ عورت اسے اسپتال لے گئی لیکن وہ بچ نہ سکا۔ لوگوں کو یقین تھا کہ یہ بھی اسی عورت کی وجہ سے ہوا ہے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت قدرتی تھی جس کی وجہ کمزوری، نقاہت اور خون کی کمی تھی۔ اس بچے کی موت کے بعد یہ عورت اپنے بھائی کی دولت کی واحد مالک تھی اور یہ اس وقت اس گھر میں ایک معزز کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔

شادی کے ایک سال بعد اس عورت کے خاوند نے ایک بحری جہاز خریدا اور سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ ایسا گیا کہ پھر واپس نہ آیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کا جہاز سمندر میں غرق ہو گیا۔ یہ عورت خاصی مال دار تھی لیکن مکافاتِ عمل سے نہ بچ سکی۔ جس بینک میں اس کا بیشتر سرمایہ تھا، وہ فیل ہو گیا اور اس کی رقم ڈوب گئی پھر اس نے اپنا بزنس کیا تو اس میں بھی نقصان اٹھایا۔ نوکری کی تو وہ بھی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور آخرکار اسے غربت نے گھیر لیا حتیٰ کہ وہ اس آسیب زدہ گھر کی ہاؤس کیپر بن گئی جس میں وہ بھی باعزت کرایہ دار کی حیثیت سے رہی تھی۔"

مالک مکان اس آسیب زدہ کمرے کو گرانے کے لیے تیار اور میری شمولیت کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ مقررکردہ دن میں وہاں پہنچا۔ ہم نے مزدوروں کے ساتھ مل کر اس چھوٹے کمرے کی چھت کو جگہ جگہ سے توڑا تو ایک جگہ ہمیں خفیہ راستہ ملا جو نیچے کے کسی کمرے کی طرف جاتا تھا اور جس کا علم کسی کو نہیں تھا۔ لوہے کی لگی ہوئی سیڑھی سے نیچے اترے تو گھپ اندھیرا تھا۔ روشنی کے لیے ہمیں کئی موم بتیاں جلانا پڑیں۔ اس کمرے میں تین کرسیاں، ایک میز اور ایک پلنگ نظر آیا۔ یہ سب مہاگنی کی بنی ہوئی تھیں اور ان کا ڈیزائن غالباً سو سال پرانا تھا۔ میز کے سامنے والی کرسی پر ایک انسانی ڈھانچہ بیٹھا تھا، اس کے سامنے میز پر سرخ رنگ کی ایک ڈائری رکھی تھی، اس پر ایک طشتری موجود تھی۔ اس میں کوئی سیال مادہ تھا جس سے ایک خاص قسم کی بو اٹھ رہی تھی جو اعصاب پر اثرانداز ہو رہی تھی۔ اس سے پاؤں کی انگلیوں سے لے کر سر کی بالوں تک سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس طشتری پر علم نجوم کے سیاروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور سیال مادے میں ایک قطب نما تیر رہا تھا جس کی سوئی تھرک اور گھوم رہی تھی۔ طشتری کے پاس ایک عجیب سا آلہ رکھا ہوا تھا جس کا ایک سرا مڑا ہوا تھا اور دوسرے سرے پر دھات اور پتھر کی کوئی چیز منڈھی ہوئی تھی۔ ڈھانچے کے ہاتھ میں قلم تھا اور اس کے نیچے ایک کاغذ پر لکھا تھا۔ "آج میرا مشن مکمل ہو گیا ہے۔ ایک تو میں نے اپنی بے وفا محبوبہ اور اس کے عاشق کو قتل کر دیا ہے اور دوسرے یہ طلسمی کمرا مکمل کر لیا ہے۔ میں نے یہ کمرا کششِ ثقل اور ستاروں کی چال کے مطابق اس طرح تعمیر کیا ہے کہ خواب گاہ یا اس کے ساتھ والے چھوٹے کمروں میں ذرا سی حرکت یا ذرا سی جنبش حتیٰ کہ آواز کا ارتعاش بھی قطب نما کی سوئی کا بیلنس اپ سیٹ کر سکتا ہے اور یہ حرکت کرنے لگ جاتی ہے جس کے زیرِاثر ان کمروں میں موجود مقناطیسی لہریں آپس میں ٹکراتی ہیں اور روشنی پھوٹتی نظر آتی ہے۔ جس تیزی سے یہ سوئی حرکت کرے، اسی تیزی سے در و دیوار ہلیں گے جیسے کوئی زلزلہ آ رہا ہو۔" اس خط کے نیچے 1760ء کی ایک تاریخ پڑی ہوئی تھی۔

خط پڑھنے کے بعد میں اس ڈائری کو پڑھنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے ڈائری کے اوپر سے طشتری اٹھائی تو قطب نما کی سوئی بہت تیز رفتار سے گھومنا شروع ہو گئی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے مجھے الیکٹرک شاک لگا ہو۔ طشتری میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی اور قطب نما دور کونے میں جا پڑا۔ اس وقت کمرا زور زور سے ہلنے لگا اور اس کی ایک دیوار ٹوٹ کر گر پڑی۔

اب میں نے ڈائری کھولی تو اس میں صرف ایک ہی صفحہ تھا جس پر لکھا تھا۔ "ہر وہ چیز جو زندہ ہو یا مردہ، ہر وہ چیز جو احساس و ادراک کے قابل ہو، ہر وہ چیز جو بے حس ہو، بے جان ہو یا بے حیات ہو اور وہ ان کمروں میں موجود ہو اور ان تک یہ لہریں پہنچ رہی ہوں تو ان پر اور اس قابلِ نفرت گھر پر میری بددعا پڑی ہو اور اس میں رہنے والے بے چین، بے قرار اور ذلیل و خوار ہوں۔"

ماں کا دل

جب میں بچی تھی،
تب میرا دل شیر جتنا تھا
مجھے کوئی ڈر اور فکر نہ تھی
لیکن اب!
جب میں سمجھدار ہوں تو......
میرا دل چڑیا جتنا ہو گیا ہے
جب تک سب لوگ گھر نہیں آ جاتے
تب تک
مجھ پر اک خوف طاری رہتا ہے
کیونکہ اب مجھے انسانوں سے ڈر لگتا ہے
کیا واقعی......
ماں کا دل چڑیا جتنا ہوتا ہے......؟

جمیل میتلو

ملک صفدر عباس اعوان

وہ کہاں گئی؟

میں یہ سارا منظر کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ مرغی نے اپنی چونچ سے ٹوکرا اُٹھایا اور اندر داخل ہوگئی۔ وہ کوئی ہلکا پھلکا ٹوکرا نہیں بلکہ بیس کلو وزنی تھا، اِس منظر سے میں ایسا خوف زدہ ہوا کہ......

ایک عجیب وغریب مرغی کا قصہ، اس کی حرکتیں اسرار سے خالی نہیں تھیں

یہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے' اس وقت میری عمر نو دس سال رہی ہوگی۔ وقت اتنی جلدی سے گزرا کہ پتہ ہی نہیں چلا۔ اچھا وقت بھی کیسا پرندہ ہے جو اڑن چھو ہونے میں دیر نہیں لگاتا' بس اتنی تیزی سے پر پھڑ پھڑاتا ہوا آگے ہی آگے چلا جاتا ہے کہ انسان کو پیچھے مڑ کر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

میری زندگی کا وقت بھی ایسا اُڑا کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میری عمر کے پندرہ سال بیت گئے' میرا حال کب ماضی بنا اور مستقبل کب حال' اس کے بارے میں آج سوچتا ہوں تو حیرانگی ہوتی ہے۔ ارے' یہ ابھی کی تو بات تھی' بات تو ابھی کی ہی تھی مگر اس ابھی میں کئی سال گزر گئے۔ وقت کا پرندہ آگے پرواز کرتے وقت اپنے پیچھے ماضی کی ایک ایسی دھول چھوڑ جاتا ہے جس کی گرد میں کچھ صاف دکھائی نہیں دیتا' بس دھندلا دھندلا سا منظر رہ جاتا ہے۔ کئی بار میں نے اپنے ماضی کی دھول میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی تو بہت کچھ نایاب ملا۔ کئی باتیں' کئی یادیں اور کئی واقعات سامنے آ گئے۔

یہ واقعہ بھی ماضی کی راکھ میں دبا تھا۔ پندرہ سال قبل اس واقعہ پر میرے رونگٹھے کھڑے ہو گئے تھے۔ دل ماننے یا نہ ماننے کی کیفیت میں اُس وقت بھی تھا اور شاید اب بھی ہے مگر اس کی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اُن دنوں ہماری گلی میں ایک پٹھان بابا اکثر آیا کرتے تھے۔ لکڑی کی ایک چھوٹی سی ریڑھی پر وہ ٹافیاں' بسکٹ' بچوں کی کھانے پینے کی اشیاء اور کھلونے بیچا کرتے تھے۔ آواز لگاتے ہوئے وہ جیسے ہی ہماری گلی میں داخل ہوتے' مجھ سمیت کئی بچے بھاگتے ہوئے اُن کے پاس پہنچ جاتے۔ اپنے ہاتھوں میں ایک دو روپے کے سکے لیے سارے بچے ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور مختلف چیزوں کی فرمائش کرتے۔ وہ ہفتے میں دو تین بار ہی ہماری گلی میں آتے تھے۔ گلی کے سارے بچے بے چینی سے ان کا انتظار کرتے تھے۔ ان کے آنے پر ہم سب اتنا اودھم مچاتے کہ اللہ معافی۔ مگر خان بابا کبھی بھی ہم کو ڈانٹتے نہیں تھے بلکہ وہ ہمیشہ پیار سے بات کرتے تھے۔ مجھ



سے تو انہیں بہت لگاؤ تھا۔ اگر میں کوئی چیز لیتا تو ایک دو چیزیں اضافی دے دیتے۔ وہ سہ پہر کو آتے اور شام ہونے سے پہلے ہی چلے جاتے تھے۔ جب تک وہ ہماری گلی میں ہوتے' سارے بچے ان کے ارد گرد ہی منڈلاتے رہتے تھے۔ وہ ہمیں پڑھائی کی تلقین کرتے' نیکی اور بدی کے فرق کے بارے میں سمجھاتے۔ پٹھان بابا خود بھی بڑے خدا ترس تھے۔ ان کی شخصیت بڑی سادہ اور پروقار تھی۔ گھنی سفید داڑھی' سفید لباس اور سر پر سفید ہی ٹوپی ہر وقت موجود رہتی تھی۔ دینی باتوں کے علاوہ وہ ہمیں کئی سبق آموز واقعات بھی بتاتے۔ اپنی جوانی کے دلچسپ قصے بھی سناتے۔ وہ جوانی میں فوج میں ملازم تھے' اپنی فوجی زندگی کے بارے میں بھی وہ بہت کچھ بتاتے۔ ان ہی میں یہ واقعہ جسے میں کہانی کی صورت میں پیش کر رہا ہوں' اس واقعہ کو ملاحظہ کیجیے۔

•......•......•......•

میں فوج میں ملازم تھا اور پنجاب کے علاقے میں تعینات تھا۔ میری ڈیوٹی آفیسرز میس میں ہوتی تھی۔ میرا کام بس اتنا تھا کہ کھانا وغیرہ تیار کیا اور فارغ ہو گئے۔ میس پر راشن میں جو انڈے ملتے تھے' وہ یا تو خراب ہوتے تھے یا پھر مشکوک نظر آتے تھے۔ بہر حال ہمیں جو کچھ ملتا' وہی تیار کر کے کھلا دیتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اپنے ذاتی کھانے کے لیے مرغی رکھ لوں تو چند دن میں وہ انڈے دینے لگے گی۔ اس طرح پھر با آسانی میں دیسی انڈے کھا سکتا ہوں۔ اسی سوچ کے تحت میں نے دیہات سے ایک سیاہ مرغی 35 روپے میں خریدی۔ اس کے لیے ایک ٹوکرا بھی بنا بنایا لے کر آیا اور ایک پانی کا برتن ٹوکرے کے اندر رکھ کر اس کی نگہداشت کرنے لگا۔ مرغی کو وقت پر دانہ وغیرہ کھلاتا اور اس کی دیکھ بھال کرتا۔ جب مرغی اس ماحول کی عادی ہوگئی تو اسے ٹوکرے سے نکال کر کھلا چھوڑ

دیتا۔ اس طرح وہ وہیں کیمپوں کے اردگرد گھوم پھر لیتی اور اپنے مقررہ وقت پر واپس آ جاتی تو میں اسے ٹوکرے کے اندر بند کر دیتا۔

مرغیوں سے انڈے حاصل کرنے کے لیے ایک عدد مرغے کی ضرورت ہوتی ہے مگر میری جیب اجازت نہ دیتی تھی کہ میں ڈیڑھ روپے کے انڈے کے لیے ایک عدد مرغ خرید لوں۔ کافی سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مرغی کو اتنی عیاشی دینے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود تلاش کر کے وہاں چلی جائے گی جہاں کوئی مرغ رہتا ہو یا اگر وہ اتنی چالاک ہوئی تو مرغا خود اس کے پاس بن بلائے مہمان بن کر آ جائے گا۔ بہرحال میں نے اس مسئلہ کو غیر ضروری سمجھا اور مرغی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

چند دن کے بعد مرغی نے انڈے دینے شروع کر دیئے۔ میں جب صبح ٹوکرا اٹھاتا تو اس میں ایک خوبصورت انڈا ملتا تھا۔ میں اسے اٹھا لیتا اور بوائل کر کے کھا لیتا۔ مرغی انڈے دیتی رہی اور میں بدستور کھاتا رہا۔

اُن دنوں میں مختلف نوعیت کے مسائل میں گھرا رہتا تھا۔ کوئی نہ کوئی فکر یا پریشانی میرے دامن گیر رہتی تھی۔ ایک روز مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ کسی نزدیکی پیر فقیر صاحب کے پاس جا کر اپنے مسائل بیان کروں۔ میرے اکثر کام بگڑ جاتے تھے چنانچہ ایک دن میں ایک پیر کے پاس جا پہنچا۔

میں نے اُن کو اپنی ساری روداد بیان کی کہ میرے اکثر کام ہوتے ہی نہیں ہیں۔ اگر ہوتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں اس لیے میں اکثر پریشان رہتا ہوں اور ان کو حل کرنے کی مجھ میں قطعی طاقت نہیں ہے۔ میں ان تمام مسائل کا حل چاہتا ہوں۔

پیر جی نے میری پوری بات سن کر مجھے حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”تم چالیس روز کا چلہ کرو مگر نماز پنج گانہ کی پابندی لازمی ہے اور ہمیشہ باوضو بھی رہنا ہوگا۔ اگر تم چالیس روز تک چلہ کاٹنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر تم جو بھی دُعا کرو گے یقیناً قبول ہوگی جس کام میں ہاتھ ڈالو گے انجام خیر حاصل ہوگا۔“

مجھے پیر صاحب کی بات بڑی پسند آئی۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس طرح ایک تو میں پانچ وقت کا نمازی بن جاؤں گا۔ اس کے علاوہ مجھے سرکاری کام سے بھی چھٹکارہ مل جائے گا۔ میرے ساتھی میرے حصے کا کام بھی کر دیں گے۔ یہ سوچ کر کہ وہ تو چلے پر بیٹھا ہے اس لیے اس کو ڈسٹرب نہ کرو۔

چنانچہ ایک جمعہ کو میں نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر پروگرام کے مطابق اپنے کیمپ میں مصلہ ڈال کر شام سے ہی چلے پر بیٹھ گیا۔ میں وقت پر ہر نماز پڑھتا اور وقت پر ہی مجھے کھانا مل جاتا تھا۔ دھوبی بھی وقت پر آ کر میرے بغیر دھلے کپڑے لے جاتا اور دھلے ہوئے دے جاتا۔ مرغی کا ٹوکرا بھی اٹھا کر میں کیمپ کے اندر لے آیا تھا۔ کیمپ سے مراد میرا وہ ٹینٹ ہے جو بانسوں اور رسیوں کے ذریعے ہم لوگ میدان میں جنگ کی حالت میں یا جنگی مشقوں کی حالت میں لگا کر قیام کرتے تھے۔ اس ٹینٹ کے اندر چھت کے ساتھ رسی سے لالٹین لٹکا دی جاتی تھی تاکہ روشنی کا انتظام رہے۔

دن اسی طرح گزرتے جا رہے تھے۔ میں نہایت ہی توجہ سے چلہ کاٹ رہا تھا۔ میرا زیادہ تر وقت اپنے مصلے پر ہی گزرتا تھا۔ جب رفع حاجت وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو میں ٹینٹ کا ایک پلو اٹھا کر باہر چلا جاتا پھر بنا کسی سے بات کیے وضو کر کے واپس اپنے چلے میں مصروف ہو جاتا۔

پیر صاحب نے چلے کے متعلق ہدایت دیتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ چلے کے دوران تمہارے ساتھ غیر معمولی حالات پیش آئیں گے لہٰذا ان کی پرواہ کیے بغیر اپنا دھیان چلے پر مرکوز رکھنا۔ بصورت

دیگر ناکام رہو گے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ ہم فوجی لوگ جس بات کا ارادہ کر لیں، اسے ضرور پورا کرتے ہیں خواہ انجام کچھ بھی ہو۔

چلے کے دوران وہ کالی مرغی حسب معمول انڈے دیتی رہی اور میں کھاتا رہا۔ بعض دفعہ جب میں انڈا ٹوکرے سے اٹھاتا تو وہ چونچ مار کر انڈے کو میرے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتی مگر میں اٹھا لیتا اور کھا جاتا۔ اسی طرح میرے چلے کے چونتیس دن مکمل ہو گئے تھے اور محض چھ دن بقایا تھے۔ میں روزانہ دن گزرنے کا حساب رکھتا تھا جس طرح آپ کو ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے کہ اتنے روز جشنِ آزادی ہوگا یا اتنے روز بعد الیکشن ہوں گے، روزانہ آپ کو ذہن نشین کرایا جاتا ہے، اسی طرح میں اپنے چلے کے گزرتے دنوں کا حساب رکھتا تھا۔

ایک رات میس میں عجیب ہلچل مچ گئی۔ جہاں آفیسرز وغیرہ کا کھانا پکتا تھا، وہاں سے پرندوں کے پھڑ پھڑانے اور لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں لیکن میں نے کوئی توجہ نہ دی اور اپنے مصلے پر چلے میں مصروف رہا۔ بعد میں مجھے باہر ہونے والے ہنگامے کے متعلق پتہ چلا کہ جس مرغی کو میں نے شام اپنے ٹوکرے میں بند کیا تھا، وہ اڑتی ہوئی ساتھ والے شیشم و کیکروں کے درختوں سے ہوتی ہوئی اس میس پر آن گری تھی اور وہاں موجود روٹی کے ٹکڑے وغیرہ کھانے لگی تھی چونکہ اس کا رنگ سیاہ تھا اس لیے اندھیرے میں ان لوگوں کو پہچاننے میں مشکل ہوئی کہ وہ کیا شئے ہے جو رات کی تاریکی میں درختوں سے پھڑ پھڑاتی ہوئی میس کے قریب آ کر گری ہے؟ آخر ایک فوجی اٹھا اور اس نے قریب جا کر سرچ لائٹ کی روشنی میں اسے دیکھا تو تب علم ہوا کہ میری مرغی ہے چونکہ میں تو چلے پر بیٹھا ہوا تھا اس لیے اس کو پکڑ بھی نہیں سکتا تھا لہٰذا اسی فوجی نے اس مرغی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر مرغی وہاں سے اڑ کر

اگر!

☆☆☆

اگر تمہیں مجھ سے شکایت تھی
تو پھر مجھ سے کہا ہوتا
تمہیں آواز نہ دیتا
فقط کمرے میں بند رہتا
یہ سوچا ہے ابھی میں نے
یہی اک حل نکالا ہے
تمہارے خط جلاؤں گا
تمہیں اک دن بھلاؤں گا
میں سب میسج ڈیلیٹ کر دوں گا
میں ان زخموں کو بھر دوں گا
غیروں سے کہا تم نے
کبھی مجھ سے کہا ہوتا
تمہارا مان رکھتا میں
عجب ہی شان رکھتا میں
نہ رستے میں کبھی آتا
نہ کالج چھوڑنے جاتا
ارے، مجھ سے کہا ہوتا

☆☆☆



صفیہ سلطانہ مغل

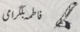
قدرے دور جا گری۔ وہ دوبارہ اس کے پیچھے گیا' وہ مزید اڑ کر آگے جا بیٹھی۔ آخر خاصی کوشش کے بعد اس نے مرغی کو پکڑ ہی لیا اور اسے میرے ٹینٹ کے اندر چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

جب تک مجھے مرغی کے بارے میں پتہ نہیں چلا تھا' میں اسی کشمکش و شش و پنج میں رہا کہ آخر یہ باہر کیا ہو رہا ہے؟ اس فوجی نے مرغی میرے ٹینٹ میں چھوڑتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ یہ آپ کی مرغی ہے' اس کو شاید آپ ٹوکرے میں بند کرنا بھول گئے تھے؟ اس کے جملے میں نے مصلے پر بیٹھے بیٹھے اِدھر اُدھر دیکھے بنا سن لیے تھے۔ وہ فوجی یہ کہہ کر چلا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ مرغی کو تو میں نے شام ہی کو ٹوکرے میں بند کر دیا تھا پھر یہ کیسے ٹوکرے سے باہر آ گئی؟ پھر میرے ذہن میں دوسرا خیال ابھرا کہ ہو سکتا ہے' میں نے مرغی کو آج ٹوکرے میں بند کیا ہی نہ ہو۔ میرا ذہن گواہی دے رہا تھا کہ میں نے یقیناً شام کو ہی مرغی کو ٹوکرے کے اندر بند کر دیا تھا۔ مرغی ٹینٹ میں اِدھر اُدھر چل پھر رہی تھی۔ بہرحال میرے لیے یہی کافی تھا کہ مرغی واپس آ گئی تھی۔ باہر اندھیری رات ہے۔ اب وہ یہاں ٹینٹ کے اندر محفوظ ہے اور مجھے اب اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی لہٰذا میں نے اپنے رُوحانی عمل پر دوبارہ توجہ دی مگر میں کن انکھیوں سے مرغی کو ٹوکرے کے اردگرد چکر لگاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو مرغی ٹوکرے کے گرد چاروں طرف چکر لگاتی رہی پھر وہ ایک کنارے سے ٹوکرے کے اوپر چڑھ کر دوسری طرف سے نیچے اتر گئی پھر اس نے اپنی چونچ سے ٹوکرے کو اوپر اٹھایا اور اندر داخل ہو گئی۔ میں یہ سارا منظر کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مرغی نے اپنی چونچ سے ٹوکرا اٹھایا اور اندر داخل ہو گئی۔ وہ کوئی ہلکا پھلکا ٹوکرا نہیں تھا بلکہ اس ٹوکرے کا وزن کم از کم بیس کلو تھا۔ اس منظر سے میں ایسا خوف زدہ ہوا کہ وہیں مصلے پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ نیم بے ہوشی میں بس مجھے اتنا پتہ چلا کہ لوگ مجھے اٹھا کر ٹینٹ سے باہر لائے تھے' اس کے بعد کچھ ہوش نہیں رہا' جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ہسپتال میں پایا۔ مجھے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ میرا بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ڈاکٹرز میری کڑی نگرانی پر مامور تھے اور مجھے وقفے وقفے سے انجکشن اور طبی امداد دی جا رہی تھی۔ میں تقریباً ڈیڑھ ماہ اسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ اس دوران میری یونٹ وہاں سے روانہ ہو کر کسی دوسرے علاقے میں چلی گئی تھی۔

خدا جانے' میرے آنے کے بعد میرا ٹوکرا و مرغی کدھر گئے؟ مجھے پوچھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ بعد میں' میں نے کئی ساتھیوں سے رابطہ کیا' اپنے ٹوکرے اور مرغی کے بارے میں دریافت کیا' سب یہی کہہ رہے تھے کہ تمہارے ٹینٹ میں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ مرغی اور ٹوکرے کو ٹینٹ میں نہیں دیکھا گیا۔

وہ مرغی پراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی اور ساتھ اس کے ٹوکرے کا بھی پتہ نہیں تھا۔ خدا جانے' وہ جن تھا یا کوئی اور پراسرار مخلوق جو مجھے پینتیس روپے میں ملی تھی؟ میں سوچتا ہوں' خدانخواستہ' اگر میں اسے ذبح کر دیتا تو جانے میرا کیا انجام ہوتا؟ مجھے ہمیشہ اس امر پر حیرت رہی کہ ایک معمولی سی مرغی کس طرح بیس کلو وزنی ٹوکرے کو اپنی چونچ سے اٹھا کر اس میں داخل ہو گئی تھی؟ بھلا کوئی مرغی ایسا کچھ کر بھی سکتی ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو میرے ذہن کی چولیں ہلا دیتا ہے۔

آپ سب یہ سوچنے پر یقیناً مجبور ہوں گے کہ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ جھوٹی کہانی ہے یا من گھڑت قصہ ہے؟ مگر آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ دنیا میں پراسرار مخلوق کا وجود ہے اور تا قیامت رہے گا!!



فاطمہ بلگرامی

جن آنکھوں میں خواب بسے تھے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ ہی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیاد مکاں رکھی تھی

سچی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تحیر خیز سلسلہ۔ قسط نمبر 10

خلاصہ: داؤد عرف ڈیوڈ کی ماں میری ایک انگریز عورت تھی جس نے ایک ایشیائی افتخار الملک نامی شخص سے شادی کی تھی...... اس رشتے کی پاداش میں میری کے ارب پتی باپ لارڈ ڈلفی نے اسے جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ اسی دوران حالات نے اسے اپنے شوہر سے جدا کر دیا...... اس کے بعد میری نے اپنے بیٹے کے ساتھ لندن میں بہت مشکل زندگی گزاری اور مر گئی۔ لارڈ ڈلفی کی موت کے بعد یہ وصیت سامنے آئی کہ اس نے اپنی تمام جائیداد کا وارث میری کے بیٹے ڈیوڈ کو قرار دیا ہے لیکن داؤد عرف ڈیوڈ یہ جائیداد قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جب کہ لارڈ ڈلفی کی اس جائیداد پر ایک یہودی گروپ کی بھی نظر ہے۔ داؤد کی اس گروپ سے ایک جھڑپ بھی ہوتی ہے۔ لندن میں ہی بہن بھائی جیسے رشتوں سے محروم داؤد کی ایک پاکستانی فیملی سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس فیملی کی ایک لڑکی کو بہن بنا لیتا ہے لیکن وہ لڑکی داؤد کو بھائی نہیں سمجھتی اور ایک ایسا قدم اٹھاتی ہے کہ داؤد کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ حالات کا مارا داؤد پاکستان اپنے باپ افتخار الملک کے پاس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں وہ شادی کے بعد ایک بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ جہاز میں سفر کے دوران اس کی ملاقات فاطمہ نامی ایک نہایت موڈ لڑکی سے ہوتی ہے جو اسے پاکستان میں ملنے کے لیے وزیٹنگ کارڈ بھی دیتی ہے۔ داؤد پاکستان آتا ہے تو اسے باپ ہی نہیں اپنی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی فہمیدہ سے بہت پیار، محبت اور شفقت ملتی ہے۔ داؤد اپنی دولت کے ذریعے ان لوگوں کی زندگی میں آسانی اور آسائش لانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پاکستان میں داؤد کی اپنے باپ سے جڑے رشتے داروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ انہی میں ایک بہت خوبصورت ذہین اور حاضر جواب لڑکی عنبر بھی ہے جو داؤد کو اچھی لگتی ہے...... اور ایک رشتے دار رائیل اختر سے بھی ملاقات ہوتی ہے جس نے پولیس آفیسر ہونے کے باوجود جیل کاٹی ہے اور وہ منشیات کا عادی بھی رہ چکا ہے۔ پاکستان میں داؤد کو اس لڑکی راحیلہ کا ایک طویل خط ملتا ہے، جسے داؤد نے بہن سمجھا ہوتا ہے لیکن وہ داؤد کو محبوب سمجھ کر اس کی بدنامی کا باعث بن گئی تھی۔ یہ خط راحیلہ نے مرنے سے پہلے تحریر کیا ہے۔ داؤد جہاں ایک طرف اس بات سے خوش ہے کہ عنبر اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی ہے، وہاں اس کے لیے یہ بات بھی حیرانی اور پریشانی کا باعث ہے کہ موم نے آخر فہمیدہ سے جو اس کی بہن ہے اس کے رشتے کے بارے میں سوچا بھی کیسے...... داؤد کی ملاقات رائیل سے ہوتی ہے جو اسے اپنی کہانی سناتا ہے اور یہ کہانی کردار در کردار آگے بڑھتی ہے، رائیل خود اپنے بارے میں بتاتا ہے کہ اُسے ایک سازش کے ذریعے ہیروئن کا عادی بنایا گیا...... اور پولیس کی نوکری سے نکلوایا ہی نہیں، اُس سے مجرمانہ عمل کرانے کی بھی کوشش کی۔ یہاں تک کہ وہ جیل پہنچ گیا...... اور پھر جیل سے فرار ہوتا ہے، داؤد وغیرہ کی انٹریا آمد ہوتی ہے، یہاں مختلف اوقات میں رائیل داؤد کو اپنی کہانی سناتا رہتا ہے۔ **اور اب آگے پڑھیے:**



’’اس سچ کی پڑیا بنا کر اپنی جیب میں رکھیں۔ مجھے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش نہ کریں۔ پورے سنڈیکیٹ میں واحد آدمی ہوں جو چیف کے اصل نام اور چہرہ سے واقف ہے۔‘‘

’’تم غلط سمت بڑھ رہے ہو۔ اصلی شیر خان میں ہوں‘ اس نے دھوکے سے میرا چہرہ خراب کیا اور پھر سندور کھلا کر میرا گلہ بھی خراب کر دیا۔ میری دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس نے سنڈیکیٹ کا راز معلوم کیا پھر میری کرسی پر آکر جم گیا۔ اب میرے پاس وہ چہرہ ہے اور نہ وہ آواز‘ جس کے ذریعے میں تم لوگوں پر پنا جادو قائم رکھتا تھا۔‘‘

’’اور کچھ کہنا ہے؟‘‘ اس نے جماہی لے کر انکل کی جانب دیکھا۔

’’مجھے کہنا ہے۔‘‘ آصفہ آگے بڑھی۔

’’تم کیا کہو گی تم خود اس دھوکے باز کے جال میں جکڑی ہوئی ہو۔‘‘ اشفاق طنز کیے بغیر نہ رہ سکا۔

’’یہ فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے کہ کون جال میں پھنسا ہوا ہے۔‘‘

’’یہ بات تو تم فون پر اپنی چالاکی سے جان چکی ہو۔‘‘

’’خط میں انکل کا جملہ تھا کہ تمہیں مار کر جلد ہی اپنی ریاست واپس لے لوں گا۔ کیا تم نے اس جملے پر غور کیا۔ انھوں نے سنڈیکیٹ کے لئے لفظ اپنی ریاست کا استعمال کیوں کیا؟‘‘

اشفاق خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر آئی تبدیلی نے بتا دیا تھا کہ وہ مخمصے میں پڑ گیا ہے پھر بھی وہ کھوکھلے لہجے میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ’’کیا سنڈیکیٹ کو اپنا لکھ دینے سے وہ اس کی ملکیت ہو گئی؟‘‘

’’میں صرف اتنا سوچنے کی التجا کر رہی ہوں کہ انھوں نے ایسا کیوں لکھا؟‘‘

’’اس لئے لکھا کہ تم اس جملے کو بطور ہتھیار استعمال کر سکو۔ مجھ جیسے لوگوں کو سنڈیکیٹ سے غداری پر اکسا سکو۔‘‘

’’مطلب؟‘‘

’’خط اس نے لکھا۔‘‘ اشفاق نے انگلی سے انکل کی جانب اشارہ کیا۔ ’’لیکن الفاظ تمہارے تھے۔ تم نے جان بوجھ کر خط میں لفظ اپنی ریاست کا استعمال کیا ہے۔‘‘

’’یہ تمہارا خیال خام ہے۔ سچائی نام کو بھی نہیں۔ درحقیقت وہ خط انھوں نے ہم سے مشورہ کیے بغیر لکھا اور اس پرائیویٹ روم میں رکھ آئے تھے۔‘‘

’’ثبوت؟‘‘

’’ثبوت کچھ دیر پہلے کا واقعہ ہے۔‘‘ آصفہ کہتی چلی گئی۔ ’’تم نے دیکھا کہ ہم نے اس پر مکمل اعتماد اس وقت تک نہیں کیا تھا جب تک حقیقت کا پتا نہیں لگا لیا اور یقین دلایا تم نے‘ تمھاری باتوں نے۔‘‘

’’وہ واقعہ ڈراما بھی تو ہو سکتا ہے۔‘‘

’’ڈراما اس لئے نہیں ہو سکتا کہ ہمیں تمھارے جواب کے مطلق خبر نہیں تھی۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم کس سوال کا کیا جواب دو گے۔‘‘ اشفاق لاجواب ہو گیا۔

’’میں یہ نہیں کہتی تم میری باتوں پر سو فیصد یقین کرو لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ جس طرح اپنی کوشش سے ہم نے سچائی تلاش کی ہے تم بھی کوشش کرو۔‘‘

’’اس بدشکل آدمی کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ اصلی شیر خان ہے؟‘‘

"میرے بیٹے!" انکل نے شیریں لہجے میں کہا۔ "اگر میرے پاس ٹھوس ثبوت ہوتا تو اب تک میں کمیٹی کے سامنے پیش کر کے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیتا۔ ہاں کچھ ایسی باتیں ضرور کہوں گا جو تمھیں سوچنے پر مجبور کر دیں گی۔"

"بکو۔" اشفاق نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"میں پہلا اور آخری شخص ہوں جس کی لاش پر انعام رکھا ہے۔ یہ انعام کمیٹی نے نہیں شیر خان نے رکھا ہے۔ دماغ پر زور دے کر سوچو کہ ایسا میں نے کیا کر دیا ہے جس کی موت کا انعام مقرر کیا گیا؟ اس نے تمھیں یہ کیوں نہیں بتایا کہ اس کی مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ اسے اپنا چہرہ تمھیں دکھانے کی ضرورت کیوں پڑی جبکہ تم بہت اہم ممبر بھی نہیں ہو۔" اشفاق سوچ میں پڑ گیا۔

"اگر تمھیں یقین آجائے کہ وہ نقلی شیر خان ہے تب تم کیا کرو گے؟"

"ان کا حق دلانے کی کوشش کروں گا۔"

"بیٹے! اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرے ہاتھ پیروں میں اب وہ دم خم نہیں ہے جس کی بدولت میں نے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو خوفزدہ کر کے سنڈیکیٹ کے جھنڈے تلے جمع کیا تھا اسی لیے تم سب کا سہارا لے رہا ہوں مگر یاد رکھو۔ جسم کی قوت ختم ہوتی ہے تو عقل تیز ہو جاتی ہے۔" انکل نے میٹھے لہجے میں دھمکی دی۔

"یہ تو وقت بتائے گا۔ فی الحال میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟" اشفاق نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"شاید آخری بار تمھیں بے یقینی کا سامنا کرنا پڑے۔ ہم نہیں چاہتے ہیں کہ تم ہمارے اڈے کو پہچان سکو اس لئے تمھاری آنکھوں پر پٹی باندھ رہے ہیں۔" آصفہ نے کہا اور میں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔

☆......☆

اشفاق کی رہائی کا چوتھا دن تھا۔ میں نے اسے فون کیا۔ فون اسی نے ریسیو کیا تھا۔ میں نے ہیلو کے جواب میں کہا۔

"شاید تم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔"

"کیسی غلطی؟" اشفاق کے لہجے میں تجسس تھا۔

"اگر تم سے غلطی نہیں ہوئی ہے تو سنڈیکیٹ کے لوگ تمھاری نگرانی کیوں کر رہے ہیں۔؟ انکل نے نگرانی کرنے والوں کو پہچان لیا ہے۔"

"لیکن میں نے تو ایسا محسوس نہیں کیا۔"

"دھیان نہیں دیا ہوگا۔ خیر یہ بتاؤ سچائی جاننے کے لئے تم نے کچھ کیا؟"

"ہاں کیا۔"

"کس نتیجے پر پہنچے؟"

"فون پر بتا نہیں سکتا۔ آمنے سامنے بیٹھ کر بتاؤں گا۔"

لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ چوبیس گھنٹے تمھاری نگرانی ہو رہی ہے۔ سچائی جاننے کے لئے جو کچھ تم نے کیا ہے اس پر باریکی سے غور کرو۔ کہیں نہ کہیں تم سے چوک ضرور ہوئی ہے۔ اگر نہ ہوئی ہوتی تو سنڈیکیٹ کے لوگ تمھاری نگرانی نہ کرتے۔ ممکن ہے تمھاری کسی بات پر اس دھوکے باز کو شک ہو گیا ہو کہ تم اصلیت جاننے کی کوشش کر

رہے ہو۔"

"مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگتا پھر بھی چیک کروں گا۔"

"او کے راستہ نکال کر ملاقات کروں گا۔" کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا اور بوتھ سے نکل کر ٹیکسی اسٹینڈ پہنچا۔

آصفہ نے صبح بتا دیا تھا کہ مجھے شام میں عثمانی کو چیک کرنا ہے اور موقع پا کر اسے موت کی دھمکی دینی ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں سیدھا عثمانی کے گھر پہنچا۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ اپنے بنگلے کی جانب نہیں گیا تھا۔ اس نے ایک نیا مکان حاصل کر لیا تھا۔ میں اس مکان کے سامنے ٹیکسی سے اترا تھا کہ اس کی کار باہر نکلتی نظر آئی۔ میں دوبارہ اسی ٹیکسی میں سوار ہو گیا اور پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس کی کار چائز ہوٹل کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ وہ نیچے اترا، میں نے بھی ٹیکسی چھوڑ دی اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس عمارت کے کمرا خاص میں داخل ہو گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اسی وقت ایک پھنکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"گولی مار دوں گا، خبردار ہلنا مت۔" مجھے ایسا لگا کہ عثمانی پر سکتہ سا طاری ہو گیا ہے۔ اس کے ہیولے کے برابر کسی اور کا بھی ہیولا نظر آیا، ساتھ ہی ساتھ ایک بے ساختہ قسم کی چیخ بھی سنائی دی اور پھر عثمانی کا جسم الٹا لٹکا ہوا محسوس ہوا کیوں کہ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کو......کون ہو تم۔" عثمانی کی آواز میں لرزہ تھا۔

تبھی چٹ کی آواز ہوئی اور کمرا روشن ہو گیا۔ واقعی عثمانی الٹا لٹکا ہوا تھا اور اس کا پیر رسی کے ذریعے چھت کے کنڈے میں بندھا ہوا تھا۔ یقیناً پہلے سے ہی پھندہ تیار تھا۔ دوسرے شخص نے جس کے ہاتھ میں پستول تھا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "کہو شیر خان کیسا لگ رہا ہے۔"

"کمینے ذلیل تیری یہ ہمت کہ تو مجھ پر ہاتھ ڈالے۔"

"زبان کو لگام دو شیر خان! ورنہ گولی نرخرے کے پار ہوگی۔"

"دو ٹکے کا ہرکارہ تیری یہ ہمت کہ مجھے دھمکی دے۔"

"الٹا لٹکنے کے بعد بھی عقل سیدھی نہ ہوئی۔ تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔ یہاں سے تیری چیخ باہر نہیں جائے گی پھر نیچے آج میرے ڈیوٹی تھی۔ صبح تک کوئی بھی نیچے نہیں آئے گا۔"

اُس شخص کی باتوں سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ شیر خان کے سکیورٹی اسٹاف میں سے ہے۔

"تم......تم کیا چاہتے ہو؟" عثمانی کی آواز میں تکلیف ہی تکلیف تھی۔ وہ ایک پیر پر الٹا لٹکا ہوا تھا۔

"پہلے یہ پوچھ کہ میں کون ہوں؟"

"کو......کون ہو تم؟"

"میں رحمت علی کا بیٹا ہوں، جسے تو نے رحمت سمجھ کر گولی مار دی تھی۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ اس نے تیری ایسی تصویر کھینچ لی تھی جس میں تو بغیر وگ اور داڑھی میں تھا۔ یاد آیا؟"

"وہ......وہ میں نہیں تھا۔ یقین......کرو......وہ دوسرا شیر خان تھا۔ مجھے سیدھا کر دو میں سب......بتا دوں گا۔"

"تجھے آزاد کر دوں تا کہ تو گھنٹی بجا کر خطرے کا اعلان کر دے۔ نہیں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ تو اسی حالت

میں سچائی بتاورنہ......'' اس نے گراری دار چاقو نکالا' کڑکڑاہٹ کی آواز سے کمرا گونج اٹھا۔'' میں اسی چاقو سے تیری کھال اتاروں گا۔ یاد ہے تو نے بھی میرے ابا کی کھال اتاری تھی۔ انھیں اس وقت تک اذیت دیتا رہا تھا جب تک انہوں نے فوٹو کی نشاندہی نہیں کردی تھی۔ آج وہی ڈراما میں تیرے ساتھ کھیلوں گا۔''

''یقین کرو راحت میں بے قصور ہوں۔ شیر خان بن کر اپنا انتقام لے رہا ہوں۔''

''کیسا انتقام؟'' راحت نے چھری کی دھار پر انگلی پھیری۔

''میں بھی تمہاری طرح انتقام کی آگ میں جلا کرتا تھا۔ میں نے عقل کا استعمال کیا اور موقع ملتے ہی شیر خان کو دبوچ لیا اور پہاڑی علاقے کی ایک جنگی میں لے گیا اور اپنی بیٹی کے ہیروئنچی بننے کا انتقام لے لیا۔ اسے اتنا ٹارچر کیا کہ وہ معذور ہوگیا۔ اس کی آواز چھین لی' جلا کر اس کا چہرہ بھی بگاڑ دیا، میں نے اسے مردہ سمجھ کر پھینک دیا تھا مگر وہ سخت جان نکلا۔ زندہ رہ گیا اور دوبارہ میرے مقابل آگیا ہے۔''

''اس کا اصل نام؟''

''سہیل...... سہیل اختر!''

''ثبوت؟''

اس الماری میں وہ البم ہے۔ اتفاق کہو کہ اب تک میں نے اسے ضائع نہیں کیا ہے اس میں وہ تصویر بھی ہوگی جسے یقیناً تمھارے ابا نے کھینچی ہوگی۔ اگر پہچان سکتے ہو تو پہچان لو۔''

راحت اس الماری کی جانب بڑھا۔ دراز کھولی اور ایک البم نکال کر اس میں رکھی تصویر دیکھی۔ فوٹو دیکھنے کے بعد بولا۔ ''ہاں' یہ تصویر میرے ابا نے کھینچی ہے۔ ان کے کیمرے کے لینس پر ہلکا سا بال تھا جس کا عکس تصویر میں بھی نظر آتا تھا۔ وہی عکس اس تصویر میں بھی ہے۔ پھر اس نے صفحہ پلٹا' یہ مختلف سن کی متعدد تصاویر تھیں۔ ہر تصویر کے پیچھے لکھا تھا شیر خان سن...... میں...... شاید یہ سربراہ کی شناخت تھی۔

''اب تو مجھے سیدھا کردو۔'' عثمانی گڑبڑایا۔ راحت نے البم بند کر کے کہا۔

''نہیں فی الحال یہ ناممکن ہے۔''

''نہیں' ایسا نہیں ہوگا۔ ہم دونوں سہیل کے خلاف ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ اس حساب سے ہم دوست ہوئے۔ یقین رکھو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔'' عثمانی اٹک اٹک کر بولا۔

''جو اتنے سارے راز جان چکا ہے اسے تم زندہ نہیں چھوڑ سکتے لیکن میں ایک فوجی ہوں۔''

''تم فوجی ہو؟'' عثمانی نے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں میں ایک فوجی ہوں۔ جس وقت میں جان کی بازی لگا کر دشمن کر پیچھے دھکیل رہا تھا۔ اپنے ہم وطنوں کی حفاظت میں سینہ سپر تھا۔ انھی دنوں مجھے خبر ملی تھی کہ میرے ہی کسی ہم وطن نے میرے گھر کو اجاڑ دیا ہے لیکن اس وقت وطن کی حفاظت مقدم تھی۔ اس لیے برف پوش پہاڑوں سے نیچے نہیں اترا۔ اب لوٹا ہوں تو قاتلوں سے دو دو ہاتھ کیے بغیر چین نہیں ملے گا۔ اسی لیے تو میں جرم کی دنیا میں آیا۔ لیکن تم بے فکر رہو۔ میں فوجی ہوں۔ زبان کا دھنی' میں تمہاری جان نہیں لوں گا۔ جاتے وقت یہ چاقو دے جاؤں گا۔ تمہارے ہاتھ آزاد ہیں۔ جھولتے ہوئے آگے بڑھ کر اٹھا لینا پھر کمر موڑ کر اسے کاٹ لینا تب تک میں تصویر کے ساتھ باہر نکل چکا ہوں گا۔''

''اس کا کیا کرو گے؟''

''یہ میری ضمانت ہے۔ جب تک میرے پاس رہے گی تم پر خوف طاری رہے گا کہ میں کمیٹی کو تصویر دکھا کر یقین دلا سکتا ہوں۔ پھر اسی کے سہارے تو میں اسے تلاش کروں گا۔''

''مگر اب تو اس کی شکل بدل چکی ہے۔''

''اس تصویر کے سامنے دو تصویریں اور بھی تھیں ایک میں عورت بھی ساتھ ہے۔ یقیناً یہ اس کی بیوی ہوگی۔ یا پھر کوئی ایسی عورت جسے وہ دنیا والوں کی نظروں سے چھپائے رکھنا چاہتا ہوگا۔ حفاظت کا یہاں معقول انتظام بھی تو ہے۔''

''ہاں وہ اس کی بیوی ہے۔''

''تو یقیناً اس کے لئے یہ تصویر کافی قیمتی ہے۔ میں اخبار میں اشتہار دوں گا۔ اخبار میں اس کی تصویر ہوگی کہ یہ تصویر دوسری تصاویر کے ساتھ مجھے راہ چلتے پڑی ملی ہے جن صاحب کی ہے آکر لے جائیں۔ وہ دوڑتا ہوا پہنچے گا اور میں اسے مرضی کے مطابق سزا دوں گا۔''

پھر اس نے چاقو زمین پر رکھا اور باہر نکل آیا۔ وہ اندر والے دروازے سے باہر گیا تھا میں باہر والے دروازے سے نکل کر سڑک پر پہنچ گیا تھا۔

میرے دماغ میں طوفان سا مچا تھا۔ میں نے اس جنونی کے تیور دیکھے تھے۔ وہ فوجی تھا۔ زبان کا پکا تھا۔ اس نے قسم کھائی ہے تو سہیل انکل کو ختم کر کے ہی چین سے بیٹھے گا۔ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ ایسی حالت میں انکل کو بتانا صحیح ہے بھی کہ نہیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اسی الجھن میں بنگلے پر پہنچا تو آصفہ' کمال اور صادقہ تیار بیٹھے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی آصفہ نے کہا۔ ''بڑی دیر لگا دی' ہم آج ہی اشفاق سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''مل آؤ۔'' میں نے جواب دیا۔

''پہلے ایک بندہ گرانا ہے۔ کلاشن کوف تیار ہے۔ انکل چلائیں گے تم صرف کور دینا ہم باہر نکل آئے۔ کار تیار تھی۔ انکل پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ صادقہ تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آصفہ میرے برابر بیٹھ گئی۔ اشارہ ملتے ہی میں نے انکل کی اسپیشل وین کے اگنیشن میں چابی گھمائی' غراتے ہوئے انجن جاگ اٹھا اور پھر وین کمان سے نکلے تیر کی طرح سڑک پر دوڑتی چلی گئی۔ میں نے جان بوجھ کر اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ جگہ جگہ پولیس والے گاڑیوں کو روک کر تلاشی لیتے تھے۔ کہیں کسی موبائل نے روک لیا تو کیا ہوگا۔ وین اسپیڈ میں رہی تو رکتے رکتے بھی کئی فرلانگ دور رکے گی۔ اتنی دور آکر چیک کرنا بعض وقت ان کے لیے ناممکن ہوتا ہے ایسی حالت میں دو ہی باتیں ہوتی ہیں۔ یا تو جانے کی اجازت دے دیتے ہیں یا پھر غصہ اتارنے کے لئے ایک ایک انچ کی تلاشی لیتے ہیں۔ اگر تلاشی کی نوبت آجائے تو بھاگنے کا راستہ کھلا رہے یہی سوچ کر میں نے اسپیڈ بڑھائی تھی۔ اتفاق کی بات ہے راستے میں کہیں بھی موبائل سے ٹکراؤ نہیں ہوا۔ اور ہم اشفاق کے محلے میں پہنچ گئے۔ اس کے گھر میں چند قدم کے فاصلے پر ایک آم کا پیڑ تھا۔ اس پیڑ کے نیچے ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں غبارے تھام رکھے تھے۔ دور سے ہی وہ غبارہ بیچنے والا نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اسپیڈ کم کی۔ اسی وقت انکل نے کلاشن کوف کی نال کھڑکی سے باہر نکالی۔ رٹ رٹ کی مخصوص آواز ابھری اور

غبارے والا لڑھک گیا اور آس پاس کی زمین خون سے سرخ ہوگئی۔ میں نے پھر اسپیڈ تیز کردی۔ کافی آگے نکلنے کو بعد دوسرے راستے پر مڑا اور پھر واپس ہولیا۔ اشفاق والی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر وین روکی اور ہم سب اتر پڑے۔ انکل نے سیٹ کے نیچے کلاشن کوف چھپائی اور ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ گلی کے آخری سرے پر اشفاق کا مکان تھا۔ اس کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ سامنے ہی اشفاق کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی مسکرا اٹھا۔۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور بولا۔ ”کہیے کیسے آنا ہوا؟“

”بس چلے آئے اپنی سناؤ!“

پھر صادقہ بولی ”ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔“

”لیکن باہر تو سنڈیکیٹ کے لوگ ہوں گے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ ایک بندہ تھا جو اب جہنم میں بیٹھا جلدی آنے کا مقصد یاد کر رہا ہوگا۔“

”اوہ...... چلیے۔“

اشفاق کی آنکھوں پر ہم نے پٹی باندھ دی۔ اسی حالت میں ساتھ لے کر ہم بنگلے پر پہنچے۔

پٹی کھلتے ہی اشفاق نے کہا۔ ”راستے میں تو میں نے کچھ کہا نہیں مگر اب کہنا چاہتا ہوں' لگتا ہے ابھی تک آپ لوگوں نے مجھ پر یقین نہیں کیا۔“

جھوٹ نہیں بولوں گی اشفاق!“ آصفہ نے کہا۔ ”تم پر پورا بھروسہ نہیں کر پائے ہیں اور سچ پوچھو تو ابھی تک بھروسے جیسی بات بھی سامنے نہیں آئی ہے بلکہ تم کچھ اور ہی نظر آ رہے ہو۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”ہم سائنسی دور میں سانس لے رہے ہیں۔ الیکٹرونکس کے سامان عام ہیں۔ ایسی ایسی چیزیں بہ آسانی مل جاتی ہیں جنہیں پہلے لوگ جادو سمجھتے تھے۔ اب یہی دیکھو......“ کہتے ہوئے اس نے اشفاق کے کوٹ کا کالر پچھلی جانب الٹ دیا۔۔ وہاں کا کروچ سے کچھ چھوٹا ایک کیڑا چپکا ہوا تھا۔ اسے نکال کر آصفہ نے ہتھیلی پر رکھا پھر بولی۔ ”اسے پہچانتے ہو؟“

”یہ کیا ہے؟“ اشفاق نے پوچھا۔

”الیکٹرونکس کا کمال' یہ ایک ایسا مائک ہے جس کے ذریعے دو ڈھائی کیلومیٹر کی رینج میں ایک خاص سیٹ پر تمہاری باتیں سنی جا سکتی ہیں۔ یہ آلہ جاپان کی ایک مشہور کمپنی نے تیار کر کے مارکیٹ میں بھیجا ہے۔ اس کی خریداری صرف حکومتی سطح پر ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم نے حاصل کر لیا ہے۔ اس کے ذریعے کیچ کی گئی باتیں سنو گے؟ لو سنو۔“ کہتے ہوئے آصفہ نے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔

مجھے بھی حیرت کا شدید جھٹکا لگا، اتنی اہم بات مجھ سے چھپائی گئی تھی' پھر بھی میں نے کچھ نہیں کہا اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔ ٹیپ ریکارڈ سے پہلی آواز اشفاق کی سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”سہیل کا امتحان لینے کے لئے میں نے دو سال پرانے واقعے کا ذکر کیا۔ اس واقعہ کا جب پشاور کے نواحی علاقے میں پولیس آپ کے پیچھے لگ گئی تھی اور آپ کا داہنا پیر گولی سے زخمی ہوگیا تھا۔ میں نے اس سے داہنا پیر دکھانے کو کہا تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔“

دوسری آواز بھری۔ ''لیکن سر وہ بہت چالاک ہے۔اس نے فوراً ہی تاویل پیش کردی۔ کہنے لگا وہ نشان تو میں نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے ختم کرادیا تھا۔اسی وقت جب میں شیر خان تھا۔''

''حیرت ہے' پشاور کی باتیں اسے کیسے معلوم ہوگئیں؟''

''ہوسکتا ہے' اسے یہ بات آپ نے بتائی ہو۔یاد کیجئے۔''

''ہاں یاد آگیا۔میں نے ایک روز اسے بتایا تھا لیکن تمھیں اس بات ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

''میں اسے پھانسنا چاہتا ہوں۔''

''کیسے؟''

''کچھ دن بعد وہ خود مجھ سے یہ جاننے کے لئے رابطہ کرے گا کہ سچائی جاننے کی میری کوشش کا نتیجہ کیا نکلا۔ میں ان کی ہاں میں ہاں ملادوں گا۔کہوں گا کہ اپنی کوشش کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شیر خان نقلی ہے۔''

''کوئی خاص اسکیم ہے کیا؟''

''بڑی سیدھی اسکیم ہے۔انھیں یقین دلا کر ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا اور انھیں پرسنل راستے کے ذریعے پرائیویٹ روم تک لاؤں گا۔اسی راستے سے جس کے بارے میں آپ نے مجھ پر یقین کر کے بتایا تھا ۔اگر انھوں نے مجھ پر یقین کرلیا تو یقیناً پھنس جائیں گے۔''

''آصفہ نامی لڑکی بڑی ذہین ہے مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ آسانی سے پھنسے گی۔''

''میری گھڑی ہوئی کہانی اور اداکاری اسے یقین دلا دے گی۔''

''یہ اسکیم خطرناک ہے تمہاری جان بھی جاسکتی ہے۔''

سنڈیکیٹ کے لوگوں کو ہنستے ہوئے مرنے کی تعلیم آپ ہی نے دی ہے سر!''

''ایک اسکیم اور ہے۔تم کسی طرح شگفتہ کو بتادو کہ شیر خان میں ہوں۔وہ میری بیٹی ہے۔میرا نام سنتے ہی وہ سردھڑ کی بازی لگادے گی۔یہ میرا دعویٰ ہے کہ اب تک سہیل نے انھیں جو کچھ پڑھایا ہوگا سب چھنس ہو جائے گا۔شگفتہ انھیں رام کرلے گی۔''

''ٹھیک ہے میں انھیں یہ انفارمیشن دے دوں گا۔آپ اس پر سختی کریں تاکہ وہ اس کے گروہ سے نکل آئے۔''

''دراصل سنڈیکیٹ کے دشمن کو میں اپنا دشمن سمجھتا ہوں' وہ میری بیٹی ہے تو کیا ہوا سنڈیکیٹ کے خلاف ہے اسی لیے میں نے اس پر اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیا ہے۔''

''ایک سوال پوچھوں؟''

''بولو؟''

''سہیل کا چکر کیا ہے؟''

''اگر تم یہ پتا لگانے کی کوشش کر رہے ہو کہ اصلی شیر خان کون ہے۔میں یا سہیل تو میں اپنا داہنا پیر دکھاؤں جہاں گولی لگی تھی؟''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں سر' اگر ایسی بات ہوتی تو میں ان سے ملاقات کی بات بتاتا؟''

''ٹھیک ہے جاؤ۔''

اس کے بعد ہوا کی سائیں سائیں اور موٹر گاڑیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔آصفہ نے ٹیپ ریکارڈ بند کردیا پھر بولی۔''اب بولو؟''

''یہ...... یہ تو میں اس کا امتحان لے رہا تھا۔''

انکل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔اشفاق نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''کیوں چیف میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''چیف؟'' صادقہ نے کہا۔''کیا تم انھیں چیف مان چکے ہو؟''

''مان نہیں' جان چکا ہوں کہ شیر خان یہی ہیں۔''

''کیسے جانا؟''

''کئی دن تک اس الجھن میں رہا کہ سچائی کیسے جانوں اور میں نے عثمانی سے ایسے بہت سے سوال کیے جن کا سرا کسی نہ کسی پرانے واقعے سے ملتا تھا۔مجھے ہر سوال کا صحیح جواب ملا۔یہ سب میری بے وقوفی کا پھل ہے۔اس لیے میں خاموش نہیں بیٹھا۔سچ کی تلاش میں لگا رہا۔تبھی مجھے پرسنل روم کا خیال آیا۔مجھے کئی سال پہلے کا ایک جملہ یاد آگیا تھا جو ایک بار آپ نے اپنی تقریر میں کہا تھا اسی جملے نے میری رہنمائی کی اور میں جان پر کھیل کر اس کمرے میں داخل ہوگیا۔'' اس وقت اشفاق کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو شکاری کا خاصہ ہے۔چوہے کو دوڑا دوڑا کر تھکا مارتے وقت ویسی ہی چمک بلی کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔چہرے پر عیاری کا طمع تھا۔اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔''وہاں مجھے ایک ڈائری بھی نظر آئی ہے۔اس ڈائری میں وہ تمام باتیں تشریح کے ساتھ لکھی ہیں کہ اس نے کب اور کیسے آپ کو بے وقوف بنایا۔آپ پر کیا کیا ستم ڈھائے۔''

''وہ ڈائری کہاں ہے؟''

''اسے ہٹا کر اپنی موت کو دعوت دیتا۔وہیں چھوڑ آیا ہوں۔''

''بے وقوف! اسے لے کر آنا چاہیے تھا۔'' کمال نے جھڑکا۔

''اس ڈائری کو حاصل کرنا ضروری ہے۔'' آصفہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''آپ منصوبہ بتائیں مدد میں دوں گا۔'' اشفاق بولا۔

آصفہ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتی رہی پھر چٹکی بجا کر بولی۔''خاکہ بن رہا ہے۔شاید بتاتے بتاتے پورا منصوبہ تیار ہو جائے۔دراصل کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے جسے مسئلہ کہا جائے یعنی جس کا حل نہ ہو۔''

''مطلب؟''

''پہلے ایک سوال اشفاق سے' کمیٹی کی میٹنگ کا کیا سسٹم ہے اشفاق!''

''ہر مہینے کی پچیس تاریخ کو میٹنگ ہوتی ہے۔''

''آج دس تاریخ ہے۔ہم پندرہ دن انتظار نہیں کر سکتے۔ایمرجنسی میٹنگ بھی تو ہوتی ہوگی۔''

''ایسی میٹنگ صرف شیر خان بلا سکتا ہے۔''

آگے کا احوال جاننے کے لیے
اگلی قسط آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں



حنیف سحر

گردشِ رنگِ چمن

رسا چغتائی کا خیال

صرف مانع تھی حیا بند قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

اس عورت کا حقیقی روپ سامنے لاتی کہانی جسے زمانہ طوائف کہتا ہے، ساتواں حصہ



حسن نور مینشن
بلبل ہزار داستان
سنگیت محل
فنکار محل
موسیقار محل
جمیلہ شکیلہ بلڈنگ
شمشاد بلڈنگ نمبر ایک اور دو

ان عمارتوں کے علاوہ بھی ایسی بے شمار عمارتیں ہیں جو سینکڑوں سالوں سے اسی طرح استادہ ہیں، باہر سے ٹوٹی پھوٹی اور خستہ حال یہ عمارتیں اندر سے اتنی ہی مضبوط اور مستحکم دکھائی دیتی ہیں.. جیسے کہ نئی نئی بنی ہوں، بعض عمارتیں ۱۸۰۰ء کی ہیں اور بعض ۱۹۰۰ء کے عین شروع کی دہائیوں کی ہیں، ان عمارتوں میں کچھ ایسی بھی ہیں کہ یوں سمجھیں کہ اب گریں کہ تب گریں، مخدوش لکڑیوں کی بنی ... ایسی کہ آتے جاتے دم کی ضمانت نہیں دیتیں... بوسیدگی کا یہ عالم کہ شفاف ذہن کے لوگ اسے کھانچہ سمجھیں اور اندر جانے کو آمادہ نہ ہوں، متعلقہ محکموں کے لوگوں نے انسانوں کی جان کے ڈر سے کئی بار انھیں گرانے کی کوشش کی.. طوائفیں اس کارن تیار نہ ہوئیں کہ حکومتوں کا کچھ بھروسہ نہیں کہ نئے سرے سے بنانے پر آمادہ نہ ہوں... اور یہاں بھی کوئی شاپنگ پلازہ تعمیر کر دیا جائے... جس تیزی سے شہر کے سینما گھر مسمار ہو رہے ہیں،.. جہاندیدہ کسبیوں کو یقین ہے ایک دن اس جگہ بھی طوائفوں کی صرف یاد باقی رہ جائے گی... جو عمارتیں رینو ویٹ ہوئی ہیں' ان میں بھی سر دست تو بالا خانے ہی بنے ہیں کہ فی الحال سرکار بھٹکے ہوئے لوگوں کو اور بھٹکانے کا ارادہ نہیں رکھتی... نئی بالکونیوں کو بھی دیمک بری طرح چاٹ چکی ہے اور جا بجا مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے ہیں اور انھیں صاف کرنے کی زحمت بھی نہیں کی جاتی یوں سمجھو کہ تماش بین ایسے بھی ستھرے نہیں آتے کہ وہ ایسا کوئی مطالبہ کریں یہ کوئی لکھنو تو ہے نہیں کہ جہاں تہذیب و تمدن سے خود طوائف کی بھی بڑے زوروں کی یاری تھی... کراچی کے تو شرفاء کے گلی محلے ایسی نا قابل بیان گندگی سے مہکا کرتے ہیں کہ کیبوں کو تو یہ تک یاد نہیں رہا کہ اس گندگی کو صاف بھی کرایا جا سکتا ہے... سو وہ کیا مطالبہ کریں گے... غلاظت کے ڈھیر اود بدبوؤں کے طوفان خوب ہلا مچاتے پھرتے ہیں... لیکن اس وقت آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں جب انھی عمارتوں میں باہر سے ایئر کنڈیشن لگے دکھائی دیتے ہیں... جن وقتوں میں سائرس نے وہاں جانا شروع کیا تھا وہ ایسے وقت نہ تھے کہ بجلی نے کہرام مچایا ہوا ہو... اب تو جانے وہ ایئر کنڈیشن بھی بس لگے لگے چلنا بھول گئے ہوں کہ گاہکوں میں اتنا دم نہیں کہ وہ اس قحط زدہ زمانے میں بجلی سے چلنے والے طوائفوں کے ایئر کنڈیشنز چلوا سکیں... یہاں سائرس نے محسوس کیا رنڈی اور طوائف کے الفاظ اس روانی سے استعمال ہوتے ہیں کہ شہر کے جن حصوں کو ہیرا منڈی نہیں سمجھا جاتا' وہاں تو اب تک یہ اب بھی ایسے رکیک الفاظ ہیں لوگ مرنے مارنے پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں.. یہ ایک فرق تو اب بھی باقی ہے... سائرس کو ہنسی آ گئی کہ شہر میں طبقاتِ انسانی کی پہچان گالیوں کے حوالے سے ہوتا... کتنا مضحکہ خیز ہے... اس سے بھی زیادہ عجوبہ یہ ہے کہ لفظ بھی کیا عجیب ایجاد ہے... انسان کے بیشمار زخموں کی وجہ یہ لفظ ہی تو ہیں جو الفاظ نہ ہوتے تو کیا انسان جی نہ سکتا تھا؟ بعض عمارتوں کو دیکھ کر ممبئی کا خیال آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طوائفوں کی حد تک ہم اب بھی کوئی الگ ملک نہیں ہیں' دونوں کا دین ایمان ایک جیسا ہے... جیسے سارے یورپی ملکوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ

سب کمبخت ایک ہی باپ کی اولاد ہیں... بالکل ایسے ہی... مگر افسوس کہ طوائفوں کے تو باپ ہی نہیں ہوتے... اور یہ کوئی لون مریم جیسا خدائی معجزہ نہیں ہے بلکہ ان عورتوں کے باپ ہوتے ہیں مگر سامنے نہیں آتے کہ اتنی بہادری کو مردانگی نہیں' بے غیرتی کہتے ہیں اور کوئی بھی مرد اتنا بے غیرت بننے پر آمادہ نہیں ہے... لیکن یہ بات صرف اتنی نہیں ہے سچ تو یہ ہے جہاں سے مرد کی مردانگی ختم ہوتی ہے' وہیں سے عورت کی مردانگی شروع ہو جاتی ہے جو مرد اس ایک جگہ بھی اپنی چودھراہٹ جمانے کو کھڑے ہو جاتے تو عورت کی حکمرانی کا یہ اکلوتا انسٹی ٹیوشن بھی مردوں کے تسلط میں چلا جاتا...

بعض بالکونیوں پر صاف اور گندے کپڑے لٹکے ہوئے ہیں ایک زمانے میں یہاں تانگے والوں کا رش ہوا کرتا تھا کراچی نے صنعتی شہر بننے میں زیادہ سرعت سے کام لیا ورنہ لاہور میں تو پندرہ بیس سال پہلے تک تانگوں کا راج تھا خصوصاً ہیرا منڈی کے لیے تو یہی مرد کا بچہ جائے کرتا تھا اب نہ وہ منظر ہے نہ وہاں... تانگہ ہے ...اب تو ہر طرف سائنس کی ایجادیں دندناتی پھرتی ہیں، ہیرا منڈی میں اب تک دو سنیما تو موجود ہیں ایک نگار دوسرا کمار۔ عجب قافیہ ہے قبل ازیں راکسی نور محل اور شاید ایک اور ہوا کرتا تھا... کمار تو اب بھی بوڑھے تماش بینوں کو گرمانے کا کاروبار کیا کرتا ہے کہتے ہیں چوری چھپے شہر کے شرفاء اب بھی بڑے پردے کا مزا لینے کو آ جایا کرتے ہیں کوئی ٹوٹا پھوٹا تماشبین کبھی کبھار کسی کم صورت طوائف کو اگر سنیما میں لے جاتا ہو تو.. جانے چشم فلک اب تک یہ نظارہ کرتا ہو.. ابتدائی وقتوں میں جب ملک نیا نیا بنا تھا تو کہتے ہیں یہاں کے چھوٹے موٹے عام ہوٹلوں میں بھی عورتیں ڈانس کیا کرتی تھیں.. یوں ہی دھری ہوئی ٹیبلوں کے بیچ سے مٹکتی لہراتی گزر جایا کرتی تھیں جو کوئی دیکھے سو دیکھے جو نہ دیکھے نہ دیکھے... سب کو اپنی اپنی فکر ہے... خواہشوں کا نگر ہے.. تب عام لوگوں کو یا تو یہ بات معلوم نہ تھی یا پھر ان سنی کیا کرتے تھے لوگ... کہ یہ ملک خداداد اسلام کے نام پہ بنا ہے ورنہ یوں عورتوں کو سر عام ہوٹلوں میں ناچنے نہ دیتے...

کچھ بالے خانے ایسے بھی ہیں جو زیادہ آمدنی والے گھرانوں کے ہیں وہاں زیادہ سہولتیں بھی ہیں، ایئر کنڈیشنڈ کے علاوہ وہاں صفائی ستھرائی بھی دکھائی دیتی ہے... سب کو اپنی اپنی منزلوں کی خبر ہے۔ ماحول قدرے زیادہ دلکش ہے یا دکھائی دیتا ہے اس طبقاتی فرق کی وجہ سے طوائفوں کو ایک نئی مشکل کا بھی سامنا ہے کہ انھیں کسی نہ کسی کو داخلی دروازے پر کھڑا رکھنا پڑتا ہے تا کہ کوئی کم حیثیت تماشبین راہ بھٹک کر ادھر کو نکل آئے تو اسے اس کی منزل کی اور بھیج دیا جائے...

*****

ماہ لقا آج خوش قسمتی سے قدرے فارغ ملی خوش خلقی سے پیش آئی جو نصرت کے لیے زیادہ حیران کن ہو سکتا تھا مگر آج بھی نصرت کچھ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے آنا سکا تھا اور سائرس اکیلا ہی آیا تھا...

'بڑے دن بعد آئے؟' ماہ لقا بولی۔

'کیوں انتظار کرتی تھیں کیا؟' سائرس نے بشاشت سے کہا۔

'یہاں آنے والے ہر آدمی کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ کوئی طوائف اس کا انتظار کرتی ہوگی... جو وہ ایسی غلط فہمی پالے تو ہمیں بھی اس کا دل رکھنے کو اس قسم کی خرافات کو بڑھاوا دینا پڑتا ہے، ورنہ...' وہ بولتے بولتے رک گئی۔

'ورنہ کیا..؟'

''نہ سمجھ ہو لکھاری...... جو ایسی باتیں پوچھتے

ہو...... طوائف کیوں کرے کسی کا انتظار...... اسے کوئی کمی تھوڑی ہے جو وہ کسی ایک کے لیے اپنا ٹائم کھوٹا کرتی پھرے...... خیر' تم ان چکروں کو چھوڑو' اپنی سناؤ' کہاں رہے اتنے دن؟''

'تمہاری ایک مالکن کے پاس..'

'پہیلیاں نہ بجھواؤ اور نہ ہی مجھے حیران کرنے میں اپنا وقت خراب کرو... طوائفوں کو حیران ہونے کی عادت نہیں ہوتی یہ الگ بات کہ ہر تماش بین کو بار بار حیران ہو ہو کے دکھانا پڑتا ہے.. چمڑے کے اس کاروبار میں چمک دمک قائم رکھنے کا یہ بھی ایک داؤ پیچ ہے.. ورنہ دنیا میں اب حیران ہونے کو بچا کیا ہے..'

''میں جو بات کہوں گا جو تمہیں حیران نہ کرے تو یہیں بیٹھے بیٹھے اپنا سر کٹا دوں گا پر اس سے پہلے تم مجھے ایک بات بتاؤ... تمہارے لیے بات اتنی خاص نہیں ہے جو اہمیت نہ دو تو منہ بعد میں کھلے اور بات پہلے کہہ دو۔''

وہ قدرے متاثر نظر آنے لگی من ہی من میں سوچتی تھی کہ یہ لکھاری وہ اس روز والا بندہ تو نہیں لگتا کیا ماس کھانے لگا اور کر دی اس نے اپنی عاقبت خراب.. بے چارہ کب تک بچ کے رہ سکتا تھا یہاں تو عجب منڈی لگی ہے جو آ گیا اس پہ لازم ہے کہ خریداری بھی ضرور کرے...

'ہاں بولو' کیا پوچھنا چاہتے ہو... اس کے بعد میں بھی تم سے ایک بات پوچھوں گی مرضی ہو تو بتانا نہ بتانا چاہو تو تردد نہیں کوئی...'

'یہ تم آج اتنی فارغ کیوں ہو؟' سائرس نے کہا۔

'اسے چھوڑو' یہ میں بعد میں بتا دوں گی' وہ پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو...؟'

'خدا قسم' یہ ہی بات تھی..'

'ہائے دیا...... تم بھی بنانے لگے.. یہ بھی کوئی بات ہے جس کے لیے اتنے پاپڑ بیلے..'

سائرس کو ہنسی آ گئی' یقین کرو یہی بات تھی، اصل میں میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہارا دھندہ کھوٹا ہو... تمہیں یوں فارغ اور اطمینان سے بیٹھے لیٹے دیکھا تو تردد ہوا کہ آخر معاملہ کیا ہے!'

'تم سمجھے میں نے دھندہ چھوڑ دیا یا اب لوگوں نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا..'

'دونوں باتیں نہیں سوچیں بلکہ ایک تیسری بات سوچی.. تم جس طرح بن سنور کے بیٹھی ہو' اس سے یہ اندازہ تو کوئی بھی لگا سکتا ہے تم دھندے پر بیٹھی ہو... اور دوسری بات کا مجھے یقین ہے کہ قریب دس برس تک تو گاہک تمہارے پاس آنا نہیں چھوڑ سکتے..'

'اور تیسری بات..' ماہ لقاء کی دلچسپی سوا ہونے لگی۔

'تیسری بات یہ تھی کہ کسی سے جھگڑا ہوا اور تم نے غصے میں آج دھندے سے ہی ناغہ کر لیا ہو... کیا ہوا تھا یہ بات اب بھی تم نے نہیں بتائی..'

'سچ مچ رائٹر ہو... تم سائرس جو کوئی نہ سوچے' وہ تم سوچ سکتے ہو... خیر میں بتاتی ہوں مگر اس سے پہلے یہ کہہ دینا زیادہ ضروری سمجھتی ہوں کہ تم واقعی بڑے اچھے انسان ہو... جو یوں تم نے میرے دھندے کا خیال کیا.. مجھے تمہارے دل کا پتا ہوتا تو اسی دن دھندہ چھوڑ دیتی مگر تم سے قصہ پورا کرتی... چلو آج کر دوں گی... اچھا تو ہوا یوں کہ آج میری بڑی اونچی جگہ پر بکنگ تھی لوگ بھی اتنے اچھے تھے کہ ایڈوانس مانگا تو پوری رقم کی ادائیگی کر دی... عین وقت پر ان کے ہاں کسی کی فوتگی ہو گئی تو فون آ گیا کہ پروگرام کینسل ہو گیا ہے۔ اب میں تو ان کی خاطر بڑی اونچی جگہ سے تیار ہو کے آئی تھی ہمارے ہاں ایڈوانس واپس کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے مگر وہ تو پوری رقم دے چکے تھے میں نے بجھے دل سے کہا کہ کسی کو بھیج کر آدھا پیسے منگوا لیجیے' اس پر وہ بولے کہ جو پیسا اس نظریے سے نکل گیا کہ یہ خرچ ہو چکا ہے اس کو واپس لینے کا

ہمارے ہاں رواج نہیں ہے... تب میں نے مان بڑھانے کو شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اچھا تو پھر آئندہ پروگرام میں شامل کر لیجیے گا۔ یہ پیسا میرے پاس امانت ہے آپ کی... بس یہ سننا تھا کہ ایک دم بھڑک اٹھے اور بولے ایک طوائف اپنے اصول پر قائم رہ سکتی ہے تو ہم کیوں نہیں اب اس رقم کا آپ ذکر بھی نہیں کرو گی جو آپ کو دیا' آپ کا ہی تھا... تب سے میرا موڈ اچھا تھا... اپنے لوگوں کو آئسکریم منگا کے بھی کھلا چکی ہوں تمہیں کھانی ہو تو منگواتی ہوں تمہارے لیے بھی...'

سائرس نے انکار کیا۔

'تمہیں دیکھا تو دل سے آواز آئی کہ ہو نہ ہو آج یہ جو پروگرام کینسل ہوا ہے تو اس کا کارن تم ہی ہو قدرت کا اشارہ ہے کہ مجھے تم سے آج پوری بات کر لینی چاہیے... اب رہی لوگوں کے نہ آنے کی بات تو... باہر بورڈ لگا دیا تھا کہ آج کوٹھا بند ہے... بالکل سینما ہالوں کی طرح کا معاملہ ہے یہ... سچ پوچھو تو طوائفوں کی زندگی بھی ایک تماشا اور تفریح ہی تو ہے...' بولتے بولتے رکی اور بولی اری او شمائلہ' ذرا اس منو کے بچے سے سائرس صاحب کے لیے آئسکریم تو منگوا دے... چل شاباش جلدی کر...'

'دیکھو ماہ لقاء' پلیز' یہ تکلف مت کرو... بس پہلے کی طرح چائے پلا دو...'

'ارے نہیں' چائے پلا کر کبھی نہیں لگتا کہ کسی کی خاطر داری کی گئی ہے.. چائے تو روز کا معمول ہے جیسے اور کام ہیں... روزانہ سے کچھ مختلف ہوتا ہے تب ہی تو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کسی کی مہمانداری کی ہے'

کچھ ہی دیر میں آئسکریم آ گئی.. سائرس نے کھانا شروع کی تو وہ بولی 'ہم سب لوگوں نے ابھی کھائی ہے یہ ساری آپ کو اکیلے ہی کھانی پڑے گی...'

''تسلی سے کھا لو پھر بتانا کہ وہ کون سی بات ہے جسے سن کر میں حیرت سے دیوانی ہو جاؤں گی۔'' ماہ لقاء نے اسے قدرے عجلت سے کھاتے دیکھا تو بولی۔

'میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم پاگل ہو جاؤ گی... بس یہ دعویٰ کیا ہے کہ حیرانی ضرور ہو گی تمہیں...'

'میرے لیے تو یہ بھی دیوانہ اور پاگل ہونے کے لیے کافی ہے'

'تمہیں فیصل تو یاد ہے نا؟' سائرس نے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا

''اس رذیل کو کون بھول سکتا ہے۔''

''تم اس کی رشتے کی بہن کے کپڑے سیا کرتی تھیں۔''

'یہ بھی اچھی طرح یاد ہے۔ بلقیس نام تھا اس کا' وہ بے صبری سے بولی

'وہ ہی بلقیس اسی بازار میں بلبل ہزار داستان میں کوٹھا کرتی ہے'

'ہائے میں مر گئی... یہ کیسے؟؟'

'کہا تھا نا کہ حیران رہ جاؤ گی...!'

'تمہیں مغالطہ لگا ہو گا.. سائرس بابو! وہ تو شادی شدہ تھی پھر غربت اور افلاس سے بھی اس کا واسطہ نہ تھا تم ضرور کسی غلط فہمی میں ہو' ماہ لقاء کو جیسے کسی طور یقین نہیں آتا تھا۔

'اول تو یہ کہ میں اسے پہچان کیسے سکتا ہوں، تقدیر کی چالوں کو پہچاننے کا ہنر سیکھا ہے میں نے بس وہ ہی پتا پھینک کے دیکھا تو حیرانی نے میرے پاؤں جکڑ لیے کہ وہ عین ترپ کا پتا ثابت ہوا... وہ وہ ہی بلقیس تھی... تب مجھے یقین آیا کہ صرف غربت ہی عورت کو طوائف بنانے کا ایک سبب نہیں ہے، اور بھی کئی اسباب ہیں جو عورت کو طوائف بنا دیتے ہیں..'

اس کے بعد سائرس نے بلقیس سے سنی ہوئی پوری کہانی کچھ مختصر کر کے سنائی تو جیسے ماہ لقاء کی سانسوں کا ردھم بگڑ گیا اور وہ یوں ہونق بنی یہ کہانی سنتی رہی کہ اس نے زندگی میں پھر ایک بار یہ سیکھا کہ یہ کسی طور ممکن نہیں کہ قدرت حیرت کا دروازہ کسی بھی انسان پر ہمیشہ کے لیے بند کر دے... جب تک انسان زندہ ہے تب تک حیرتوں کے در بھی کھلتے رہیں گے... سائرس نے بس یہ خیال رکھا کہ بلقیس نے جو چار حیوانوں کو قتل کیا تھا' ان کا ذکر نہیں کیا...

'فیصل!' ساری کہانی سننے کے بعد ماہ لقاء کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا..

'ایک دن مجھے اسے دیکھ کر شبہ ہوا تھا مگر میں یہ کیسے مان لیتی کہ اس جیسی عورت بھی تقدیر کے دھکے کھاتی یہاں اس بازار تک پہنچ سکتی ہے.. دور سے دیکھا تھا... یہاں رہنے والے ایک دوسرے کو جان سکتے ہیں اور اب تو دنیا میں ایسی طغیانی اور طوفان اٹھ رہے ہیں کہ کسی کے پاس کسی کے لیے اتنا وقت نہیں ہے... جن عورتوں نے اس کا کبھی ذکر بھی کیا تو ان کی باتوں سے میرا ذہن کبھی اس مقام تک نہ پہنچا کہ میں باجی بلقیس کو بھی یوں اپنے جیسی قسمت کی ماری طوائف مان لیتی...' وہ رکی اور اٹھتے ہوئے بولی۔

'لکھاری' میں تمہیں اپنی ساری کہانی سناؤں گی اور پوری ہونے سے پہلے جو موت بھی آئی تو اس کے ساتھ بھی نہ جاؤں گی... مگر اس وقت تم مجھ پر اتنی مہربانی کرو اور اتنی مہلت دو کہ میں باجی بلقیس سے مل آؤں' ان سے ملے بغیر میں کچھ بھی تسلی اور شانتی سے نہ سنا پاؤں گی...'

سائرس نے ہلکا سا تبسم کیا وہ جانتا تھا کہ اب یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک اجڑی ہوئی عورت اپنے جیسی دوسری عورت کی ایسی دلدوز کہانی سننے کے بعد بھی چین سے بیٹھی رہے اس کا دل نہ تڑپے وہ ملنے کو دیکھنے کو بیقرار نہ ہو جائے اور عورت بھی ایسی جس سے اس کا ایک ہی شہر کا ایک ہی گھر کا اور ایک ہی مرد کا رشتہ بھی تھا... اس لیے سائرس نے بس اتنا کہا۔' میں بھی ساتھ چلتا ہوں... ورنہ وہ جانے میرے بارے میں کیا سوچے...'

'ہاں' ہاں' ضرور.. تم تو نہ بھی چلتے تو میں تمہارے پاؤں پڑ جاتی اور تمہیں ساتھ لے کر جاتی...'

****

جن دو عورتوں کو ایک ہی آدمی نے ایک جیسی الگ الگ رات میں نامعلوم تاریخ کے بوڑھے کی بیٹیوں کی طرح کنواری سے اولاد جننے والی عورتوں کی صف میں شامل کیا' آج انھی دو عورتوں کا ملن ہونے والا تھا مستقبل کی گود میں جانے کون سے طوفان چھپے ہیں نہ میں جانوں نہ کوئی......

ماہ لقاء نے سائرس کے ساتھ جانے کو بھاری عجلت سے کام لیا کہ جانے اس کے من میں ایسی ہلچل مچی تھی کہ وہ ایک مدت کے بعد اپنی کسی بچھڑی ہوئی ماں جائی سے ملنے جا رہی تھی... کہتے ہیں ایک ہی وقت میں دو سگی بہنوں کو بروئے اسلام کوئی بھی مومن اپنے حرم میں نہیں رکھ سکتا اور دنیا میں اس جرم کی کیا سزا مقرر ہے' یہ کم سے کم کسی عام عورت کو معلوم ہے نہ عام آدمی کو مفتیوں نے یوں بھی ان سب باتوں کو طشت از بام ہونے نہیں دیا جو عورتوں کے حق میں جاتی ہوں اور ایسی باتوں سے بچہ بچہ واقف ہے جو عورت کو سزا دینے اور اس کی تحقیق ٹھکانے لگانے کو حکم کی گئی ہوں... سو کیا کوئی یہ سمجھ رہا ہے کہ ماہ لقاء اور بلقیس دونوں سگی بہنیں ہیں یقیناً ایسا نہیں ہے مگر جو منظر اس سے کی ساعتوں میں سائرس نے دیکھا' وہ کسی بھی طرح سگی بہنوں اور نامعلوم تاریخ کے بوڑھے کی بیٹیوں کے درد سے کم نہ تھا جو بوڑھے کی نسل بڑھانے کو اپنا کنوار پن تیاگ دیے کو قربان گاہ کی بھینٹ جا چڑھیں.. جو صبح ہوئی ہو اور بوڑھے نے ان کی قربانیوں کو عورت کی ہوس گیری سے تعبیر کیا ہو تو عورت کی ساری تاریخ میں اس سے بڑا ظلم کوئی اور ہو نہیں سکتا تھا... سو اگر زمانہ زلیخاں

عرف ماہ لقاء اور بلقیس کو آج فاحشہ اور طوائف کے نام سے پکارے تو دنیا میں اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے... او دنیا ازل سے ظالموں کی نگری ہے...

ماہ لقاء نے اپنی نائکہ کو جو پوٹلی بھر روپیہ اس دن ایڈوانس میں آیا ہوا دیا تھا تو وہ اس روپے کی حفاظت کے خیال سے کب کی اپنے مسکن کی طرف کوچ کر چکی تھی اور ماہ لقاء کی حفاظت کی اب ضرورت ہی کیا تھی وہ تو ایسا مال تھی جو قیمتی ہوتے ہوئے بھی ایسا بے توقیر بھی تھا جسے لوٹنا اور چوری کرنا محال یا پھر وہ ایسا علم تھا جسے جتنا چوری کیا جائے اس میں اتنا ہی اضافہ ہوتا تھا سو اس سے صرف ایک خادمہ مہین سی نام جس کا شائلہ تھا' وہ اس کوٹھے پر محض یہ بتانے کو بیٹھی کہ ابھی اصل مال کی واپسی ہوئی ہے اور یوں ماہ لقاء نے سیڑھیاں اتر کر بلبل ہزار داستان کی راہ لی وہ مختلف پیچیدہ گلیوں سے گزرتی ہوئی اس عمارت کے سامنے پہنچی جس میں بلقیس کا رقص جاری تھا' کیسا ستا سا فلمی سین تھا جب ہانپتے کانپتے ماہ لقاء نے بلقیس کی ڈیوڑھی میں قدم دھرا اس وقت بلقیس ناچ کے ایک قیامت زاویئے سے آسمان سے زمین کی طرف لہرا رہی تھی کہ اس نے زلیخاں کو دیکھا اور اس کے قدم اسی زاویئے میں تھم گئے وہ ایک غش کھائے انسان کی طرح سیدھی ہوئی اور سائرس کی طرف دیکھنے کے بعد اسے ایک لمحہ لگا اپنی اس ماہ لقاء کو پہچاننے میں جو ماضی کی ان ساعتوں میں جب وہ خود بھی ایسی بلقیس نہ تھی جیسی کہ آج... اور وہ صرف زلیخاں تھی' ماہ لقاء نہ تھی... بلقیس تو جانے کب تک سوچتی ہی رہتی کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں مگر ماہ لقاء خوب جانتی تھی' وہ ایسی بے صبری اور جوش محبت سے بلقیس کی طرف لپکی کہ خود بلقیس اس ملن کے لیے اس طرح تو تیار نہ تھی... اور پھر چشم فلک نے ان دو عورتوں کو ایسا دھاروں دھار روتے دیکھا جو لوگوں کو رلانے اور تڑپانے کے ان گنت گر جانتی تھیں..

سائرس کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں اور دلشاد بائی کی بھی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے.... جو چند مستی میں جھومتے تماش بین بیٹھے تھے' ان کی کچھ اور سمجھ میں بھلے ہی نہ آیا ہو مگر وہ یہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ اب اس ماتمی مجلس میں ان کے بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں سو ایک ایک کر کے وہ سب ایسے اٹھے جیسے جنازے کو دفنانے کے بعد کوئی انسانی گروہ خاموشی سے اپنے مستقر کی طرف رواں دواں ہو... کوٹھا خالی ہو گیا اور بلقیس نے ماہ لقاء کو خود سے الگ کرتے ہوئے سب سے پہلا سوال یہ کیا' کیسی ہے تو..؟'

'جیتی ہوں جو اسے زندگی مانتی ہو آپ...؟'

'ہائے' کیسی معصوم اور شاداب تھی اور اب کیسی شکل پہ پھٹکار برس رہی ہے.... میں جانتی تھی کہ تقدیر تجھے بھی یہیں لے آئی ہے پر کبھی ہمت نہیں پڑی کہ کس منہ سے جاؤں اور تجھ سے کیا کہوں یہ کونسا ایسا قابل فخر کام ہے جسے کرتے ہوئے کسی سے ملنے کو دل کرے اور اس کے سامنے سر اٹھا کے بیٹھ سکے کوئی.. تجھ سے بڑی تھی تیری مالکن رہ چکی تھی یہ نہ جانتی تھی کہ تو بھی اسی سانپ کی ڈسی ہوئی ہے جس نے میری رگوں میں زہر اتارا ہے.... یہ تو ان سائرس بابو کی وجہ سے پتا چلا کہ تو بھی ہے یہاں اس خرابے میں... پھر بھی ہمت نہ جوڑ پائی کہ کیا کہوں تجھ سے جا کے جو یہ پوچھوں کہ تو یہاں تک کیسے آئی تو اس کا بھی اب فائدہ کیا ہے... کہ آ تو چکی... اس جہنم میں...'

'آپا' ایسی دیوانگی کہ کسی دوسرے کو بولنے کا موقع ہی نہ دو گی.... یہ تو ٹھیک کہا تم نے.. اب تو چڑیاں چگ گئیں سارا کھیت پر مجھے جو پتا چلا کہ یہ تم ہی ہو تو مجھ سے رہا نہ گیا... بس دوڑی چلی آئی اور سچ پوچھو تو یہ سارا احسان اس لکھاری بابو کا ہی ہے جو آج میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں ورنہ زمانہ تو عجیب قیامت کی چال چلتا ہے اس شہر میں... یہاں تو پڑوسیوں کو بھی اس وقت کسی کے مرنے والے کی خبر ہوتی ہے جب اس کا تیجہ ہو چکتا ہے عجب شہر ہے... تم کیسی ہو... تمہاری کچھ کہانی تو مجھے لکھاری بابو کے کارن پتا چل گئی ہے باقی تم سے سنوں گی..'

'اچھا اتنے عرصے بعد آئی ہے.. میں تجھے کچھ اچھا سا کھلاتی ہوں...' یہ کہتے کہتے وہ دلشاد بائی سے بولی' آپا جو تم جانا چاہو تو چلی جاؤ اب دھندہ تو نہ ہو سکے گا میری بڑی پرانی سہیلی آئی ہے میں تو من جوڑ کے اب اس سے ایسی سب باتیں کروں گی جو ایک مدت سے کرنے کو ترستی ہوں..'

'وہ تو خیر میں اس لکھاری کو دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی یہ ہمیں رستے پہ لا کے ہی چھوڑے گا... پر یہ ماہ لقاء تو اپنی ہی بچی ہے اور میں یہ نہ جانتی تھی کہ یہ اپنی دلنواز کی بچی تیری سنگی ساتھی ہے.. چلو تم دونوں بیٹھو باتیں کرو... اور دیکھو ٹائم سے تالا لگا دینا.. اصول کی بات ہے اور ہمیں اصول توڑنا شوبھا نہیں دیتا'

دلشاد بائی نے ایک نفرت بھری نظر سائرس پر ڈالی تو اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس موقع پر وہ کیا ایکسپریشنز دے کہ ایک طرف دو مدتوں کی بچھڑی بہنوں جیسی ہمجولیاں ایک دوسرے سے مل کے خوب نہال ہوئی جاتی ہیں اور دوسری طرف دلشاد بائی کو اپنے دھندے کے خراب ہونے کی فکر کہ سائرس کی وجہ سے اس کی کئی ساعتیں یوں ہی بنا مال و منال کے ویران چلی گئی تھیں... سو سائرس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور دلشاد بائی دل مسوس کے چلی ہی گئی۔

جب دونوں دیر تک گفتگو سے سیراب ہو چکیں تو بلقیس کی خادمہ کئی کھانے کی چیزیں اور چائے لیکر آ گئی ساتھ میں اس کے اس بلڈنگ میں ایسے ہی کام کرنے والا ایک لڑکا بھی تھا جس کا رنگ گورا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں ان آنکھوں سے بھوک جھانکتی ہوئی اتنی صاف دکھائی دیتی تھی کہ اس کے ذرا ہی دیر بعد خادمہ نے کہا آپا' یہ علی مجھے بہت تنگ کرتا ہے' مفت میں مسخریاں کرتا ہے۔' بلقیس نے اسے گھور کے دیکھا اور بولی کیوں بے بدمعاش' تو اس بازار کے رسم و رواج نہیں پہچانتا یہاں مفت میں تو کوئی اپنا موت بھی نہیں دیتا اور تو ہماری پلی پلائی لڑکی سے مفت میں مسخریاں کرتا ہے..

'معاف کر دو آپا اب نہیں کروں گا مجھے کیا پتا تھا کہ یہ آپ سے شکایت لگا دے گی رہی مفت کی بات تو مجھے تو ابھی پیسے سنبھالنا بھی نہیں آتا جب پیسے ہوں گے تب پھر آپ کو کہنا نہیں پڑے گا' بلقیس اس کی بات سن کر ہنس دی اور وہ شرمندہ شرمندہ سا چلا گیا۔

'تمہیں اعتراض نہ ہو تو تم بھی اپنی لڑکی کو یہیں بلا بھیجو پھر تمہاری باقی کی کہانی میں اور بلقیس ایک ساتھ ہی سن لیں گے' سائرس کی بات سن کر بلقیس نے بھی اس کی تائید کی اور خادمہ کو بھیج کر اسی علی کے ساتھ ماہ لقاء نے بھی اپنی خادمہ کو کوٹھا بند کرا کے وہیں بلوا لیا... اور یوں اس بالا خانے پر جہاں کچھ دیر پہلے تک ایک محفل رقص جاری تھی اور دلشاد کے دھندے میں سائرس نے کھنڈت ڈال کے دو بچھڑی ستم رسیدہ عورتوں کا میل کرایا اب وہاں ایک ایسی محفل آراستہ تھی جس میں ماہ لقاء بنا سازوں کے ایسا دلخراش منظر نامہ اور گیت چھیڑنے والی تھی کہ اس کے بعد بجھو پھر صفِ ماتم بچھنے والی تھی...

'کہانی کہاں سے رکی اور اس میں کہاں وہ بدمزا کرنے والا وقفہ آیا تھا جانے ماہ لقاء کو یاد ہی ہو پر اس نے کہہ دینے کا حوصلہ جوڑنے کو سائرس سے ہی پوچھا کہ بات کہاں تک وہ کہہ چکی تھی پرانے وقتوں میں کہانیاں سنانے والے اسی طرح پوچھا کرتے تھے کہ 'میں کہاں تک پہنچا تھا' اس سے یہ جاننا مقصود ہوا کرتا تھا کہ سننے والے کتنے استغراق سے قصہ سن

رہے ہیں، انھیں یاد بھی ہے کہ قصہ گو یوں ہی بھونکے جاتا ہے، ایسے سب منظروں میں قصہ گو کا حوصلہ بڑھ جاتا تھا کہ سننے والے بھاری دلچسپی سے کتھا کو ملاحظہ کرتے تھے اس زمانے میں بھی ماہ لقاء کو مایوسی نہیں ہوئی اور سائرس نے بالکل ٹھیک جواب دیا سائرس کو یوں بھی ٹھیک ہی کہنا تھا کہ وہ ان ماضی کے سامعین کے مقابلے میں زیادہ پرجوش اور زیادہ ضرورت مند تھا اس کا مقصد محض دلچسپی اور وقت گذاری نہیں تھا اس کا اور بھی کچھ مقصد تھا اچھا ہو کہ سرِ دست ہم ان چکروں میں نہ پڑیں اور ماہ لقاء کی زبانی اس ہولناک رات کا قصہ سنیں جو اسے ڈس لینے کو بزور بازو آمادہ تھی...

"جب میں نے فیصل کے دانت کھٹے کردیے اور وہ وہاں سے دم دبا کر کسی زخمی کتے کی طرح چلا گیا تو جاتے جاتے اس نے فراز اور اکرم کو دھمکی دی کہ اس چھنال کو تو میں تم سے اچھی طرح جانتا ہوں یہ ایسی ہوشیار ہے کہ ہاتھ تمہارے بھی نہیں آئے گی بڑے چھل کپٹ ہیں اس کی چولی میں... تمہیں بھی بس ہری جھنڈی دکھائے گی اور تب تم سے میں اچھی طرح سمجھوں گا ساتھ ہی اس نے جاتے جاتے یہ دھمکی بھی دی کہ زلیخاں تجھ سے تو میں ایسے نمٹوں گا کہ تیری سات پشتیں بھی یاد کریں گی، جاتے جاتے اس حرام زادے نے ایسی آگ لگائی تھی کہ میری سب چالیں چلنے سے پہلے ہی پٹ گئیں، میں نے فراز کو بہت منایا کہ وہ مجھ سے شادی کرلے اور اس کے بعد وہ جو کہے گا' میں کرنے کو تیار ہوں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو تو ایسے چلی گئی تو فیصل مجھے باتوں کے تیروں سے ہی اتنا زخمی کردے گا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ رہے گا جس میں اس کا دیا ہوا زخم اور اس کا چلایا ہوا تیر نہ چبھا ہو... سارے ہنر بے آبرو ہوئے تو وہ بس میری اتنی سی بات مانا کہ دونوں مجھے اس طرح بے آبرو نہ کریں کہ میں خود اپنے آپ کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں... اور یوں وہ کالی سیاہ رات میرا سب کچھ چھین کے لے گئی میں لیٹی اور اٹھ گئی... مگر مجھے نہیں معلوم کہ اس رات ایک عورت کی لاش کو کتے بھنبھوڑ رہے ہیں... فیصل ہار کے بھی جیت گیا تھا اور میں جیت کے بھی ہار گئی تھی... صبح فراز شرمندہ تھا مگر اب کیا ہوسکتا تھا جب چڑیاں چگ گئی تھیں سارا باغیچہ... اب میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں کہاں جاؤں اور خود سے کیا کہوں میں کون ہوں اور دنیا میں اب میرا کیا مقام ہے... میں نے خشک آنسوؤں اور دریا کی طرح دھاندا اڑتے دل کے پانیوں میں خود کو ڈوبتے محسوس کیا دل چاہا کہ ابھی کے ابھی خودکشی کرلوں مگر اس سے کیا ہوگا؟ میری آتما کو شاید کوئی شانتی مل جائے مگر جس مقصد کے لیے میرا سب کچھ لٹ گیا تھا وہ پورا ہو کر بھی ادھورا ہی رہے گا میرے بہن بھائی جانے پھر کن کن مصیبتوں سے گزریں گے' پتا نہیں وہ رذیل فیصل انتقامی کارروائی میں انھیں کسی اور طرح کا نشانہ نہ بناڈالے تب ہی بیٹھے بیٹھے گھٹنوں میں سر دیے مجھے ایک راستا نظر آیا اور میں نے فراز سے کہا کہ وہ راتوں رات مجھے میرے گھر والوں سمیت اس شہر سے نکال دے اور اس طرح کہ فیصل کو بھی خبر نہ ہونے پائے کہ میں کہاں ہوں کیا تو میرا یہ کام کرے گا وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے اس ہمدردی میں میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا کہ میں جہاں بھی جاکے ٹھہروں اسے ضرور اطلاع دوں میں نے اسے یقین دلایا کہ میں جہاں بھی رہوں گی اس کے رابطے میں رہوں گی ایک طرح سے وہ بھوکا کمینہ اپنے مستقبل کی عیاشی کے دروازے کو کھولے رکھنے کا اہتمام کررہا تھا اور میں اس کی نیت کو خوب پہچانتی تھی سو جیسے تیسے میں

اپنے گھر پہنچی میں نے ماں کو بتایا کہ کس طرح میں اپنی عزت کی قیمت پر دونوں بھائیوں کی زندگی بچا کے لائی ہوں اور اس کے باوجود ہم سب کی زندگیاں اسی طرح خطرے میں ہیں ہمیں فوری طور پر یہاں سے جانا ہوگا...

"کہاں......؟" ماں نے لرزتی آواز میں پوچھا وہ تو ایک ایسی کیفیت میں یہ سب سن رہی تھی کہ جیسے اسے کسی نے قید کرکے اس کے سب پر نوچ لیے ہوں اور اسے وہ سب سننے پر مجبور کردیا ہو جو وہ سننا نہ چاہتی ہو... اس کی سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتیں ایک دم سے سلب ہوچکی تھیں اسے یاد تھا کہ کس طرح کچھ ہی دنوں میں زورآور دنیا نے اس سے اس کا سرکا سائیں چھین لیا تھا اور وہ کسی سے یہ تک نہ پوچھ سکی کہ اس کا قصور کیا تھا... تقدیر نے اس بار پہلے سے بھی بڑا ستم توڑا تھا' ایک ہی رات میں اس عورت کے دونوں بیٹے جن کے بغیر جینے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی موت کے منہ سے بچ کر آئے تھے اور اسی ایک رات میں اس کی جوان بیٹی کی آبرو چھین لی گئی تھی اور وہ اتنی بے بس تھی کہ اگر اس ظلم پر ہلکا سا شور بھی مچائے تب بھی دنیا اسی کو جینے سے منع کرنے آجائے گی کوئی اس ظلم کے خلاف نہ بولے گا اور سب کچھ ہی دنوں میں ظلم کو بھول کر بس یہ یاد رکھیں گے کہ زلیخاں آبرو باختہ عورت ہے اور اس تہمت کے ساتھ دنیا ایک عورت کو جینے کا حق کبھی نہیں دے سکتی... میں نے ماں سے کہا جو میری موت سے تو سکھ کی زندگی جی سکتی ہے تو ابھی دنیا والوں کو کچھ پتا نہیں چلا میں خود کو آگ لگا کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کردیتی ہوں کہہ دینا کہ بس چولہے سے جل کے مرگئی... مگر ماں اس بات کو نہ مانی... میں جانتی تھی وہ نہیں مانے گی کیوں کہ یہ حالات کسی بھی طرح اس غریب کے حق میں نہ تھے جو مجھے اپنے حالات کی پرواہ نہ ہوتی تو میں ماں کو بتانے تک زندہ ہی کیوں رہتی.. اور جو میں یہ سوچ کر زندہ تھی تو ماں نے بھی ایسے ہی سوچا کہ ان دو چھوٹے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ وہ اکیلی دنیا کا مقابلہ نہ کرسکے گی... یوں ماں نے بھائیوں کو سوتے سے جگایا اور ہم لوگ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں وہاں سے چلے آئے... اسٹیشن پر فراز اکیلا ملا... اور یوں پانچ انسانوں کا یہ قافلہ کراچی جانے والی ٹرین میں بیٹھ کر یہاں پہنچ گیا... کراچی جانے کا مشورہ بلکہ فیصلہ خود فراز نے ہی کیا اور میں دل میں یہ تہیہ کرچکی تھی کہ کہیں بھی پہنچوں اس حرام زادے سے کبھی کوئی رابطہ نہ کروں گی اور نہ ہی اسے کبھی بتاؤں گی کہ میں کہاں ہوں... اور یوں میرا ایک جنم اپنے اختتام کو پہنچا...

کراچی پہنچتے ہی ممکن تھا کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ بھوک ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا ہمارے پاس کچھ پیسے تو تھے... مگر گھر کوئی نہیں تھا پیسے کب تک چلنے تھے اور بنا چھت کے ہم کب تک باہر رہ سکتے تھے... میں شہر میں یہ دیکھنے نکلی کہ رہنے کا آسرا کیسے ہو... آخر مجھے کئی گھنٹوں کی تلاش کے بعد ایک بنجاروں کی بستی مل گئی وہاں کے مکھیا کو میں نے اپنا مسئلہ بتایا تو اس نے کہا کہ جن حالوں سے ہم یہاں رہتے ہیں جو تو رہ سکتی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے... اس طرح میں نے ماں اور بھائیوں کو اچھی طرح سمجھا کے یہ امید بھی دلائی کہ جیسے ہی مجھے کوئی کام ملے گا تو ہم کسی اور مناسب جگہ پر چلے جائیں گے... اب یہاں تقدیر نے مجھ سے وہ کروایا جو میں نے سوچا بھی نہ تھا.. نہ ہی ایک ہفتے تک بھائیوں کو کام ملا نہ ہی مجھے... گھر میں فاقوں تک نوبت آچکی تھی بھائیوں کا کہنا تھا کہ جو بھی کام دینا چاہتا ہے وہ ٹھور ٹھکانہ پوچھتا ہے اور جب ہم اسے بنجاروں کی بستی کا بتاتے ہیں تو... فوراً ہی چلتا کرتا ہے کیوں کہ یہاں کے لوگ چوری ہونے سے بہت خوفزدہ رہتے ہیں... بس یہی ایک وجہ میری ناکامی کی بھی تھی.. تب مکھیا بشیرے نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بھیک کیوں نہیں مانگتی...؟ صرف اتنا ہی نہیں اس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ سارے مل کے مانگو گے تو سب دلدر دور ہوجائیں گے...

اس غریب نے تو میری ہمدردی میں کہا تھا مگر میرے پیروں تلے سے جیسے کسی نے زمین کھینچ لی ہو اس رات میں سو نہ سکی اور ساری رات بس اسی بارے میں سوچتی رہی اور جب صبح کی اذانیں ہوئیں تو میں نے ایک فیصلہ کرلیا تھا....!!!

(باقی آئندہ)



خلیل جبار



قاتل روح

میری کار کے بریک فیل ہو گئے۔ گاڑی اس وقت ٹھیک ٹھاک رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ خوف سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ موت کا خوف اچھے اچھوں کے ہوش اڑا دیتا ہے، اچانک ایک تیز رفتار ٹرک میری کار کے سامنے آ گیا مگر اسی وقت مجھے لگا جیسے......

اُس بدنصیب سہاگن کا قصہ عجب جو بار بار بیوہ ہو جاتی تھی

میں اسپتال سے رات گئے لوٹا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میں نے بچوں کے کمرے میں جھانک کر دیکھا' دونوں بچے سکون کی نیند لے رہے تھے پھر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ جوں ہی دروازے کے قریب پہنچا' اندر سے نرگس کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ مجھے شدید حیرت ہوئی' اس وقت کون آ گیا' رات کے دو بج رہے ہیں؟ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا لیکن کمرے میں نرگس کے سوا کوئی نہیں تھا۔

''نرگس......! تم کس سے باتیں کر رہی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مم......مم......میں......کسی سے بھی نہیں کر......'' نرگس نے کہا۔

''مجھے لگا' تم کسی سے بات کر رہی تھیں۔'' میں نے الجھن سے کہا۔

''آپ کو وہم ہے۔ میں تو سو رہی تھی' بس پانی پینے اٹھی تھی۔'' نرگس نے کہا۔ ''آج آپ جلدی آ گئے؟''

''ہاں' آج اسپتال میں مریض کم تھے' میں انہیں چیک کر کے آ گیا۔ اگر کوئی ایمرجنسی ہوئی تو میرا اسسٹنٹ ڈاکٹر کلیم فون کر کے مجھے بلا لے گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے نرگس کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر نرگس سے میری شادی کو بہ مشکل تین ماہ ہوئے تھے۔ میری پہلی بیوی ناہید کے انتقال کے بعد میں دو سال سے تنہا زندگی گزارتا رہا تھا۔ بچے زیادہ چھوٹے نہیں تھے اس لیے مجھے پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال' کھانا پکانے اور گھر کے لیے دو مرد ملازم اور ایک آیا موجود تھے۔ پرانے اور قابلِ بھروسہ ملازم ہونے کی وجہ سے میں گھر کی طرف سے بے فکر تھا لیکن پھر بھی مرد ہو یا عورت' دونوں کو زندگی میں ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بیوی کے انتقال کے بعد سے میں خود کو تنہا تنہا محسوس کر رہا تھا۔ رات میں یہ تنہائی کاٹ کھانے کو



دوڑتی تھی۔ اس وقت شدید بے زاری کا احساس ہوتا تھا اور میں سوچتا کہ واقعی مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں' ان میں سے کوئی ایک چھوڑ جائے تو دوسرے کے لیے زندگی گزارنا کس قدر دشوار ہو جاتا ہے۔

اس روز میں نے اپنے دوست کاشف کے موبائل پر کال کی' دوسری طرف سے کوئی نسوانی آواز سنائی دی جس پر میں نے کہا۔ ''جی' کاشف سے بات کرا دیں۔''

''یہاں کوئی کاشف واشف نہیں رہتا۔'' دوسری طرف سے اکھڑ لہجے میں کہا گیا۔

''دیکھیں' میری کاشف سے بات کرا دیں' مجھے اس سے ضروری کام ہے۔'' میں نے کہا۔

''ابھی کہہ رہے ہیں' کاشف سے بات کرا دیں پھر کہیں گے کہ آپ سے بات کرنی ہے' فون بند نہ کرنا۔'' اس نے قدرے غصے سے کہا۔

''دیکھیے محترمہ' میں آپ سے کیوں بات کروں گا' میں آپ کو جانتا تک نہیں۔''

''جان پہچان نکالنے میں تم جیسے گھٹیا مردوں کو دیر ہی کتنی لگتی ہے۔''

''نہ جان نہ پہچان' آپ نے مجھے گھٹیا مرد بھی بنا دیا؟'' مجھے بھی غصہ آ گیا۔

''مجھے نہیں معلوم' تم کون ہو' خود ہی اپنا تعارف کرا دو۔'' اس نے کہا۔

''میں ڈاکٹر زبیر بات کر رہا ہوں۔''

''اچھا' اچھا' آپ ڈاکٹر زبیر بات کر رہے ہیں' یقیناً گاؤں میں آپ کی زمینیں بھی ہوں گی اور ایک پرانی محل نما حویلی بھی ہو گی۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ہاں' یہ سچ ہے۔'' میں نے کہا۔

موبائل پر بات کرنے والی نے اگرچہ مجھ پر طنز کیا تھا مگر گاؤں میں واقعی ہماری زمینیں تھیں جس پر ہاری کاشتکاری کرتے تھے۔ حویلی بھی پرانے زمانے کی بنی ہوئی تھی۔ مجھے شروع سے ہی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا اس لیے اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے شہر آ گیا تھا۔ ہاسٹل شہر میں تھا۔ میں نے بہت محنت سے تعلیم حاصل کی پھر ڈاکٹر بننے پر شہر کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ گاؤں کی زمینوں کی دیکھ بھال میرے بھائی کر رہے تھے۔ میں اس فکر سے آزاد تھا۔

"دیکھیے، مذاق چھوڑیے اور میری کاشف سے بات کرادیں۔"

"تم میرے کیا لگتے ہو جو تم سے مذاق کروں گی؟"

"دیکھیے، میں آپ سے بڑے ادب سے بات کر رہا ہوں اور آپ ہیں کہ مسلسل بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔"

"تم جیسے لفنگے، آوارہ لوگوں سے میں اسی لہجے میں بات کرتی ہوں۔ میں تم جیسے لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہوں، پہلے فرضی نام لے کر فون کرتے ہیں پھر لڑکیوں سے مراسم بڑھا کر اپنے آپ کو کسی وڈیرے اور مالدار آدمی کا بیٹا ظاہر کر کے شادی رچانے کی بات کرتے ہیں پھر لڑکیوں کی زندگی برباد کر دیتے ہیں۔" اس نے کہا۔ اس کی مسلسل بدتمیزی سے غصے کے مارے میرا دماغ کھول گیا تھا۔ آج تک کسی لڑکی نے مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

"آپ ہیں کون؟" میں غصے سے چیخا۔

"میں ڈاکٹر نرگس ہوں اور صدر میں میرا کلینک ہے۔ آئندہ میرے نمبر پر فون نہیں کرنا۔"

میں نے دوبارہ کال کی، بیل جاتی رہی لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ دو تین بار ٹرائی کر کے میں نے موبائل کو رکھنا چاہا تو اچانک میری نظر اس نمبر پر پڑی۔ میں بری طرح چونکا، غلطی میری تھی، میں نے کال ملاتے ہوئے آخر نمبر غلط دبا دیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں بات کو رفع دفع کر دیتا لیکن اس نے مجھ سے جو بدتمیزی کی تھی، اس نے میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے، مجھے اس سے ایک ملاقات کر کے بتانا تھا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھ بیٹھی ہے۔

میں ڈاکٹر نرگس سے واقف تھا، صدر میں اس کا بڑا سا کلینک تھا مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس قدر بدتمیز بھی ہو سکتی ہے۔ اگلے دن میں ڈاکٹر نرگس کے کلینک پر مریض کی حیثیت سے موجود تھا کیونکہ اگر میں اپنا نام بتا کر ملاقات کرنا چاہتا تو شاید وہ ملنے سے انکار کر دیتی اس لیے مریض بن کر ہی آسانی سے ملاقات ہو سکتی تھی، یوں اس سے ملاقات کے لیے مجھے ایک ہزار روپے کی پرچی بنوانی پڑی تھی۔ ڈاکٹر نرگس کی فیس اگر پانچ ہزار روپے بھی ہوتی، میں ضرور ادا کرتا۔ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ایسا کیوں کر رہا تھا؟ اپنی باری آنے پر میں ڈاکٹر کے روم میں داخل ہوا اور ڈاکٹر نرگس کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا، وہ دودھیائی رنگت والی خوبصورت نقش و نگار کی مالک تھی۔ میری نظروں نے اس کے چہرے سے ہٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ چند لمحے اسی طرح گزر گئے، میں محویت سے ڈاکٹر نرگس کو تک رہا تھا۔ وہ بھی خاموش بیٹھی میرے بولنے کی منتظر تھی مگر جب کچھ اور لمحے بھی اسی طرح گزر گئے تو وہ بول پڑی۔

"کیا تکلیف ہے آپ کو؟"

"آپ سے ملاقات کی خواہش تھی، وہ پوری ہو گئی۔" بے اختیار میرے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔

"جی......" اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

"کل غلطی سے آپ کا نمبر مل گیا تھا جس پر آپ نے مجھ سے بہت بدتمیزی کی۔" میں نے کہا۔

"اوہ، تو وہ آپ تھے، کیا یہی بات بتانے کے لیے ہزار روپے خرچ کر ڈالے؟ کیا ہی اچھا ہوتا، یہ

رقم کسی غریب کو دے دیتے؟" ڈاکٹر نرگس کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ بڑے غصے سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن اسے غصے میں دیکھ کر مجھے اس پر پیار آ رہا تھا۔ کل اس نے فون پر بدتمیزی کی تھی تو مجھے غصہ آ گیا تھا اور آج بھی وہ بدتمیزی پر اتر آئی تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے اچھی لگ رہی تھی؟

"میں تو صرف آپ کو سمجھانے آیا ہوں کہ ہر شخص ایک جیسا نہیں ہوتا۔ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس طرح بدتمیزی کی جائے، ویسے بھی آپ ڈاکٹر ہیں، ڈاکٹر کو اتنا گرم دماغ نہیں ہونا چاہیے۔" میں ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ وہ غصے سے مجھے گھورتی ہوئی بولی۔

"آپ جو مجھے سمجھانے آئے تھے، وہ کہہ چکے، اب برائے مہربانی جائیں، مجھے دیگر مریضوں کو دیکھنا ہے۔"

میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"اور ہاں، اپنے ہزار روپے کاؤنٹر سے واپس لے لیجیے گا۔" اس نے اسی طرح غصے سے کہا۔ میں خاموشی سے چلا آیا۔ کوئی اور عورت میری اتنی بے عزتی کرتی تو میں ہرگز پلٹ کر اس کا رخ نہ کرتا لیکن پہلی ملاقات میں ہی وہ میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے بار بار آ جاتا تھا۔ میری عمر عشق کرنے کی نہیں تھی لیکن مجھے واقعی ڈاکٹر نرگس سے عشق ہو گیا تھا۔ میرا دل اسے اپنا بنانے کے لیے مچلنے لگا تھا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ ڈاکٹر نرگس کا ایک کزن خورشید میرے ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا، وہ میری بہت عزت کرتا تھا، میں نے جب اس سے بات کی، وہ بری طرح چونکا۔

"سر، کیا آپ واقعی ڈاکٹر نرگس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"کیوں، اس میں حرج کیا ہے؟" جواباً میں نے بھی اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر، ڈاکٹر نرگس بہت اچھی اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔" خورشید نے کہا۔

"تھی سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں چونکا۔

"ڈاکٹر نرگس کی دو بار شادی ہو چکی ہے لیکن اتفاق سے دونوں شوہر شادی کے تین، تین ماہ بعد ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے جب سے وہ چڑچڑی ہو گئی ہے، بات بات پر غصہ کرنا، مزاج کے خلاف بات ہونے پر سامنے والے کی بے عزتی کر دینا اس کی عادت ہو گئی ہے۔ آپ اس سے شادی کر کے مصیبت مول لے لیں گے۔" خورشید نے کہا۔

"یہ فطری عمل ہے جس عورت کے دو شوہر تھوڑے تھوڑے عرصے میں انتقال کر جائیں، وہ چڑچڑی اور دنیا سے بے زار تو ہو گی نا۔" میں نے کہا۔

"ہاں سر، یہ تو ہے لیکن اب وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس کے رشتے کی بات دو تین جگہ چلی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کا شوہر جو بھی ہو گا، وہ تین ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکے گا اس لیے وہ اب شادی نہیں کرے گی۔" خورشید نے بتایا۔

"شاید وہ اپنے شوہروں کی موت کے صدمے سے نکل نہیں سکی ہے اس لیے اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔ شادی ہونے پر جب اسے خوشیاں ملیں گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

خورشید نے بہت کوشش کی کہ میں اپنا فیصلہ تبدیل کر لوں اور اس شادی سے باز آ جاؤں لیکن میرے ارادے کو دیکھتے ہوئے اس نے ہار مان لی اور شادی کے سلسلے میں ڈاکٹر نرگس کے والدین سے بات کرنے کا وعدہ کر لیا۔

ڈاکٹر نرگس کے والدین کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہیں اپنی بیٹی کو ساری زندگی گھر نہیں بٹھانا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی کا گھر پھر سے بس جائے۔ ان کا یہی کہنا تھا کہ ہمیں کوئی

اعتراض نہیں ہوگا پھر اپنے گھر پر ہی انہوں نے ہماری ملاقات کرا دی۔ اس وقت کمرے میں ہم دونوں ہی تھے۔

''کیا تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں ہے؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''زندگی سے پیار ہے اسی لیے تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے شادی کر کے تم تین ماہ سے زیادہ نہیں جی سکو گے۔''

''زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میری موت اس طرح لکھی ہے تو مجھے مرنے پر کوئی افسوس نہیں ہوگا۔'' میرے اس جملے پر ڈاکٹر نرگس کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''سوری، تمہاری جگہ اگر کوئی نوجوان یہ بات کرتا تو مجھے ہنسی نہیں آتی لیکن تم جیسے بردبار شخص کے منہ سے ایسی بات خاصی مضحکہ خیز ہے۔''

''جتنا چاہے، مذاق اڑا لو مگر یہ حقیقت ہے کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ پلیز، مجھے اپنا لو میرا نہیں تو میرے دو چھوٹے بچوں کا ہی خیال کر لو۔ ان بچوں کو ایک ماں کی ضرورت ہے اور تم ان کی یہ کمی پوری کر سکتی ہو۔''

''تم سمجھتے کیوں نہیں، مجھے شادی راس نہیں آتی۔ تم بھی تین ماہ بعد کسی حادثے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اور پھر سے میری زندگی شوہر کے بغیر کٹے گی۔'' ڈاکٹر نرگس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''یقین رکھو، اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی بڑی مہربانی ہے۔ میں نے زندگی میں جس چیز کی خواہش کی، وہ مجھے مل گئی ہے۔ تمہارے والدین بخوشی راضی ہیں۔ اگر تم بھی حامی بھر لو تو ہم نئی زندگی کی شروعات کریں گے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، اگر تمہیں مرنے کا شوق ہے تو مجھے کیا، تمہیں خطرے سے پیشگی آگاہ کرنا میرا فرض تھا۔ اب تم خودکشی کرنے پر تلے ہو تو ٹھیک ہے، میں شادی کے لیے تیار ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر چلی گئی۔

ڈاکٹر نرگس نے شادی کی حامی بھر لی تھی۔ میرے دل میں خوشی کی پھلجھڑیاں پھوٹنے لگی تھیں۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ آج تک جو میں نے چاہا، وہ حاصل کر لیا تھا۔

ایک چھوٹی سی تقریب میں ہمارا نکاح ہو گیا اور نرگس میری شریکِ حیات بن گئی۔ شادی کا ایک ہفتہ گزرنے پر اس کا مزاج بالکل تبدیل ہو گیا، اس کا چڑچڑاپن اور بات بات پر غصہ کرنا سب ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ ہر وقت کھلی کھلی رہتی تھی اور میری طویل زندگی کی دعائیں کیا کرتی تھی۔ وہ تقریباً روز ہی مجھے حادثات سے بچنے کی دعائیں پڑھنے کی تلقین کرتی تھی۔ میرے پاس ایک نقش بھی تھا جو میری والدہ نے اس وقت دیا تھا جب میں شہر آ رہا تھا۔ یہ ناگہانی آفات و بلیات سے بچنے کا نقش تھا جسے میں ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ ابھی کچھ ماہ پہلے ہی میں نے وہ نقش جیب سے نکال کر الماری میں رکھا تھا۔ جب نرگس سے شادی ہوئی اور اس نے مجھے خبردار کیا کہ میں ہوشیار رہوں تو میں نے وہ نقش مستقل جیب میں رکھنا شروع کر دیا تھا، ساتھ ہی احتیاطاً کچھ وظائف کو پڑھنا بھی اپنا معمول بنا لیا تھا۔

ہماری شادی کو جب چھ ماہ ہو گئے تھے اور مجھے کچھ نہیں ہوا تو ڈاکٹر نرگس بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ دوڑتی رہتی تھی مگر چند دنوں سے میں دیکھ رہا تھا کہ نرگس کچھ پریشانی کا شکار تھی جیسے کوئی چیز اسے تنگ کر رہی ہو۔ اکثر اس کے کمرے سے باتیں کرنے کی آواز آتی تھی اور جب میں کمرے میں جاتا تو وہاں اس کے سوا

کوئی نہیں ہوتا تھا۔

اسپتال میں مریضوں سے فارغ ہونے پر میں کل رات کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے حالانکہ چند دن پہلے تک وہ نارمل زندگی گزار رہی تھی پھر یہ اچانک اسے کیا ہو گیا تھا؟ صبح ڈیوٹی ختم ہو جانے پر میں گھر پہنچا۔ میرا خیال تھا، اس وقت وہ سو رہی ہوگی لیکن وہ جاگ رہی تھی اور خوف سے اس کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے نرگس، خیریت ہے نا؟ یہ تمہارا چہرہ پیلا کیوں ہو رہا ہے؟''

''وو...... وہ...... نثار نے دھمکی دی ہے کہ وہ تمہیں مار دے گا اور میں پھر سے بیوہ ہو جاؤں گی۔'' اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''نثار......؟ کون نثار......؟ اور وہ مجھے کیوں مارے گا، میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟'' میں نے الجھن سے پوچھا۔

''نثار نے ہی میرے دونوں سابقہ شوہروں کو مارا ہے اور اب وہ تمہیں بھی نہیں چھوڑے گا۔''

''مجھے نثار کے متعلق تمام بات بتاؤ، میں کل ہی اسے گرفتار......''

''ایسا ممکن نہیں ہے، بھلا روح کو بھی گرفتار کرایا جا سکتا ہے؟'' وہ پراسرار لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا۔

''ہاں، نثار اس دنیا میں نہیں ہے، اس کی روح مجھے دھمکیاں دیتی رہتی ہے کہ وہ مجھے سہاگن نہیں رہنے دے گی۔'' نرگس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''کیا پاگل پن ہے، جب ایک انسان مر گیا تو پھر اس کی روح کس طرح ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ حقیقت ہے، نثار کی روح نے میرے دونوں شوہروں کو ایکسیڈنٹ میں ہلاک کیا ہے۔ اب اس کی روح پھر سے مجھے نظر آنے لگی ہے اور دھمکیاں دے رہی ہے کہ وہ تمہیں بھی مار دے گی۔''

''اچھا، یہ بات ہے۔'' میں سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ نثار کون ہے اور کیوں تمہاری ازدواجی زندگی کا دشمن بنا ہوا ہے؟''

''یہ میری پہلی شادی سے پہلے کی بات ہے، ایک دن میرے موبائل پر کال آئی، نمبر نیا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر شاید کسی مریض کی کال بھی ہو سکتی ہے، کال اٹینڈ کر لی۔ دوسری طرف سے کسی نوجوان کی آواز سنائی دی۔

''کیا ڈاکٹر نرگس بات کر رہی ہیں؟''

''جی فرمایئے۔'' میں نے کہا۔

''میرے مقدر جاگ گئے، میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔''

''آپ کام کی بات کریں۔'' میں نے قدرے برہمی سے کہا۔

''بس یہی کام تھا کہ آپ کی آواز سننا تھی۔''

''کیا بکواس ہے......'' میں نے غصے سے کہا۔

''جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے، میرا دل قابو میں نہیں ہے، دل یہی کہتا ہے کہ آپ میرے سامنے بیٹھی رہو اور میں دیکھتا رہوں۔'' اس نے کہا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے......''

''یہ بے ہودگی نہیں، میرے دل کی آواز ہے۔ آپ کے ایک دیدار نے مجھے بے چین کر دیا ہے۔''

''مجھے کہاں دیکھ لیا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارا ہاری جانو آپ کے کلینک پر علاج کے سلسلے میں آیا تھا۔ میں اس کے ساتھ تھا، بس کلینک پر آپ کو دیکھ کر میں جیسے اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اب دل میں یہی تمنا ہے کہ آپ مجھے مل جائیں، میں سمجھوں گا کہ دنیا کی تمام نعمتیں مل گئیں۔''

''اچھا تو تم زمیندار ہو اور تمہاری زمینوں پر

ہاری کام کرتے ہیں لیکن تمہیں یہ نہیں پتا کہ کس کو اپنی شریکِ حیات بنانا ہو تو اپنے بزرگوں کو لڑکی کے گھر رشتہ کے لیے بھیجتے ہیں موبائل پر کال کرکے عشق نہیں بگھارتے۔'' مجھے بھی اب اس کی باتوں میں مزہ آنے لگا تھا۔

''مجھے معلوم ہے' یہی طریقہ کار ہوتا ہے لیکن میں اپنے بزرگوں کو بھیجنے سے پہلے آپ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا تاکہ تمہارے مزاج کا پتہ چلے کیونکہ میاں بیوی کا رشتہ جبھی مضبوط ہوتا ہے جب دونوں کے مزاج ایک دوسرے سے ملتے ہوں۔ یہ وہ دور تو ہے نہیں جہاں ماں باپ نے رشتہ طے کردیا' وہیں اولاد نے سرِ تسلیم خم کردیا۔''

''تم درست کہہ رہے ہو' میاں بیوی کے رشتے میں مزاج کی ہم آہنگی بہت ضروری ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

یوں میرا نثار سے موبائل پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ وہ باتوں کا ماہر تھا' ایسی لچھے دار باتیں کرتا تھا کہ میں کھو جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں بھی اسے چاہنے لگی تھی حالانکہ میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن میرے اصرار پر اس نے اپنی تصویر بھیج دی تھی' تصویر کے مطابق وہ بہت وجیہ اور دلکش تھا۔ نثار کی تصویر میں نے اپنی ڈائری میں رکھ لی تھی۔ جب بھی وہ مجھ سے موبائل پر بات کرتا' میں ڈائری کھول کر اس کی تصویر اپنے سامنے رکھ لیتی تھی۔ میں اس کی باتوں کے سحر میں اس قدر کھو جاتی تھی کہ ہر وقت وہ میرے حواس پر چھایا رہنے لگا تھا۔ اب میرے دل کی بس یہی خواہش تھی کہ نثار اپنے والدین کو جلد از جلد ہمارے گھر بھیج دے تاکہ شادی کی بات پکی ہو اور ہم ایک ہو جائیں لیکن نثار رشتے کے لیے اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیجنے کی بجائے ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے؟ لیکن میں اس کی کوئی مجبوری سمجھ کر چپ ہو جاتی تھی۔

ایک دن میں اپنے کلینک میں بیٹھی مریض کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک میرا ہاتھ ڈائری سے لگا اور ڈائری زمین پر گر پڑی۔ میں نے ڈائری اٹھا کر واپس میز پر رکھ دی۔ وہ مریض تیزی سے جھکا اور زمین پر پڑی نثار کی تصویر کو اٹھا لیا۔

''یہ......یہ......نثار کی تصویر......'' اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''کیا تم اسے جانتے ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں' ہاں' یہ ہمارے گاؤں میں رہتا ہے اور زمیندار ہاشم کا ہاری ہے۔''

''کیا......؟'' مجھے زبردست جھٹکا لگا۔

''ہاں' ہاں' آج کل یہ بہت خوش ہے' کہتا ہے' اس کے دن پھرنے والے ہیں' کسی ڈاکٹرنی کو اس سے پیار ہو گیا ہے اور وہ اس سے شادی کرکے شہر میں شاہانہ زندگی بسر کرے گا۔'' اس نے بتایا پھر چونک کر بولا۔ ''کہیں وہ ڈاکٹرنی آپ......''

اس مریض کی بات سن کر میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں' مجھے کمرہ گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔ نثار نے مجھے اتنا بڑا دھوکہ دیا تھا۔ میں نے اپنے غصے' اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''اور......اور......کیا کہتا ہے؟''

''اجی' کام چور قسم کا نوجوان ہے' ہر وقت امیر بننے کے خواب دیکھتا رہتا ہے' موبائل پر پتہ نہیں کتنی لڑکیوں سے دوستیاں کی ہوئی ہیں۔ جیسے ہی کام سے فارغ ہوتا ہے' کسی نہ کسی لڑکی سے بات کرتا رہتا ہے۔''

وہ مریض نثار کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتاتا جا رہا تھا لیکن میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ غصے سے میری حالت بے قابو ہو رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اس طرح مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ پل

بھر میں میرا دل نثار کے لیے نفرت سے بھر گیا تھا۔ میں کل تک جس کے سپنے دیکھ رہی تھی' اب اسے سبق سکھانا چاہتی تھی کہ وہ پھر کسی دوسری لڑکی کو بے وقوف نہ بنا سکے۔ اتفاق سے اس وقت شہر کا مشہور بدمعاش کالو شاہ اپنے کسی دوست کو دوا دلانے کلینک آگیا۔ کہنے کو تو وہ بدمعاش تھا مگر میری بہت عزت کرتا تھا۔ میں نے کالو شاہ کو تمام بات بتا کر اسے کہا کہ وہ نثار کو سبق سکھائے۔ وہ فوراً ہی تیار ہو گیا۔ منصوبے کے مطابق کالو شاہ کو نثار کی ایسی خبر لینا تھی کہ اس کا دماغ درست ہو جائے اور آئندہ وہ کسی اور لڑکی کو بے وقوف بنانے سے پہلے سو بار سوچے۔

اس رات جب نثار کا فون آیا تو میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''نثار' تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو اس حقیقت کے باوجود کہ تم زمیندار ہاشم کے ہاری ہو مگر پیار یہ اونچ نیچ کب دیکھتا ہے۔''

''آں......آ......تت......تت......تم کو یہ بات کیسے پتہ چلی؟'' نثار نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''جو کسی سے محبت کرتا ہے' اس کے بارے میں پوری خبر رکھتا ہے جیسے مجھے ہے یا تمہیں میرے بارے میں ہے۔''

''ہاں......ہاں......میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا لیکن موقع کا انتظار کر رہا تھا۔'' نثار نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

ایک ہفتے تک میں نثار سے اسی طرح باتیں کرتی رہی جس طرح پہلے کرتی تھی پھر میں نے اس سے ملنے کا اصرار شروع کر دیا۔ وہ بھی خوشی خوشی شہر آکر مجھ سے ملنے کو تیار ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی اسکیم کے مطابق نثار کو مقامی پارک میں بلا لیا اور اس کی تصویر کالو شاہ کو دے دی۔ وقت مقررہ پر کالو شاہ پارک پہنچ گیا اور نثار کو بتایا کہ ڈاکٹر نرگس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے' وہ اسپتال میں ہے۔ نثار میرے ایکسیڈنٹ کا سن کر فوراً ہی کالو شاہ کی گاڑی میں مجھ سے ملاقات کرنے چل دیا۔ کالو شاہ اسے اپنے اڈے پر لے گیا جہاں اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مل کر خوب جی بھر کر نثار کی خبر لی مگر زیادہ چوٹیں آنے سے وہ مر گیا...... جس پر کالو شاہ نے رات کی تاریکی میں اس کی لاش بوری میں ڈال کر سنسان جگہ پھنکوا دی۔ نثار کے قتل کا پولیس کوئی سراغ نہ لگا سکی۔

نثار کی موت کا دکھ مجھے بھی ہوا تھا۔ میں اسے مروانا نہیں چاہتی تھی' بس سبق سکھانا چاہتی تھی مگر کالو شاہ کے آدمیوں نے اس پر اتنا تشدد کیا کہ وہ جان سے چلا گیا جس میں میرا قصور نہیں تھا۔

بہرحال وقت اسی طرح گزرتا رہا اور میری شادی ہو گئی۔ ایک روز نثار کی روح اچانک میرے سامنے آگئی اور اس نے مجھے بیوہ کرنے کی دھمکی دی' اس دھمکی کے چند روز بعد ہی میرا شوہر ایک حادثے میں چل بسا۔ کچھ عرصے بعد میری دوسری شادی ہوئی تو نثار کی روح نے اس کو بھی مار ڈالا اور اب وہ تمہیں بھی مارنا چاہتا ہے۔'' نرگس خاموش ہو چکی تھی' اس کی آنکھوں میں خوف نمایاں تھا۔

''ہوں......تو یہ معاملہ ہے' پہلی بات تو یہ کہ نثار کی موت میں تمہاری نیت کا کوئی دخل نہیں تھا' تم نے تو محض اسے نصیحت کرنے کی غرض سے پٹائی کرنے کو کہا تھا۔ دوسرے یہ کہ اپنے بچاؤ کے لیے میں اپنے مرشد جیلانی شاہ سے بات کروں گا۔ وہ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔'' میں نے نرگس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس رات میں اپنی گاڑی میں ڈیوٹی پر جا رہا تھا کہ میری کار کے بریک فیل ہو گئے۔ گاڑی اس وقت ٹھیک ٹھاک رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ میں نے بریک لگا کر اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ دیکھ کر خوف سے میرے ہاتھ پاؤں پھول

گئے۔ موت کا خوف اچھے اچھوں کے ہوش اڑا دیتا ہے یہی میری کیفیت تھی۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرا دماغ قابو میں رہے لیکن ذہن پر خوف غالب تھا۔ اچانک ایک تیز رفتار ٹرک میری کار کے سامنے آ گیا اور مجھے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ اسی لمحے میں نے اپنے مرشد کو یاد کیا۔ اسی وقت لگا جیسے کسی نے گاڑی اٹھا کر فٹ پاتھ پر رکھ دی ہو۔ ٹرک تیزی سے گزر گیا۔ خوف کے مارے میں کچھ دیر تک گم صم کار میں بیٹھا رہا کہ میں کس طرح موت کے منہ سے بچ نکلا تھا۔ جب حواس بحال ہوئے تو میں نے کار سے اتر کر اس کے بریک چیک کیے جو حیرت انگیز طور پر بالکل صحیح تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کچھ دیر قبل کیوں بریک کام نہیں کر رہے تھے؟ اسی وقت نثار کا خیال ذہن میں آیا اور میں تمام صورت حال سمجھ گیا کہ یہ اس کی روح کی کارستانی تھی۔

اس رات پریشانی کے عالم میں اسپتال میں اپنی ڈیوٹی نبھائی۔ بار بار یہ خوف ناک واقعہ یاد آ رہا تھا' تاہم میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس واقعے کے بارے میں نرگس کو قطعی نہیں بتاؤں گا ورنہ وہ اور زیادہ پریشان ہو جائے گی۔ ڈیوٹی ختم ہونے پر میں جب گھر پہنچا تو نرگس بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

''نرگس' کیا ہوا؟ نثار نے پھر کوئی دھمکی دی ہے؟'' میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں رات بھر بے چین رہی ہوں' ایک بھیانک خواب نے میری نیند اڑا دی تھی جس میں دیکھا کہ تمہاری گاڑی کا بریک فیل ہو گیا ہے اور وہ ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرانے والی ہے اور پھر میری آنکھ کھل گئی تھی۔'' نرگس نے بتایا۔

''تمہارے ذہن پر نثار کی دھمکی کا اثر ہے جبھی ایسے خواب آ رہے ہیں۔ دیکھو میرے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا۔'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے نرگس کو تسلی دی۔ بظاہر میں مطمئن ہونے کا تاثر دے رہا تھا لیکن اندر سے خوف زدہ ہو گیا تھا کہ کس طرح نثار کی روح نے میری کار کا بریک فیل کر کے مجھے ٹرک کے نیچے کچل دینے کی کوشش کی اور وہ منظر خواب کی صورت میں نرگس کو دکھا بھی دیا تھا۔ اس صورت حال میں میرے لیے اپنے مرشد سے فوری طور پر ملنا بے حد ضروری ہو گیا تھا چنانچہ میں اسی وقت اپنے مرشد کے پاس چل دیا۔ مرشد جیلانی شاہ کے آستانے پر پہنچا تو وہاں مریدین کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ اتنے ہجوم میں ان سے تفصیل سے بات کرنا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو مسکرا دیئے۔ میں بے چین تھا کہ جلد سے جلد اپنا مسئلہ انہیں بتاؤں۔

''گھبراؤ نہیں' کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' انہوں نے میری کیفیت بھانپ لی تھی۔

''مرشد' وہ روح میری جان کے پیچھے......''

''تمہیں ہم پر اعتماد نہیں۔ ٹرک کے نیچے آ کر کچل جانے میں کیا کمی رہ گئی تھی لیکن تم نے ہمیں یاد کیا اور تم زندہ سلامت ہو۔ جب تک اس کا حکم نہیں ہوتا' کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ جاؤ اب وہ روح کبھی تمہیں تنگ نہیں کرے گی۔'' مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مرشد کا اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا۔ میں خوش خوش گھر چلا آیا۔

اس بات کو کئی سال بیت چکے ہیں' اس دن کے بعد سے پھر کبھی نثار کی روح نے ہمیں تنگ نہیں کیا۔ نرگس بھی بہت خوش ہے۔

واقعی اللہ والوں کا ساتھ دنیا اور آخرت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ آپ لوگوں سے بس یہی کہنا ہے کہ اگر دونوں جہانوں کی بھلائی چاہتے ہیں تو اللہ کے کسی محبوب کا دامن تھام لیجیے۔



ارم زہرا

وہ جو مر چکا تھا

جونہی ثناء کی نظر آئینے پر گئی، اُس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، آئینے میں سے وہی دو لال آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ ان کی دہشت اس کے وجود میں سنسناہٹ دوڑا چکی تھی پھر اچانک......

ایک بے رحم سفاک قاتل کا احوال، پولیس کا کہنا تھا وہ مر چکا ہے



مجرم محمد ایاز، جو زندہ ہے



ثناء تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آفس میں داخل ہوئی اور کرسی پر ڈھے گئی۔

''سب خیریت تو ہے نا؟'' پرنسپل نے اُس کی غیر ہوتی حالت کو نوٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے ایک گلاس پانی مل جائے گا؟'' اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''ہاں' میں ماسی سے کہتی ہوں۔'' پرنسپل نے بیل پر ہاتھ رکھا۔ ماسی آچکی تھی۔ پرنسپل اُسے ہدایت دے رہی تھیں اور ساتھ پانی لانے کا بھی کہہ چکی تھیں مگر ثناء کی حالت مستقل بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور سوچ کے رستے اُس اجنبی کی کھوج میں مبتلا تھے جو سارے راستے اُس کا پیچھا کرتا رہا۔ 'کون ہو سکتا ہے وہ؟' آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے وہ خود سے ہم کلام تھی۔

''مس ثناء......! پانی......'' ماسی نے اُس کی جانب گلاس بڑھایا تو وہ اپنے خیالات سے باہر آ گئی۔

''ثناء......! سب خیریت تو ہے ناں' کوئی پریشانی ہے؟'' پرنسپل محبت اور خلوص بھرے لہجے میں اُس سے دریافت کر رہی تھیں۔

''جی میڈم' سب ٹھیک ہے' بس یونہی مجھے امی یاد آ گئیں' آج اُن کی برسی ہے۔'' بے اختیار ثناء کی آنکھوں میں آنسو دوبارہ بھر آئے۔ وہ پانی کا گلاس ماسی کو لوٹاتی اب کھڑی ہو چکی تھی۔

''اوہ' آئی ایم سوری' تو تم آج چھٹی کر لیتیں؟'' پرنسپل آہستگی سے بولیں۔

''نہیں' اب میں ٹھیک ہوں۔'' وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولی۔

''آج پیریڈ نہیں لو' تم آرام کر لو' میں تمہاری جگہ کسی اور ٹیچر کو بھیج دیتی ہوں۔'' پرنسپل ازراہِ ہمدردی بولیں۔

''نہیں میڈم' آئی ایم فائن' میں چلتی ہوں۔'' وہ پرنسپل سے جھوٹ بولتی ہوئی آفس سے نکل آئی مگر سچ تو یہ تھا کہ آج اُس کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا تھا' اس کے بعد اسے اپنی ماں کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کی دو بڑی بہنیں اپنی اپنی دنیا میں مگن رہتیں مگر اُس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ وہ اپنے پاپا کا بیٹا ہے' اُن کو کبھی یہ خیال نہیں آئے کہ اُن کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کر رہی تھی اور ہوا یہ تھا کہ آج جب معمول کے مطابق وہ گھر سے نکلی تو ایک موٹر بائیک مستقل اُس کی کار کا پیچھا کرتی رہی۔ اس پر سوار نوجوان پستہ قد' گہرے سانولے رنگ کا تھا' اس کی آنکھوں میں پراسراریت تھی جو ثناء کو خوف زدہ کر رہی تھی اور اب یہ سوچ سوچ کر اس کی جان نکل رہی تھی کہ وہ شخص اس کا پیچھا پیچھا کرتے اس کے اسکول تک پہنچ گیا ہے۔

'اب کیا ہوگا' کہیں وہ مجھے تنگ تو نہیں کرے گا؟ ایسے تو میرا روز اسکول آنا محال ہو جائے گا اور اگر یہ بات میں گھر میں سب کو بتاتی ہوں تو پھر میرا جاب کرنا مشکل ہو جائے گا۔' اس کی خود ساختہ سوچوں کے ساتھ ڈر کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت خود کو اس کیفیت سے نکالنا اس کے لیے مشکل ترین امر تھا اور پھر زبردستی وہ خود کو کلاس روم کے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے لگی۔

•......•......•......•

وہ سو رہی تھی کہ کسی نے اُسے جگایا' اُس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا' اندھیرے کی دبیز تہوں سے ایک ہیولہ ابھرا۔ اس سے پہلے کہ ثناء کسی خوف اور اچنبھے کا اظہار کرتی' اس ہیولے نے ثناء کو چپ چاپ رہنے اور اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ثناء سہمی سی بستر پر بیٹھ گئی۔ وہ ہیولہ قدرے دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی لال بھبوکا آنکھیں ثناء کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ کبھی ہاتھ کے اشارے سے ثناء کو بلاتا تو کبھی اس کے ہونٹوں کی جنبش ثناء کو اکساتی کہ وہ اس کے پیچھے آ جائے۔

'جاؤ' چلے جاؤ یہاں سے' مت کرو میرا پیچھا' کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟' اس دوران میں وہ قریب ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اسے کھینچ کر مار چکی تھی اور زور زور سے چلا رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' ثناء کی پسینے سے آلود پیشانی اور اُس کو سوتے میں بڑبڑاتا دیکھ کر عروج اُس کی جانب بڑھی اور تیزی سے اُس کا کندھا جھنجھوڑ دیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

''کوئی بہت برا خواب دیکھ رہی تھیں ناں تم؟'' ثناء کی بڑی بہن عروج نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں آپی......! بہت برا خواب تھا لیکن شکر ہے کہ وہ خواب ہی تھا......'' ثناء نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس دیکھا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے گلاس لبوں سے لگا لیا۔

''چلو کوئی بات نہیں' اب تم اٹھ گئی ہو تو سونا نہیں' کچھ دیر میں نماز کا ٹائم بھی ہونے والا ہے۔ اب اگر سو گئیں تو نماز تو قضا ہونی ہی ہے' ساتھ اسکول کے لیے بھی لیٹ ہو جاؤ گی۔'' عروج اُس کو سمجھاتے ہوئے واپس اپنے بستر پر آ گئی مگر ثناء کو اب نیند کہاں آتی' گزشتہ روز پیش آنے والا واقعہ اُس کے اعصاب پر سوار تھا جس کے باعث وہ خواب میں بھی یہی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

•......•......•......•

یہ پہلوان گوٹھ کا قدرے ایک سنسان راستہ تھا۔ ابھی ثناء کی کار موڑ کاٹتے ہوئے مین روڈ پر آئی تھی کہ سامنے جھاڑیوں کے جھنڈ سے اچانک ہی وہ بائیک سوار نوجوان نمودار ہو گیا۔

''کیسی ہو میری لال پری......؟'' بائیک کو ریس دیتا ہوا وہ ثناء کی کار کے قدرے قریب آ چکا تھا اور نہایت اوچھے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''اپنی بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے......'' ثناء نے نخوت سے اس کے سراپے پر ایک نظر ڈالی اور کار کی اسپیڈ بڑھا دی۔

''سنو' تم پر اتنا غصہ اچھا نہیں لگتا' کم از کم اپنا نمبر تو دے دو۔'' اس کی آواز قدرے تیز تھی اور باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''مت تنگ کرو مجھے' اپنی شکل دیکھی ہے تم نے؟'' ثناء نے اس کی خوفناک آنکھوں کو ایک نظر دیکھا۔ اگلے ہی پل اس کے سراپے پر ایک جھرجھری سی طاری ہو گئی۔

''شکل مت دیکھو' دل دیکھو میرا۔'' اب وہ بائیک انتہائی قریب لا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ بائیک اور کار کا آپس میں تصادم ہوتا' ثناء نے کار کو بریک لگائے اور یوٹرن سے گاڑی دوسرے راستے کی جانب موڑ دی۔ اس وقت خود پر کنٹرول رکھنا اور اس کے بعد کار کو کنٹرول کرنا اُس کے لیے کافی مشکل تھا مگر وہ اپنے حواس پر قابو پاتی ہوئی بالآخر اسکول پہنچ ہی گئی۔

•......•......•......•

وہ رات بھی ثناء نے بہت کرب میں گزاری تھی اور علی الصباح جب گہری دھند کے پیچھے سے سورج نے آنکھیں میچ کر جھانکا تو اُس کی بجھی آنکھوں میں گیلی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ وہ جانتی تھی' کچھ دیر بعد وہ گھر سے اسکول کے لیے نکلے گی اور پھر وہ دو خوفناک آنکھیں اُس کے تعاقب میں ہوں گی اور وہ

ہراساں سی پورا دن اسی ڈر وخوف کے عالم میں گزارے گی۔

''چلو ثناء......! جلدی کرو ورنہ پھر لیٹ ہو جاؤ گی۔'' عروج کھڑکی سے پردے ہٹاتی ہوئی کہہ رہی تھی مگر وہ تو جیسے سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی۔ عروج جا چکی تھی مگر اُسے یوں لگا' کھڑکی سے جھانکتی وہ دو آنکھیں اُسے ہی دیکھ رہی ہیں۔ ثناء نے گھبرا کر پردے برابر کیے اور بھاگتے ہوئے واش روم میں آ گئی۔ وہ نل کھولتی پانی کے چھینٹے اپنے چہرے پر ڈال رہی تھی۔ اُس کے حواس گم ہو چکے تھے اور پھر جونہی ثناء کی نظر آئینے پر گئی' اُس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی' آئینے کی سطح پر وہی دو لال آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔ ثناء برق رفتاری سے دروازہ کھولتی اپنے بستر پر آ گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ان آنکھوں کی دہشت اس کے وجود میں سنسناہٹ دوڑا چکی تھی پھر اچانک ہی اس کے کمرے کی دہلیز پار کرتا ہوا ایک ہیولہ اس کے انتہائی قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر وہی آنکھیں تھیں جن سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ ثناء اسے زاویہ بدل بدل کر دیکھ رہی تھی مگر اس چہرے کی ہیبت کذائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''چلے جاؤ یہاں سے......'' وہ ساری ہمتیں مجتمع کر کے چلائی۔

''ثناء......! کیا ہوا ہے تمہیں؟'' اس کے والد اس کا ہاتھ تھامے حیرت سے سوال کر رہے تھے اور وہ پھٹی نظروں سے انہیں گھور رہی تھی۔

''ارے' تمہیں تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ چلو شاباش' لیٹو تم۔'' وہ ثناء کی تپتی پیشانی پر ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے۔ ''میں ابھی تھرما میٹر لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئے جبکہ ثناء کے وجود پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ نقاہت کا احساس بڑھ گیا تھا جیسے کسی نے اس کی رگوں سے لہو نچوڑ لیا ہو۔

•......•......•......•

ثناء پورے ایک ہفتے بعد ڈر کے خول سے باہر آئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا' اب اگر وہ شخص اس کا پیچھا کرے گا تو وہ ڈر کے نہیں بھاگے گی بلکہ پوری ہمت اور دلیری سے اس کا سامنا کرے گی' سو اس نے جیسے ہی پہلوان گوٹھ کے راستے پر اپنی گاڑی کی ریس بڑھائی' ٹھیک اسی وقت اس کے سامنے وہی شخص اپنی بائیک پر نمودار ہوا مگر آج وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک اور شخص اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ بائیک تیزی سے ثناء کی کار کے سامنے رکی جس کے باعث ثناء نے کار کو بریک لگائے تھے۔

''بھائی' اس نے پورے ہفتے انتظار کروایا ہے' اس کو اس کی سزا دینی چاہیے۔'' یہ اجنبی شخص تھا جسے ثناء پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''نہیں یار' ابھی یہ اپنا نمبر خود دے دے گی' اس کو اندازہ ہے میری بے تابی کا۔'' وہی اسرار بھری آنکھیں' مکروہ چہرہ اور لبوں کی جنبش......

''تم دونوں اپنی منحوس شکل لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ...... تمہیں نمبر دینا تو دور کی بات' اب اگر آئندہ اس راستے پر نظر آئے تو میں تمہاری کمپلین پولیس سے کر دوں گی۔'' ثناء نے انتہائی سخت لہجے میں تنبیہ کی۔

''بھائی' اس کی اتنی جرات' اس کو کیوں نا اغوا کر لیا جائے؟'' فرنچ داڑھی والا شخص طیش کے عالم میں آگے بڑھا۔

''ہاں' یہ صحیح ہے' یہ سالی ایسے نہیں مانے گی......'' دوسرا بھی آگے بڑھا مگر ثناء نے برق رفتاری سے گاڑی ریورس کی اور تیزی سے ایک راستے پر ڈال دی۔ ان دونوں کو بائیک پر سوار ہونے

اور اس کا پیچھا کرنے میں جتنا وقت درکار تھا' اتنی دیر میں ثناء مختلف راستوں سے ہوتی گاڑی کا رخ واپس گھر کی طرف کر چکی تھی۔

•......•......•......•

'اف...... مجھے اغوا کرنے کی کوشش......' یہ سوچ کر ثناء کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ 'اس کی اتنی ہمت ہو گئی ہے کہ اب وہ اپنے دوست کے ساتھ مل کر مجھے اغوا کرنا چاہتا ہے؟ اس طرح میرا تو گھر سے نکلنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ کیوں ناں' میں پولیس اسٹیشن میں اس کی کمپلین لکھوا دوں؟'' اور پھر وہ اپنی سوچوں کو عملی جامہ پہناتی گلستانِ جوہر تھانے کا نمبر ملا چکی تھی۔

سب انسپکٹر عادل جو عرصۂ دراز تک شارع فیصل تھانے میں انویسٹی گیشن افسر متعین رہ چکے تھے' وہ ان دنوں گلستانِ جوہر میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ثناء کی بات سن کر ان کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ ثناء جس شخص کے بارے میں ان کو بتا رہی تھی' وہ شخص اُن کے ریکارڈ کے مطابق مر چکا تھا۔

''تمہیں جس شخص نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی' کیا واقعی اس کا حلیہ یہی ہے؟'' انہوں نے ایک بار پھر ثناء سے سوال کیا۔

''انسپکٹر صاحب! میں آپ سے مذاق نہیں کر رہی۔ یہاں میری جان پہ بنی ہے اور آپ بجائے اس غنڈے کو گرفتار کرنے کے' مجھ سے سوال پہ سوال کر رہے ہیں؟ اگر کل میرے گھر والے میرے اغوا کی رپورٹ آپ کے پاس لکھوانے آئیں تو شاید تب آپ کو میری بات پہ یقین آ جائے گا۔'' ثناء غصے سے کہتی لائن کاٹ چکی تھی۔

'عجیب بات ہے' یہ لڑکی جس شخص کے بارے میں بتا رہی ہے' وہ تو پولیس ریکارڈ کے مطابق ڈیڑھ سال قبل قتل ہو چکا ہے۔ اس کا نام ایاز خان تھا اور وہ گلستانِ جوہر کا رہائشی اور بھتہ گروپ کا کارندہ تھا۔' اسی الجھن میں سب انسپکٹر عادل' ثناء کا نمبر ملا چکے تھے۔

''سنو بی بی! جو شخص تمہارا تعاقب کر رہا ہے' تمہیں دھمکا رہا ہے اور آج اس نے اغوا کرنے کی کوشش بھی کی ہے' وہ حقیقت میں مر چکا ہے اور میرے پاس اس کی موت کے واضح ثبوت بھی موجود ہیں۔''

''تو کیا یہ اس کا بھوت ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے اتنے دنوں سے؟'' ثناء کے لہجے میں تشویش تھی۔

''بی بی' میں نے ایسا کب کہا؟ ہو سکتا ہے' کوئی اس کا ہم شکل ہو؟''

''اس کا ہم شکل ہے یا اس کا بھوت لیکن وہ جو کوئی بھی ہے' اس نے میری زندگی کو اجیرن بنایا ہوا ہے۔ اگر آپ کچھ نہیں کر سکتے تو میں اب خود ہی اس سے نمٹ لوں گی۔'' ثناء ایک بار پھر لائن کاٹ چکی تھی۔

'کہیں وہ حقیقت میں کوئی بھوت تو نہیں؟ لیکن نہیں' وہ کوئی بھوت نہیں ہو سکتا۔ آج اس کے ساتھ اس کا دوست بھی تو تھا مگر اس کی پراسرار آنکھیں...... اور پھر وہ کیوں مجھے اپنے اردگرد محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کہیں میرے قریب ہی ہو؟ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں ہے یا پھر خوف کی علامت؟ جبھی وہ میرے اعصاب پر سوار رہتا ہے ہر وقت لیکن سب انسپکٹر کی بتائی گئی بات کسی حد تک باعثِ تشویش بھی تو ہے۔'

•......•......•......•

سب انسپکٹر عادل ابھی اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ ڈیوٹی انسپکٹر نے اطلاع دی۔ پہلوان گوٹھ کی

ایک پرائیویٹ اسکول ٹیچر ثناء اپنی آلٹو کار میں اسکول سے گھر جارہی تھی کہ اسے فائرنگ کر کے قتل کردیا گیا ہے۔

''کیا ثناء کا قتل ہوگیا ہے؟'' سب انسپکٹر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ برق رفتاری سے سیٹ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''ملزم بہت شاطر اور چالاک تھا کیونکہ قتل کرنے کی کوئی اصلی وجوہ سامنے نہیں آرہی تھیں۔ ثناء کا موبائل' پرس میں پچیس ہزار روپے اور اس کی کار جوں کی توں تھی مگر اُسے کس بنا پر قتل کیا گیا ہوگا' کہیں کوئی محبت وجبت کا چکر تو نہیں؟'' ڈیوٹی آفیسر اپنے تئیں وجوہات بیان کررہا تھا۔

''چلو میرے ساتھ' تفتیش شروع کرتے ہیں' یقیناً ثناء کو آج پھر اغوا کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی اور دورانِ مزاحمت اسے گولی مار کر ہلاک کردیا گیا' آہ......'' سب انسپکٹر عادل نے تاسف کے انداز میں اپنی گردن ہلائی۔

''لیکن میرے لیے پریشان کن بات یہ ہے کہ ثناء نے دو روز قبل جس شخص کا حلیہ مجھے بتایا ہے' وہ پولیس ریکارڈ کے مطابق مر چکا ہے اور اس جیسی شکل وصورت اور جسامت کا ملزم و قاتل میری انویسٹی گیشن کے مطابق کوئی نہیں ہے۔'' سب انسپکٹر عادل اپنی رو میں بولتے چلے جارہے تھے۔

''سر' آپ کس ملزم کی بات کررہے ہیں؟'' ڈیوٹی انسپکٹر نے مداخلت کی۔

''ایاز خان کی......'' سب انسپکٹر عادل کی نظریں خلا میں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں اور وہ پرسوچ انداز میں کہہ رہے تھے۔ ''اس بات کو تو تقریباً ڈیڑھ سال گزر چکا ہے' کہیں ایسا تو نہیں' ایاز خان کی روح بھٹک رہی ہو؟'' ڈیوٹی انسپکٹر قدرے محتاط انداز میں گویا ہوا۔

''ارے' ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ ایک روح کیوں کسی لڑکی کا قتل کرے گی؟'' سب انسپکٹر عادل نے اسے گھورا۔

''سر' میں نے سنا ہے' ایسے افراد جو بے گناہ لوگوں کو قتل کردیتے ہیں' ان کی روحیں بھٹکا کرتی ہیں۔''

''اپنی قیاس آرائی بند کرو اور مجھے یہ کیس دیکھنے دو۔'' سب انسپکٹر عادل بولے۔ دونوں اپنی اپنی باتوں میں محو واردات کی جگہ پہنچ چکے تھے۔ ثناء کی کار پولیس اسٹیشن پہنچائی جارہی تھی جبکہ ثناء کے پرس کی تلاشی کے بعد اس کے ورثاء کو اطلاع دی جاچکی تھی۔

•......•......•......•

ابھی ثناء کے کیس کی گتھیاں مکمل طور پر سلجھی نہیں تھیں کہ گلستانِ جوہر سے ہی تین کال گرلز کے اغوا کی خبر سب انسپکٹر عادل کو ملی اور پھر دورانِ تفتیش ہی دو کال گرلز ایک لاکھ روپے تاوان کے عوض بازیاب ہوگئیں جبکہ تیسری کو تاوان نہ ملنے کی وجہ سے قتل کردیا گیا۔ ملزم کا سراغ لگانے کی غرض سے جب ان دو کال گرلز کا بیان ریکارڈ کیا گیا تو سب انسپکٹر حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگے کیونکہ دونوں بھی ملزم کا وہی حلیہ بیان کررہی تھیں جو ثناء نے بتایا تھا۔

''یاالٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا واقعی ایاز خان کی روح بھٹک رہی ہے یا پھر کوئی اس کے بھیس میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کررہا ہے؟'' اسی دوران وزیر اعلیٰ سندھ کے پائلٹ اقبال کاشمیری کو فائرنگ کر کے قتل کردیا گیا۔ عینی شاہدین کے مطابق قتل کرنے والا ملزم اور کوئی نہیں' ایاز خان ہی تھا اور پھر یکے بعد دیگرے دو لڑکوں اسد اور اجمل کے قتل کی بھی اطلاع موصول ہوئی۔ قتل کرنے والا انتہائی سفاکی سے قتل کرنے کے بعد نجانے کہاں غائب ہورہا تھا؟

گلستانِ جوہر کے رہائشیوں کے لیے ان کا علاقہ شہر آسیب بن چکا تھا۔ ان کے مطابق ایاز کی روح بھٹک رہی ہے' جبھی وہ بیک وقت مختلف جگہوں پر نظر آتا ہے۔ آسانی سے لوگوں کا قتل عام کرتا ہے اور پھر غائب ہوجاتا ہے کیونکہ پولیس اور سیکورٹی کے ادارے اب اتنے کمزور بھی نہیں کہ ایک مطلوب دہشت گرد کو پکڑ نہیں سکیں' یہ یقیناً کسی روح کا کام ہے اور یہ روح ایاز خان کی تھی؟

•......•......•......•

کراچی پولیس کے سینئر تفتیشی افسر ڈی ایس پی قمر اور ان کی ٹیم کے سب انسپکٹر عادل کے لیے یہ شخص معمہ بن چکا تھا۔ ایک باقاعدہ تفصیلی میٹنگ کے بعد سب انسپکٹر عادل نے ایدھی قبرستان کا دورہ کیا جہاں انہیں ایاز خان کی قبر مل گئی۔ نادرا سے جاری ہونے والا ایاز خان کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی ان کے اوسان خطا کیے دے رہا تھا جبکہ علاقے کے لوگ ایاز خان کی بھٹکتی روح سے بچنے کے لیے مختلف علماء سے رجوع کررہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وظیفے اور خود کو دُعاؤں کے حصار میں لے کر نکلنے سے ایاز خان کی روح ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔

کراچی قائد آباد منزل پیٹرول پمپ کے قریب 16 اگست کو دو دوستوں میں جھگڑا ہورہا تھا۔ تلخ کلامی کے باعث دونوں نے ایک دوسرے پر پستول تان لی۔ شومئی قسمت' اسی دوران پولیس کی موبائل کا گزر وہیں سے ہوا' پولیس اہلکاروں نے دونوں کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک ملزم عاطف کے کے گلستان جوہر کا رہائشی اور بھتہ گروپ کا کارندہ ہے۔ اسپیشل انویسٹی گیشن سیل

غزل

محفل میں تم نہ آئے، زمانے گزر گئے
آنکھوں کو چین پائے، زمانے گزر گئے

کھوئی ہوئی ہے کب سے تو اے شب وصال
تجھ کو گلے لگائے، زمانے گزر گئے

پوچھو نہ حال اب کے میرے اضطراب کا
باتیں جو کہہ نہ پائے، زمانے گزر گئے

سوتا نہیں ہے میرے اندر کا ایک بچہ
لوری اُسے سنائے، زمانے گزر گئے

کب تک اُٹھائے رکھوں یہ زندگی کا بوجھ
کاندھوں پہ سر اٹھائے، زمانے گزر گئے

پہلے تو دل لگی کے لیے وہ ملا ندیم
پھر مجھ سے دل لگائے، زمانے گزر گئے



شفیق احمد ندیم

میں جب ملزم عاطف کے کے کو منتقل کیا گیا تو پولیس افسران کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا کیونکہ عاطف کے کے' ایاز خان عرف عاطف کے کے تھا۔ وہ مرا نہیں تھا بلکہ اس نے مرنے کا ڈھونگ رچایا تھا حالانکہ یہ بات تصدیق شدہ تھی کہ ایاز خان کی نعش 16 جنوری 2011ء کو پاک کالونی کے علاقے سے ملی تھی۔ اس کی تدفین بھی ہو چکی تھی اور اس کی قبر بھی موجود تھی۔ اس کے گھر والوں نے اس کا سوئم اور چہلم بھی کیا پھر مردہ ایاز خان کیسے زندہ ہو گیا؟ پولیس ریکارڈ میں ایاز خان کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ' پوسٹ مارٹم رپورٹ اور اس کے قتل کی ایف آئی آر بھی موجود تھی۔

اور پھر سب انسپکٹر عادل کی اسپیشل انویسٹی گیشن میں بالآخر ایاز خان عرف عاطف کے کے نے چپ کا قفل توڑ دیا تھا۔ ایاز خان عرف کے کے نے بتایا تھا کہ میں تین بچوں کا باپ ہوں۔ خود کو جرائم کی دنیا سے نکالنے کے لیے میں نے اپنے کزن ارشد کا سہارا لیا' ارشد نے مجھ سے کہا کہ میں ایسا کام کروں گا کہ تو زندہ رہے گا لیکن کاغذوں پر تیری موت ہو جائے گی' پس ارشد نے 2010ء میں نیو جوبلی انشورنس سے میری انشورنس کروائی اور بیمے کی رقم ایک لاکھ 45 ہزار روپے بھی ادا کی' اس پالیسی کے مطابق اگر میری موت طبعی ہوئی تو میرے وارثان کو 70 لاکھ روپے اور اگر میری موت غیر طبعی ہوئی تو میرے اہلِ خانہ کو ایک کروڑ 5 لاکھ روپے ملنے تھے۔ میں نے بیمہ پالیسی پر دستخط کر دیئے اور پھر ہم نے لاوارث نعش کی تلاش شروع کر دی جو ہمیں ایدھی سینٹر سے باآسانی مل گئی۔ اس کے بعد باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت اس لاش کی تدفین ہوئی بلکہ اس قبر پر اپنے نام یعنی ایاز خان کے نام کی سنگِ مرمر کی تختی میں نے خود ہی نصب کی۔ یوں میں اپنے گروپ کے لوگوں کے لیے مر گیا...... میں نے کچھ عرصہ لاہور میں سکونت اختیار کی اور پھر ایک نئے نام عاطف کے کے' کے ساتھ دوبارہ کراچی کے شہر گلستان جوہر آ گیا مگر میری بدقسمتی کہ میں پکڑا گیا اور یوں بیمہ کی ایک کروڑ روپے کی رقم کی وصولی کے لیے میں نے جو ڈرامہ رچایا' جو کلیم داخل کیا تھا' افسوس' وہ سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔

•......•......•......•

قارئین......! ایاز خان عرف کے کے کی زندہ روح اس وقت عدالتی ریمانڈ پر کراچی سینٹرل جیل کے زیر سماعت قیدیوں کے بیرک میں انتہائی بے چین اور پریشان کن صورت حال سے دوچار ہے۔ اس کے ساتھ موجود درجنوں قیدی ایاز خان عرف کے کے' سے تنگ آ چکے ہیں۔ یہ رات کو چیخ مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ کہتا ہے' میری روح مجھے سونے نہیں دیتی' میں کبھی ان اپارٹمنٹس کو دیکھتا ہوں جہاں میں کھڑے ہو کر فائرنگ کرتا تھا اور بے قصور لوگوں کو بڑے ہی آرام سے مار دیا کرتا تھا۔ مجھے کبھی وہ پل نظر آتا ہے جہاں میں نے ایک نوجوان کو گولی مار کر اس سے گاڑی چھینی تھی' مجھے اس بلڈر کی روح بھی بے چین کرتی ہے جس سے بھتے کی رقم نہ ملنے پر میں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور میرا سکون اس وقت برباد ہو جاتا ہے جب میرے خیالوں میں ثناء کا چہرہ گھوم جاتا ہے۔ میں نے کتنی بے دردی سے اس کے دماغ میں گولیاں اتاری تھیں' صرف اس وجہ سے کہ وہ مجھ سے دوستی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یقیناً آج میرے ہاتھوں مرنے والے درجنوں افراد کی روحیں میرے تعاقب میں ہیں۔ آج نہ میری روح میرے قابو میں ہے اور نہ میں ان کی بے چین روح کو مطمئن کر سکتا ہوں۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ زندگی بھر میں بھٹکتا رہا' اب تا قیامت میری روح بھٹکتی رہے گی۔

مسعود جاوید



پاکستان کا مسافر

آتش کا خیال

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

ہندوستان کی سرزمین سے جڑی ایک معروف صحافی کی سفر کہانی۔ پہلا حصہ

مسعود جاوید کا شمار وادیٔ مہران کے دل شہر حیدرآباد کے معروف اور معتبر صحافیوں' ریڈیو ڈراما نگار' فیچرز رائٹرز میں ہوتا ہے۔ آپ نے بھارت کا یہ سفر باوجود اس کے بہت سالوں پہلے کیا ہے لیکن اُن کے اِس سفرنامے ''ہندوستان میں پاکستان کا مسافر'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ مسعود جاوید کے ''کل'' والے مشاہدے اور تجزیئے کے تناظر میں بھی آج کے ہندوستان اور پاکستان کی تصویر دکھاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ برا وقت کہہ کر نہیں آتا' اسی طرح جب ہم پر برے وقت نے اپنا سایہ ڈالا تو اس نے نہ تو کوئی پیشگی اطلاع دی اور نہ ہی کسی قسم کا اشارہ کیا بلکہ بیٹھے بٹھائے ہمارے ذہن میں بھارت گھومنے کا خیال ڈال دیا اور وہ بھی بذریعہ ٹرین اور چونکہ قسمت کے لکھے کو ٹالنا ہم جیسے انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے لہٰذا ہم نے بھی برے وقت کی دستک پر خوش آمدید کہا اور کاغذی کارروائیاں مکمل کرنے کے بعد اپنے سفر کے دو ساتھیوں آفتاب اور اقبال غوری کے ساتھ (جن کی خاصیت ہندی سے واقفیت تھی۔)' کراچی ایکسپریس سے حیدرآباد تا لاہور کا ٹکٹ لے لیا اور اپنی ذہنی الجھنوں کی دعوتِ عام سے بے خبر ایک دن بھارت کے لیے چل پڑے۔

ٹرین حسبِ معمول صرف ساڑھے چار گھنٹے لیٹ روانہ ہوئی اور یہی وجہ تھی کہ جب ہم لاہور پہنچے اُس وقت تک سمجھوتہ ایکسپریس کو لاہور اسٹیشن چھوڑے ڈھائی' تین گھنٹے گزر چکے تھے اور مجبوراً ہمیں اسٹیشن کے نزدیک اپنے مخصوص ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا جس کا کرایہ سردیوں کے موسم میں بھی ایئر کنڈیشنڈ ہونے کی وجہ سے چار گنا زیادہ ہو چکا تھا

اور نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق ہم نے رات گزارنے کے لیے نہ صرف کرایہ ادا کیا بلکہ شکر بھی ساتھ ہی ساتھ ادا کر دیا کہ اگر ہوٹل میں کمرہ نہ ملتا تو ہمیں وہ رات پلیٹ فارم پر ٹھٹھرتے اور سکڑتے گزارنی پڑتی۔ بہر حال نیا دیس عوامی انداز میں دیکھنے کی خوشی میں جوں توں کر کے رات گزاری اور صبح سات بجے ہم لاہور کے اس پلیٹ فارم پر قطار میں لگے ہوئے تھے جہاں ہم جیسے اور بھی لوگ زندگی کے ایک نئے تجربے سے گزرنے کے لیے شاید رات ہی سے قطار بنا چکے تھے۔ خدا خدا کر کے سورج نے سر ابھارنا شروع کیا۔ صبح کے سات آٹھ پھر نو اور پھر ساڑھے نو بجے تھے جب پلیٹ فارم پر بنے آہنی جنگلے میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔ ہم نے اچک اچک کر دیکھا تو پتہ چلا کہ کسٹم کا عملہ اپنی ڈیوٹیاں سنبھال رہا ہے۔

قطار نے رینگنا شروع کیا اور اسی رفتار سے ہم بھی آگے بڑھنے لگے اور پھر جب ہم جنگلے میں داخل ہوئے تو سیاحت کی مخصوص خوشی بھی ہمارے ساتھ شامل تھی اور اسی خوشی کے سائے میں جب مسافروں کے ہجوم میں ہم امیگریشن کے کاؤنٹر پر پہنچے اور اپنا پاسپورٹ بمعہ ویزا و ہیلتھ سرٹیفکیٹ وہاں براجمان ایک صاحب کے ہاتھ میں تھمایا تو انہوں نے کاغذات دیکھنے کی بجائے ہمارے دوسرے ہاتھ کی طرف دیکھا اور اسے خالی پا کر تحکمانہ انداز میں کہا۔

"سو روپے۔"

"جی......؟" ہم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

"سو روپے؟" انہوں نے سابقہ لہجے میں ایک مرتبہ پھر دہرایا۔

"کس بات کے بھائی؟" ہم نے پوچھا اور جواب میں انہوں نے ہمارے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات کو غور سے دیکھا۔

"پاسپورٹ انٹری کے۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے اس قسم کی کوئی فیس تو نہیں ہوتی ہے۔" ہم نے کسی قدر بلند آواز میں کہا اور شاید یہ ہماری بلند آواز کا اثر تھا کہ آس پاس کے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور شاید لوگوں کی یہ توجہ دیکھ کر ہی ان صاحب نے کسی قدر دبے لہجے میں کہا۔

"شناختی کارڈ لایئے۔"

ان کا سوال کچھ عجیب سا لگا کیونکہ شناختی کارڈ کے بغیر پاسپورٹ نہیں بن سکتا اور جب ہم نے پاسپورٹ دے دیا تو شناختی کارڈ کا مطالبہ ہمیں کچھ عجیب سا ہی لگا تھا اور یہ ہی بات جب ہم نے ان سے کہی تو جواب میں انہوں نے ہمیں بہت ہی غور سے دیکھا۔

"آپ پڑھے لکھے لگتے ہو اس لیے چھوڑ دیتا ہوں۔"

انہوں نے گویا ہماری قابلیت کا سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہوئے ہمارے ساتھ رعایت برتی اور پاسپورٹ پر ٹھپہ لگا دیا۔ اپنی قابلیت کا اعتراف سن کر ہم نے انہیں انگریزی میں "تھینک یو۔" کہا اور مڑے جہاں سادے لباس میں ایک شخص تین مسافروں سے فی مسافر چار سو روپے کا سودا کر رہا تھا اور ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ تینوں مسافر اپنے اپنے پاسپورٹ میں فارن ایکسچینج کا اندراج کرائے بغیر آ گئے تھے اور مذکورہ شخص جو شاید اسی متعلقہ محکمہ سے تعلق رکھتا تھا' ان مسافروں سے چار سو روپے فی کس کے حساب سے یہ کوتاہی مک مکا کرانے میں مصروف تھا۔

بھیڑ میں راستہ بناتے ہوئے ہم امیگریشن سے نکل کر کسٹم کے حصے میں آ گئے جہاں گیٹ پر موجود ایک صاحب نے ہمارے پاسپورٹ پر کاؤنٹر نمبر لکھا اور ہم مذکورہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے جہاں پہلے ہی تین مسافر اپنا سامان بکھرائے مذکورہ افسر سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ ہم نے ایک کونے میں اپنا اٹیچی کیس رکھا اور جیب سے سگریٹ نکالنے کے لیے ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ کسٹم آفیسر کی آواز سنائی دی۔

"یہ انگوٹھی آپ یہیں جمع کرا دیں۔"

ہم نے آواز کی سمت دیکھا تو کسٹم آفیسر صاحب ہم ہی سے مخاطب تھے۔ ہم نے گھبرا کر ان کی آنکھوں کے تعاقب میں اپنی نظریں دوڑائیں تو ہماری نظریں اپنی انگلی میں موجود شادی کی انگوٹھی پر پڑیں۔

"کیا مطلب؟" ہم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا اور آفیسر صاحب نے تینوں مسافروں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہمیں اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ یہ نہیں جا سکتی۔" انہوں نے کہا۔ "اسے آپ کسٹم میں جمع کرا دیں۔" انہوں نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیوں جناب؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا اور جواب میں انہوں نے ہاتھ سے انگوٹھی اتروا کر ہاتھ میں تولتے ہوئے کہا۔

"سوا تولہ تو ہو گی؟"

"جی نہیں۔" میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"نصف تولہ کی ہے۔"

"نہیں' زیادہ وزن کی ہے۔" انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور ان کے اس لہجے سے میں صورتِ حال کسی حد تک سمجھ چکا تھا لہٰذا بات بڑھانے کے بجائے میں نے کہا کہ بھائی' اللہ کرے یہ سوا نہیں بلکہ ڈیڑھ تولہ کی ہو مگر میری شادی کی انگوٹھی ہے جسے میں کسٹم کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا اور اگر انہیں اس انگوٹھی کے مستقبل پر شک ہے تو وہ میرے پاسپورٹ میں جہاں کیمرے کا اندراج کیا ہے' وہیں انگوٹھی کا اندراج کر لیں مگر وہ افسر صاحب مصر رہے کہ اسے کسٹم میں جمع کرا دیا جائے اور یہ کہ اس انگوٹھی کا پاسپورٹ میں اندراج نہیں ہو سکتا اور پھر سرگوشی میں پوچھا۔

"جیب میں کتنے پیسے ہیں؟"

اور میں جو یہ صورتِ حال سمجھ چکا تھا' اب ان کا مطلب بھی سمجھ گیا۔ دراصل میں کسٹم میں انگوٹھی جمع کرانے سے اس لیے گریز کر رہا تھا کہ میں نے پلیٹ فارم پر ایسے کئی لوگوں کو دیکھا تھا جو کسٹم کی جاری کردہ رسیدیں لیے اِدھر اُدھر لوگوں کی خوشامد کر رہے تھے کہ انہیں اُن کا جمع شدہ سامان واپس دے دیا جائے اور متعلقہ محکمہ کے لوگ انہیں بار بار جھڑک رہے تھے۔ میں نے ایک بوڑھی خاتون کو بھی دیکھا تھا جو روتے ہوئے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ انہیں پندرہ دن سے آج کل' آج کل کا کہہ کر ٹالا جا رہا ہے اور جمع شدہ سامان واپس نہیں کیا جا رہا۔ یہ مناظر دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انگوٹھی جمع نہیں کراؤں گا اور اپنے اس فیصلے کی قیمت میں نے تین سو روپے کی شکل میں افسر صاحب کو ادا کی اور جواب میں انہوں نے خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے ہدایت کی میں وہ انگوٹھی اپنی انگلی میں سے اتار کر کپڑوں کی تہہ میں چھپا دوں۔ میں نے ان کے خلوص کا شکریہ ادا کیا اور جنگلے کے تیسرے اور آخری حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں وڈیرا صاحب کھڑے تھے جی ہاں' ان کا پورا نام تو مجھے معلوم نہ ہو سکا مگر گزشتہ اٹھارہ گھنٹے میں یہ نام میں نے ایمانداری' دیانت اور شرافت کے حوالے سے مسافروں کے منہ سے احترام کے ساتھ اور کسٹم افسران کے منہ سے خوف کے ساتھ لاتعداد مرتبہ سنا

تھا اور جب میں تیسرے اور آخری حصے میں پہنچا تو میں نے اس شخصیت کو کھڑے پایا۔ چہرے سے اکھڑ نظر آنے والی یہ شخصیت بلاشبہ ہر لحاظ سے قابلِ احترام نظر آ رہی تھی۔

میرے ایک ہاتھ میں اٹیچی اور دوسرے ہاتھ میں پاسپورٹ تھا۔ اس شخصیت نے میرے چہرے کو بغور دیکھا اور ہاتھ سے آگے جانے کا اشارہ کیا۔ میں جنگلے سے نکلا تو گیٹ کے ساتھ ہی کھڑے دو باوردی سپاہیوں نے میرا راستہ روک لیا۔

"بیس روپے۔" انہوں نے بیک وقت کہا۔

"کیا مطلب؟" میں ایک مرتبہ پھر حیرت کا شکار ہو گیا تھا۔

"گیٹ پار کرنے کے بیس روپے۔" انہوں نے کہا اور مجھ پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔

"او بھائی' میں بھی پاکستانی ہوں' کس بات کے بیس روپے دوں؟" میں نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا اور شاید میرے لہجے کی گرمی کی وجہ سے انہوں نے مجھے چپ چاپ راستہ دے دیا۔ میں نے قدم بڑھائے اور پلیٹ فارم سے لگی سمجھوتہ ایکسپریس میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چلنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے سر نکالا اور جنگلے میں ہونے والا تماشہ دیکھنے لگا۔ اسی دوران مجھے خیال آیا کہ لاہور میں بھارت سے صرف ہندوستانی مسلمان نہیں آتے۔ سکھ بھی آتے ہیں۔ ان سکھوں کے لیے جنہوں نے ہمارے بچوں کو نیزوں پر اچھال کر اور کرپانوں سے تہ تیغ کر کے کہا تھا۔

"لے یہ ہے تمہارا پاکستان۔"

ہم پاکستانی کس طرح بچھے جاتے ہیں بالکل اس طرح جیسے یہ سکھ نہ ہوں' ہمارے سسرالی رشتہ دار ہوں۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ بھارت جانے والوں میں صرف پاکستانی مسلمان نہیں ہوتے۔ ہندو اور سکھ بھی ہوتے ہیں۔ اس وجہ کے لیے ہمارا محکمہ کسٹمز نرم

چارہ کیوں بن جاتا ہے؟ لیکن میرے ان خیالات کا وہاں جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ا پر سمجھوتہ ایکسپریس سارے ماحول سے الگ تھلگ کھڑی تھی اور اس ٹرین کے عین سامنے لوہے کا وہ جنگلا نما احاطہ تھا جس کی اپنی ایک دنیا' ایک اپنا ماحول تھا اور اس دنیا' اس ماحول سے گزرتے وقت مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میں پاکستان کا ایک شہری نہیں بلکہ کوئی مشکوک کردار کا غیر ملکی یا کسی قابلِ نفرت بیماری میں مبتلا مریض ہوں جس سے اچھوتوں کا سا رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی اور کھڑکی میں سے سر نکال کر جنگلے نما احاطہ کی دنیا دیکھنے لگا۔ میرے سامنے ہی کلکٹر کسٹمز وڈیرا صاحب کھڑے تھے۔ اس شخص کو دیکھ کر میرے دل میں ایک خواہش ابھری کہ کاش' میرے ملک کے تمام افسران وڈیرہ صاحب جیسے ہو جائیں تو میرا ملک اپنے نام یعنی پاکستان کی زندہ تصویر بن جائے۔ میں نے جنگلے کے دوسرے حصے کی طرف دیکھا' وہاں وڈیرا صاحب کے اصولوں سے ڈرے سہمے چھوٹے افسران چوکنا نظروں سے مگر احاطے کی جانب چور نظروں سے دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر کام دکھا رہے تھے۔ میری کھڑکی کے عین سامنے ایک ۸۰ سالہ عورت زار و قطار روتے ہوئے چیخ چیخ کر کسٹم والوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کسٹم والوں نے اس کا پانچ ہزار میٹر کپڑا ضبط کر لیا ہے۔ مجھے اس عورت کے بلبلا کر رونے پر ہنسی آ گئی۔

"اماں...... پانچ ہزار میٹر کپڑا تم کیوں لے جا رہی تھیں؟" میں نے اس عورت سے پوچھا اور جواب میں اس عورت نے مجھے غرا کر دیکھا۔ چند لمحے کے لیے نظریں ہٹائیں تو کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑی ایک ادھیڑ عمر عورت نظر آئی۔ وہ

آواز نکالے بغیر بے تحاشہ رو رہی تھی۔ میں نے اس سے رونے کا سبب پوچھا تو وہ خاموش رہی۔ میں نے پھر پوچھا لیکن وہ پھر خاموش رہی اور جب میں نے تیسری مرتبہ پوچھا تو اس نے دبی ہوئی آواز میں بتایا کہ اس کا دو ہزار میٹر کپڑا روک لیا گیا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے افسوس کے بجائے ہنسی آ گئی لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ ان جیسے لوگوں کے ساتھ ساتھ مجھ جیسے لوگ جو محض تبدیلئ آب و ہوا کی خاطر یا قصے کہانیوں میں پڑھے جانے والے ماحول کو بچشمِ خود دیکھنے کے شوق میں گھر سے نکلتے ہیں' انہیں کیوں لپیٹ میں لے لیا جاتا ہے؟ میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ ٹرین میں زندگی کے آثار محسوس ہوئے۔ میں نے چونک کر باہر دیکھا تو لوہے کا کٹہرا مسافروں سے خالی ہو چکا تھا' گویا اب ٹرین کے چلنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے باہر دیکھا' سامنے پلیٹ فارم پر رکھی ایک بڑی سی میز پر گہری نیلی وردی میں ملبوس اہلکار بیٹھے اپنی اپنی جیبوں سے مختلف رنگوں کے نوٹ نکال نکال کر ڈھیر کرتے جا رہے تھے اور پھر ان نوٹوں کی گنتی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے بھی ان نوٹوں کو گننا چاہا مگر ٹرین نے سرکنا شروع کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ شہر کی آبادی سے گزرتے ہوئے واہگہ چیک پوسٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

شہر لاہور پندرہ بیس منٹ تک اپنے مضافات کے کھیتوں' کھلیانوں کے نظارے کراتا رہا' ان کھیتوں کے درمیان سبزہ ہی سبزہ تھا' فصلیں بھی وہی تھیں مگر کھیتوں میں آباد لوگوں کا حلیہ بدل چکا تھا اور سکھ آبادی اپنے مخصوص انداز میں دکھائی دینے لگی تھی۔ میں یہ نظارہ دیکھنے میں محو تھا کہ بیس' پچیس منٹ کے سفر کے بعد ٹرین کے بریک سنائی دینے لگے اور پھر رینگتے رینگتے بالآخر ٹرین رک چکی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے سر نکال کر دیکھا تو مجھے

آج بھی!

آج بھی مجھے وہی ارمان ہے
جو کل تھا' پرسوں تھا بلکہ برسوں سے تھا
وہی تنہائی' بے کلی' وہی یاد
گزرے دنوں اور سال کی طرح
اپنی ذات کا ادھورا پن
مکمل ہونے کی خواہش
آرزو اور تمنا
تجھ سے ملنے کی کسک
تجھے پانے کی چاہ
اور پھر سے تجھے کھونے کا ارمان
آج بھی وہی ہے



آصفہ اقبال بلوچ

سنگاپور ایئرپورٹ سے ملتا جلتا منظر دکھائی دیا۔ صاف ستھرا اونچی چھت کا پلیٹ فارم میرے سامنے تھا' مناسب فاصلے سے سفید کسٹم کاؤنٹر۔ مسافروں کے بیٹھنے کے لیے صاف ستھری بنچیں میرے سامنے تھیں۔ دوسرے مسافروں کی تقلید میں' میں نے بھی اپنا سامان اٹھایا اور ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ سیاہ وردی میں ملبوس ایک سکھ کسٹم آفیسر نے بلند آواز سے مسافروں کو اطلاع دی کہ تمام مسافر اپنے اپنے ڈبوں کے سامنے موجود امیگریشن کاؤنٹرز کے قریب قطار بنالیں۔ ہم نے قطار بنالی پھر ہدایت سنائی دی کہ ہندوستانی پاسپورٹ والے ایک قطار میں اور پاکستانی پاسپورٹ والے دوسری قطار میں کھڑے ہوجائیں۔ میں نے اپنے سبز پاسپورٹ کو محبت سے دیکھا اور پاکستانی قطار میں کھڑا ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے ہمیں نظرانداز کر کے پہلے بھارتی پاسپورٹ کے مسافروں کو نمٹانا شروع کردیا تھا اور جب وہ قطار ختم ہوگئی' تب ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ ایک یہ لوگ ہیں جو اپنے لوگوں کو فوقیت دے رہے تھے اور ایک ہم ہیں؟ ''میاں جی' بیس روپے دے دو۔'' کاؤنٹر میں بیٹھی خاتون افسر نے پاسپورٹ میں میرا نام پڑھ کر کہا۔

''میڈم' کس بات کے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس دے دو۔ انٹری فیس ہے۔'' دھیمے لہجے میں آواز سنائی دی۔

میں نے ان خاتون کی طرف غور سے دیکھا' نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر کوئی جواب نہ بن پڑنے پر لاجواب سی کیفیت دیکھ کر میں نے دوسرے مسافروں کی طرح چپ چاپ بیس روپے بڑھا دیے۔ جھکی جھکی نظروں سے' جھینپے جھینپے ہاتھوں کے ساتھ انہوں نے وہ نوٹ تھام لیے اور جلدی سے میرے پاسپورٹ پر arrival کی مہر لگا دی۔ یہ جھینپ' شرمندگی دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے ان خاتون پر پیار آنے لگا تھا۔ (شاید اس لیے کہ میرے ذہن میں اپنے امیگریشن والے صاحب کا اکھڑ لہجہ اور حق وصول کرنے کا انداز گھوم گیا تھا۔)

اس کاؤنٹر سے نمٹ کر اب ہم دوسرے کاؤنٹر پر کھڑے تھے جہاں ہم سے دس روپے (جی ہاں' صرف دس روپے۔) سابقہ شرمندگی اور ندامت کے ساتھ وصول کر کے ہمارے کوائف سے پر ایک فارم ہمیں دے دیا گیا اور پھر کسٹم کی باری آئی جہاں ایک ہندو اور ایک سکھ آفیسرز نے سامان چیک کرنا شروع کیا۔ میرے سامان میں سونف سپاری کے پیکٹ بھی تھے جو مجھے ریڈیو پاکستان' حیدرآباد کے ایک پروڈیوسر اشفاق صاحب کے رشتہ داروں میں دینے تھے۔ کسٹم آفیسر نے سامان دیکھ کر اٹیچی پر او کے کا نشان لگایا اور اسی دوران وہاں موجود ایک سکھ قلی نے جلدی سے سُپاری کے چند پیکٹ نکال کر مٹھی میں دبا لیے۔ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو مجھے کسٹم آفیسر کے چہرے پر خجالت سی محسوس ہوئی اور نہ جانے کیوں مجھے ہنسی آ گئی۔

کسٹم کلیئرنس کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں نے میری انگوٹھی پر اعتراض کیوں نہیں کیا؟ حالانکہ میرا خیال تھا کہ جب اپنوں نے تین سو روپے لے لیے ہیں تو یہ غیر کم از کم چھ سو کا مطالبہ تو کریں گے مگر مطالبہ تو درکنار' دو قسطوں میں تیس روپے لے کر ہی مجھے وہاں کا تمام عملہ شرمندہ شرمندہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سر جھکا اور لوہے کے جنگلے کے اُس پار کھڑی ٹرین کی طرف بڑھ گیا۔

چار سے پانچ پھر چھ پھر سات اور پھر ساڑھے سات بجے ٹرین نے دہلی کی طرف چلنا شروع کردیا۔ ہم سب اپنی اپنی سیٹوں بلکہ برتھوں پر آرام سے لیٹ چکے تھے۔ سفر شروع ہوئے گھنٹہ بھر ہوا تھا کہ ہمارے ڈبے میں تین چار سکھ پولیس والے بھی آ گئے۔ تمام مسافروں کے پاسپورٹ جمع کر کے انہوں نے فی مسافر پانچ پانچ روپے کا مطالبہ کیا۔ مسافروں نے یہ بلیدان بھی دے دیا۔ میرے قریب کھڑے سپاہی نے میری طرف دیکھا اور میری جھلاہٹ دیکھ کر جھینپی جھینپی ہنسی کے ساتھ چپ چاپ میرا پاسپورٹ لوٹا دیا جبکہ اقبال اور آفتاب یہ ''بلی'' چڑھا چکے تھے۔

ٹرین کا سفر جاری رہا اور میں جاگتا رہا کیونکہ اس سفر کے تجربے سے گزرنے والے میرے کچھ دوستوں نے بتا دیا تھا کہ اس سفر میں عموماً مسافروں کا سامان چوری کرلیا جاتا ہے۔ ابھی چھ مہینے پہلے ہی ایک واقف کار یونس صاحب کے ساتھ بھی یہ ہی کچھ ہو چکا تھا جب وہ اجمیر جا رہے تھے اور اسی ٹرین میں سو جانے کے بعد صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو سیٹ کی دوسری جانب سے جالیاں کاٹ کر تالے لگی اٹیچی کی پشت کاٹ کر تمام سامان چوری کرلیا گیا تھا لیکن یونس صاحب تو چونکہ رشتہ داروں میں جا رہے تھے لہٰذا یہ صدمہ برداشت کر گئے تھے جبکہ اپنا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا اور دیارِ غیر میں بے سروسامانی کے ڈر سے ہم نے طے کیا تھا کہ ہم تینوں میں سے ہر شخص باری باری جاگ کر سامان کی حفاظت کرے گا اور میں نے سب سے پہلے جاگنے کی ذمہ داری قبول کرلی تھی۔

ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے چل رہی تھی اور میں برتھ پر لیٹا اپنے اور دوستوں کے سامان پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا کہ ٹرین کے ذریعہ وہی مسافر سفر کرتے ہیں جو ہوائی جہاز کا کرایہ برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے پھر تین تین چار چار راتوں کی جاگ اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں' چند سو روپے میں اپنے عزیز واقارب سے ملاقات کی تمنا میں موسم کی سختیاں جھیلتے ہیں' جھڑکیاں برداشت کرتے ہیں اور اپنی ذات کی تذلیل کے بعد جب وہ لوہے کے کٹہرے میں پہنچتے ہیں تو وہاں پر متعین عملے کا رویہ تھکن سے چور جسموں کی روح تک کو زخمی کردیتا ہے۔ میری نظریں اپنے سامان پر لگی تھی مگر ذہن سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ٹرین کے ذریعہ کچھ ایسے پیشہ ور بھی سفر کرتے ہیں جن کا کام اِدھر سے اُدھر سامان پہنچانا ہوتا ہے مگر ایسے لوگوں کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں ہوتی جبکہ ان دو چار کے حوالے سے سیکڑوں مسافروں کے ساتھ ہتک آمیز رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور اپنوں کے اس رویئے کے بعد صرف پندرہ بیس منٹ کی مسافت پر غیروں کا رویہ سامنے آتا ہے تو جواب میں وہاں والے یہاں والوں سے کہیں بلند' پراخلاق اور اچھے لگتے ہیں اور ان کا اچھا لگنا کم از کم مجھ جیسے محب وطن پاکستانی کے لیے عجیب شرمندگی کا سامان بن جاتا ہے لیکن بہرحال یہ ایک حقیقت ہے اور حقیقت سے آنکھ چرانا حماقت ہے لہٰذا میں نے احمق کہلانے کی بجائے حقیقت پسندانہ انداز اپنایا اور سوچتا رہا اور دونوں طرف کے عملے کا موازنہ کرتا رہا۔ اس وقت چونکا جب ٹرین کے بریکوں نے چرچراتے ہوئے رفتار کم کرنا شروع کردی۔ میں نے برتھ سے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر جھانکا' دہلی شہر کی حدود شروع ہوچکی تھی۔ اودھتی' ملگجی روشنی میں کچے پکے مکانات شروع ہو چکے تھے اور پھر دہلی کے تاریخی لال قلعہ کی عظیم الشان دیواروں نے میرے ذہن میں تاریخ دہرائی شروع کردی۔ دہلی شروع ہوچکا تھا۔

•.......•.......•.......•

میں بہت ناشکرا' احسان فراموش اور احمق ہوں اور اپنی ان تمام خوبیوں کا احساس مجھے اپنے بھارت

کے سفر کے اختتام پر ہوا اور یہ ہی وجہ تھی کہ جب میں واپس آیا اور دوستوں سے ملاقات ہوئی تو میری زبان پر سب سے پہلا جملہ یہ ہوتا تھا کہ ہم لوگ جنت میں رہتے ہیں اور ہمیں اپنی اس جنت کی قدر نہیں ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ہمیں اپنی اس جنت کی جسے پاکستان کہا جاتا ہے' اہمیت کا احساس بھارت گھومنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ خیر' یہ باتیں تو وہ ہیں جو مجھے اپنی سفر گزشت کے اختتام پر کرنی چاہیے تھیں مگر اپنے ناشکرے پن' احسان فراموشی اور حماقت کا احساس کچھ اتنا حاوی ہو چکا ہے کہ اب میں حقیقت کے اس اعتراف کو ہر موقع پر دہرا دیتا ہوں جبکہ اس وقت مجھے یہ بتانا تھا کہ وڈیو پر بھارتی فلمیں دیکھ کر ذہن میں یہ خیال پختہ ہو چکا تھا کہ وہاں پہنچتے ہی ہمیں سڑکوں اور گلیوں میں راہ چلتے ریکھا' سری دیوی اور جیہ پرادا جیسی من موہنی صورتیں نظر آئیں گی مگر حقیقت اس تصویر سے قطعی برعکس تھی اور یہ ہی وجہ تھی کہ گھومنے پھرنے کے بعد جب ہم واپسی کا سفر کر رہے تھے تو آفتاب نے بہت ہی اداس لہجے میں کہا تھا۔

"یار مسعود بھائی! لگتا ہے کہ یہاں جتنی خوبصورت لڑکیاں تھیں' وہ سب فلم والے لے گئے ہیں۔"

اور جواب میں اقبال بھائی اور میں پرزور تائید کرتے ہوئے متھرا کے تصور میں کھو گئے تھے۔

متھرا...... ہندوؤں کا مقدس ترین شہر جہاں چوبیس گھنٹے یاتریوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ بسوں میں' پرائیویٹ گاڑیوں میں اور ریل کے ذریعہ ہزاروں یاتری یہاں آتے ہیں اور کرشن بھگوان کی جنم بھومی کی یاترا کرتے ہیں۔ یہ مندر جسے بھارت کے معروف ترین سرمایہ داروں برلا' ٹاٹا اور ڈالمیا نے اربوں روپے کی لاگت سے تعمیر کرایا ہے' دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اربوں روپیہ جب کسی عمارت کی صورت میں ابھرتا ہے تو وہ متھرا کا مندر بن جاتا ہے۔ ہم مندر دیکھ رہے تھے اور ہم نے دیکھا کہ مندر کے برابر ہی ایک پہاڑی پر مسجد بھی اپنی شان و شوکت سے موجود ہے۔ یہ متھرا کی عید گاہ مسجد ہے۔ مسجد کی پہاڑی کے نیچے مسلمانوں کی آبادی ہے اور وہیں گھومتے پھرتے ہمیں پتہ چلا کہ "بابری مسجد" کی طرح یہاں بھی وہی تنازعہ چل رہا ہے کہ ہندوؤں کے مطابق ان کے کرشن بھگوان نے مسجد کے عین پیچھے جنم لیا تھا لہٰذا اسی حوالے سے مسجد والا مقام ہندوؤں کا مذہبی حق تھا اور مسلمان اس سازش کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے لہٰذا وہ اس سازش کے خلاف متحد ہو کر بھرپور انداز میں دفاع کر رہے تھے اور معاشی طور پر پسماندہ ہونے اور محدود وسائل کے باوجود وہاں کے مسلمان ڈٹے ہوئے تھے اور یہ ان کے جذبۂ ایمانی کی صداقت ہی تھی کہ ہندو اب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ میں نے عید گاہ مسجد کے مرکزی دروازے پر کھڑے ہو کر پہاڑی کے نیچے آباد مسلمانوں کی آبادی کو سلام کیا۔ خدا ان مسلمانوں کا حامی و ناصر ہو۔ میرے دل سے بے ساختہ دُعا نکلی تھی اور پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ ہم آگرہ شہر پہنچے اور پھر......

آگرہ سے جے پور کا سفر کرتے ہوئے میرے ذہن میں تاج محل گھوم رہا تھا۔ ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی اور میں ڈبے میں کھڑکی سے سر ٹکائے تاج محل میں گھوم رہا تھا۔ کبھی تہہ خانے میں شاہ جہاں اور ممتاز محل کی قبروں پر پہنچ جاتا تھا تو کبھی تاج محل کے برابر سرخ مسجد میں جہاں جمعہ کی نماز ہو رہی تھی اور کبھی تاج محل کے عقب میں جس کے جھروکوں سے نیچے جمنا ندی دکھائی دیتی تھی۔ ٹرین کے جھٹکوں میں تاج محل سے نکل کر میں سکندرا پہنچ گیا۔ جی ہاں' آگرہ شہر سے دور سکندرا جہاں اکبر بادشاہ ابدی نیند

سو رہے ہیں۔ جب ہم سکندرا پہنچے اور احاطہ عبور کر کے اندر داخل ہوئے تو لمبی روش پر لنگوروں کے غول نے ہمارا استقبال کیا۔ چند ہندو عورتیں تلے ہوئے پراٹھے ہاتھ میں لیے لنگوروں کو کھلا رہی تھیں۔ نئی شکلیں دیکھ کر لنگوروں نے ہمیں گھیر لیا اور اقبال بھائی کے ہاتھ میں موجود شاپنگ بیگ کو چھین کر اندر جھانکنے لگے مگر وہاں اپنے مطلب کی کوئی چیز نہ پا کر انہوں نے مایوسی سے بیگ اقبال بھائی کے سامنے پھینک دیا۔ ہم آگے بڑھے اور عمارت کے طول و عرض میں پھیلے برآمدے میں داخل ہو گئے۔ بڑے بڑے ستونوں والی راہداری میں سب سے پہلے ہماری نظر جن تین مانوس حرفوں پر پڑی' وہ تھے۔ MQM یہ تین حروف ہمیں عمارت کے ہر بڑے دروازے پر کھرچ کر لکھے ہوئے نظر آئے۔ پاکستان سے جانے والے نوجوانوں نے دیواریں کھرچ کھرچ کر یہ حروف لکھ دیے تھے۔

ایک لمبی اندھیری ڈھلان اتر کر ہم اس تہہ خانے میں گئے جہاں شہنشاہ اکبر ایک دیے کی ٹمٹماتی روشنی میں ابدی نیند سو رہے تھے۔ ہم نے فاتحہ پڑھی اور باہر نکل آئے۔ عمارت کے بڑے بڑے ستونوں سے ٹیک لگائے' ہمیں چند جوڑے نظر آئے جو دنیا کی نظروں سے چھپ کر راز و نیاز میں مصروف تھے۔ مغلیہ سلطنت کے شہنشاہ کا مزار اب وہاں کے لوگوں کے لیے لوا سپاٹ (love spot) بن گیا تھا مگر نور جہاں اور سلیم کے عشق کی طرح جلال بادشاہی ان کے عشق کی راہ میں رکاوٹ نہ تھا۔

ٹرین اپنے مخصوص جھٹکوں سے چل رہی تھی کہ یکا یک میرے کان میں آشنا سے الفاظ گونجے' تصور کی دنیا سے نکل کر میں نے توجہ دی تو نا آشنا لہجے کے باوجود سنائی دینے والے الفاظ مجھے آشنا محسوس ہوئے۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ الفاظ میرے سندھ کی بولی کے تھے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا' میرے برابر میں بیٹھا شخص سامنے کی سیٹ پر بیٹھے دو آدمیوں سے سندھی میں باتیں کر رہا تھا۔ اپنے یہاں کی بولی سن کر مجھے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی اور میں بے ساختہ اس شخص سے سندھی زبان میں مخاطب ہو گیا۔

"آپ سندھی ہیں؟"

اس شخص نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔"

جواب ملا اور پھر وہ مشکوک انداز میں میری طرف دیکھنے لگا اور اس سے پہلے کہ وہ مزید مشکوک ہوتا' میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اسے بتایا کہ میں بھی سندھی ہوں اور پاکستان سے آیا ہوں۔

"اچھا۔" اس نے تفصیلی تعارف سن کر اس طرح کہا جیسے اس کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ میں نے اس کا شک مزید دور کرنے کے لیے کہا کہ اپنے حیدر آباد سے ہزاروں میل دور اپنی سندھی بولی سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے اور جواب میں اس نے اس طرح گردن ہلائی جیسے میری تائید کرتے ہوئے وہ میری سات پشتوں پر احسان کر رہا ہو۔

"ہوتی ہے' سندھ سے یہاں آنے والوں کو ہوتی ہے۔" اس نے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے اس انداز اور لہجے پر مجھے نہ جانے کیوں بڑی شدت سے تاؤ آ گیا مگر دیارِ غیر کا احساس ہوتے ہی میں نے اپنے اوپر کسی حد تک کنٹرول کیا اور کھڑکی سے منہ نکال کر باہر دیکھنے لگا۔ وہ جودھپور کا کوئی تاجر تھا جو آگرہ سے جودھپور جا رہا تھا۔ میری کھوپڑی گھوم رہی تھی اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے میں باہر جھانکتا رہا۔ ٹرین چلتی رہی اور پھر رات کے دس بجے کے قریب جب ٹرین رکی تو ہم اپنا سامان سنبھالتے ہوئے پلیٹ فارم پر اتر آئے۔ یہ ریلوے اسٹیشن جے

پور کا تھا۔ ہم نے اپنا اپنا سامان سنبھالا اور پلیٹ فارم سے نکل کر راجہ مان سنگھ کے شہر کی طرف بڑھ چلے۔

•.........•.........•

یہ جے پور ہے جسے عرفِ عام میں ”گلابی شہر“ کہا جاتا ہے اور جس طرح ہمارے یہاں کہا جاتا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا، اُسی طرح جے پور کے لیے کہا جاتا ہے کہ جس نے جے پور نہیں دیکھا، اُس کے لیے بھارت کا ویزا لینا ہی بے کار ہے لہٰذا اپنے ویزے کو کارآمد بناتے ہوئے ہم جے پور پہنچ گئے تھے جہاں سب سے پہلے ہم پاکستان میں شفیع بھائی (شفیع چندریگر) کے دیئے ایڈریس پر اُن کے ایک عزیز سراج بھائی سے ملے اور پھر ایک ہوٹل میں اپنا سامان پہنچ دیا۔ یہ دو ستاروں والا ہوٹل تھا جس میں ڈبل بیڈروم کا کرایہ ایک سو بیس روپے تھا جسے سن کر اور ہوٹل کی شان و شوکت اور سروس دیکھ کر ہمیں بے ساختہ اپنے لاہور کا ہوٹل یاد آ گیا جس کے باتھ روم میں ٹوٹا ہوا نل، بستر پر میلی اور شکن آلود چادریں تھیں اور سروس کے نام پر بے اعتنائی اور بے رخی مگر کرایہ تھا مبلغ دو سو روپے۔ میں نے سر جھٹکا، گھڑی دیکھی، رات کے گیارہ بج رہے تھے لہٰذا متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ جے پور کی سیر کل صبح سے شروع کی جائے گی۔

دوسری صبح ہم تھے اور جے پور شہر۔ بڑی چوپڑ، چھوٹی چوپڑ، راج گنج بازار، جوہری بازار گھوم کر ہم آمیر کا قلعہ دیکھنے چل دیئے۔ ہم نے دیکھا کہ جے پور میں عام آبادی سے زیادہ غیر ملکی سیاح نظر آ رہے تھے۔ انگریزی فلموں کی ہیروئنوں سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش لڑکیاں اسکرٹ، جین اور جیکٹ میں ملبوس سارے شہر میں بکھری پڑی تھیں لیکن نہ جانے کیوں ان چہروں سے زیادہ کشش ہمیں شہر کی گلابی دیواروں میں محسوس ہو رہی تھی۔

آفتاب تو کبھی کبھار اِدھر اُدھر جھپکی مار لیتا تھا مگر میں اور اقبال بھائی وہاں کا کلچر دیکھنے میں مست ہو گئے تھے اور اسی مستی میں ہم آمیر کے قلعہ تک پہنچ گئے تھے جہاں ہم سے پہلے ہی سیکڑوں کی تعداد میں جاپانی اور امریکی سیاح موجود تھے اور سیاحوں کے اس میلہ میں ہم نے آمیر کا تاریخی قلعہ دیکھا جو واقعی دیکھنے کی چیز ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد ہم ٹیمپو میں بیٹھے شہر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ سفر جاری تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ جے پور کی معیشت کا سب سے زیادہ دارومدار وہاں سیاحوں کی آمد ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ اس شہر کے چپے چپے پر گائیڈ ملتے ہیں جو اجنبیوں کو بھانپ کر ان کے ساتھ لگ جاتے ہیں اور اس طرح امریکی ڈالرز، ہندوستانی کرنسی میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں کہ اس شہر میں جگہ جگہ شاپنگ سینٹرز ہیں جہاں سو گرام کی رضائی سے لے کر دھات کے بڑے بڑے ڈیکوریشن پیسز تک سیاحوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتے ہیں اور گائیڈ کی چرب زبانی اور شاپنگ سینٹرز میں موجود اشیاء دیکھ کر سیاحوں کے ہاتھ خود بخود اپنی جیبوں کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ جے پور کی معیشت کا زیادہ دارومدار چونکہ سیاحوں پر ہے اور اس کا احساس وہاں کے شہریوں کو بھی ہے لہٰذا میں نے وہاں عام لوگوں میں سیاحوں کے لیے احترام بھی دیکھا۔

دو روز میں ہم نے سارا۔۔ پور دیکھ لیا، مہاراج پیلس، رام نواس باغ، میوزیم، مرزا اسماعیل روڈ (جیسے کراچی کا طارق روڈ) اور پھر جے پور کا شہرۂ آفاق راج مندر سینما اور اس کے بعد ہم نے اپنا سامان سمیٹا۔ رات ایک بجے کی نائٹ کوچ کے ٹکٹ لیے اور دہلی کی طرف چل دیئے۔

رات کے گہرے اندھیرے میں ہمارے سپر ہائی وے جیسے راستے پر بس دوڑ رہی تھی۔ آفتاب

آگے والی سیٹ پر گردن ڈھلکائے سو رہا تھا اور ایسی ہی حالت میرے برابر بیٹھے ہوئے اقبال بھائی کی تھی۔ میں نے اکتا کر آنکھیں بند کر لیں مگر نیند کے بجائے خیالوں نے آ گھیرا۔ مجھے جے پور کے سی آئی ڈی آفس کا وہ کلرک یاد آ گیا جس نے ہماری انٹری کے وقت دس اعتراضات کیے تھے اور ان اعتراضات کے پیچھے صرف دس پندرہ روپے کا مدعا تھا لیکن جب میں نے گرمی دکھائی تھی تو جواب میں تمام اعتراضات غائب ہو چکے تھے۔ اُس وقت اُس کلرک کے چہرے پر مایوسی کے ساتھ ہی مجھے اپنے کلرک......؟ ان ہی سوچوں میں نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور جب آنکھ کھلی تو صبح چھ بجے کا وقت تھا اور بس دہلی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

دہلی کی جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے، وہ جامع مسجد کے نزدیک ہی مسلمانوں کے علاقے میں تھی۔ اسی ہوٹل کے ایک بڑے سے ہال میں ہم نے دیکھا کہ وہاں عوامی مسافر خانے کی طرز پر بہت سی چارپائیاں پڑی تھیں اور ہر چارپائی پر ایک خاتون اپنے سامنے کپڑوں کے تھانوں کا ڈھیر لگائے قریب بیٹھے مردوں سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھیں۔ یہ تمام عورتیں کیریئرز تھیں جو مختلف ذریعوں سے پاکستان سے کپڑا اور دیگر سامان لائی تھیں اور یہاں بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا۔ ان ہی عورتوں کے بیچ میں ایک چارپائی پر مجھے وہ عورت بھی نظر آئی جو لاہور اسٹیشن پر اپنا دو ہزار میٹر کپڑا کسٹم برد ہونے پر رو رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور تمام صورتِ حال سمجھ میں آ گئی۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر حاضری دینے کے لیے جب ہم اس علاقے میں پہنچے تو راستے میں سب سے پہلے میری نظر ”غالب اکیڈمی“ پر پڑی اور ہم سوچے سمجھے بغیر اکیڈمی میں داخل ہو گئے اور یہ کوئی نفسیاتی وجہ تھی یا چچا غالبؔ سے عقیدت کہ عمارت میں داخل ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے کسی بہت ہی پیارے عزیز کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ ہم نے وہاں کے سیکریٹری سے اپنا تعارف اور آنے کی وجہ بیان کی جس کے جواب میں انہوں نے ایک گائیڈ نما شخصیت کو ہمارے ساتھ کر دیا جس نے لائبریری، میوزیم اور عمارت کے مختلف شعبے دکھائے اور ہماری معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔

”چچا غالبؔ کہاں رہتے ہیں؟“ میں نے اُس گائیڈ سے پوچھا اور جواب میں وہ ہمیں عمارت سے باہر ایک چار دیواری کے گیٹ پر لایا اور دروازے پر پڑا تالا کھول کر ہم چار دیواری کے احاطے میں داخل ہوئے۔ اسی احاطے میں الٹے ہاتھ پر دیوار کے ساتھ چچا غالب ابدی نیند سو رہے تھے۔ چچا کو اس معصومیت سے سوتا دیکھ کر بے ساختہ میرا دل چاہا کہ ان کے گلے لگ جاؤں، ان کے ہاتھ چوموں، ماتھا چوموں مگر میں نے بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا اور لاشعوری طور پر میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر بات پہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

ہم نے چچا کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ گائیڈ کے ہاتھ میں دس روپے رکھے اور احاطے سے نکل کر سلطان الہند حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار کی طرف بڑھ گئے جہاں داخل ہوتے ہی سامنے امیر خسروؒ موجود تھے اور سیدھے ہاتھ پر سلطان الہندؒ اپنی تمام تر بزرگی کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ ہم نے فاتحہ پڑھی اور عجیب سی ناقابلِ تفہیم کیفیت میں باہر نکل آئے۔

(اس سفرنامے کی نئی کڑی آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے۔)

رخسانہ سہام مرزا

یادوں کے اوراق

یادوں کے اوراق
رخسانہ سہام مرزا

حجاب عباسی کا خیال

گزرتا وقت بدلتا ہے خال و خد سب کے
یہ ساری عمر کا سامان تھوڑی ہوتا ہے

ماضی کی خوش رنگ یادوں سے جڑی رخسانہ سہام مرزا کی ہفت رنگ آپ بیتی

اسی شور شرابے میں جہاز احمد آباد کی طرف محوِ پرواز ہوگیا پھر دورانِ پرواز کپتان نے بتایا کہ میں صرف کراچی پر لینڈ کرسکتا تھا' اس کے علاوہ قانونی طور پر پاکستان کے اور کسی ایئرپورٹ پر نہیں اتر سکتا۔ قصہ مختصر' جہاز احمد آباد ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ ایک گھنٹہ وہاں رک کر جب ہم واپس بمبئی ایئرپورٹ پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ اب تمام مسافر وہاں جہاز سے اتر کر پریشان بیٹھے تھے اور ایئرپورٹ کے عملے سے بار بار کراچی روانگی کا وقت پوچھ رہے تھے۔

میں نے حیدرآباد سے وہاں کا خاص پان دان خریدا تھا۔ بڑے بھائی صاحب کی بیگم نے اُس کو ترو تازہ کردیا تھا اور پان بھی رکھ دیئے تھے۔ میں وہی پان دان ایئرپورٹ پر اپنی گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ ایک صاحب جو کراچی کے مسافر تھے' وہ بڑے مزے سے وہاں زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ صاحب ہر تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے کہتے تھے۔

''بہن جی! ایک چھوٹا سا پان دے دو۔'' میں اُن کی یہ خواہش پوری تو کرتی رہی تھی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے بڑے میلے سے لگ رہے تھے اور میں انہیں پان بھی کوئی خوش دلی سے نہیں دے رہی تھی۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں' وہ رات کا کون سا پہر تھا جب وہاں موجود چھوٹے بچے بھوک کا اظہار کررہے تھے' کوئی چپکے چپکے اور کوئی رو کر جبکہ جانبِ منزل سفر کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ ایئرپورٹ کاؤنٹر سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی کہ کراچی کے لیے جہاز کب چلے گا؟ ایسے میں اچانک ہی وہ صاحب جو زمین پر لیٹے مجھ سے پان مانگتے رہے تھے' اٹھتے ہوئے بولے تھے۔

''یہ سالا ایئر انڈیا کیا بیچتا ہے' ہم چاہے تو ایئرلائن کو خرید کر پھینک دے۔'' اور پھر انہوں نے ذرا دیر بعد اپنے پیسوں سے سینڈوچ منگائے تھے جو بچوں' بڑوں سب نے کھائے تھے جبکہ وہ خود پھر اُسی طرح زمین پر لیٹ گئے تھے۔ صبح وہ اٹھے' منہ دھو کر ہمارے پاس آکر کہا۔ ''بہن جی! ایک پان!'' میں نے انہیں پان دے دیا تھا۔

میں اُس زمانے میں پان نہیں کھاتی تھی۔ وہ پان دان بس شوق میں ہی خریدا تھا۔ وہ صاحب جب میرے پان کی تعریف کرتے کہ ''واہ بہن جی! بڑا سواد آیا۔'' میں سمجھ جاتی تھی کہ پان کھا کر سفید جھوٹ بول رہے ہیں۔ قصہ مختصر' اُس صبح دس بجے اچانک ہی خوش خبری ملی تھی کہ جہاز کراچی روانگی کے لیے تیار ہے۔ مسافروں سے درخواست ہے کہ جہاز پر تشریف لے جائیں۔ مسافر جہاز میں سوار ہوگئے تو جہاز نے گویا رینگنا شروع کیا۔ اس دوران میں ایئرہوسٹس احتیاطی تدابیر بتاتی رہی۔ جہاز کی رفتار میں کچھ بہتری آئی لیکن پھر ایک دم ہی رفتار ہلکی ہونی شروع ہوگئی اور جہاز رک گیا۔ کپتان نے یہ خبر سنائی کہ کچھ تکنیکی خرابی کی وجہ سے ہم اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔ مسافر جہاز میں ہی بیٹھے رہیں اور اگلے اعلان کا انتظار کریں اور پھر اگلا اعلان یہ ہوا تھا کہ تمام مسافر جہاز سے اتر جائیں۔ اس اعلان کے بعد مسافروں کی حالت دیدنی تھی۔ ظاہر ہے' ہم بیس' بائیس گھنٹوں سے انتظار کی حالت میں تھے۔

دوپہر دو بجے دوبارہ جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا تھا۔ ایک بار پھر سب مسافر جہاز میں تھے۔ اب جو جہاز روانہ ہوا تو اکثر مسافروں کا دل اس خوف سے آباد تھا کہ اب کپتان صاحب کوئی بری خبر نہ سنا دیں۔ ہمارے کانوں میں اب کوئی ایسی خبر سننے کی تاب نہیں رہی تھی۔

دورانِ سفر سہام نے کہا تھا۔ ''رخسانہ! ایک آخری پان کھلا دو۔'' اُن کی یہ بات سن کر تو میری روح فنا ہوگئی تھی۔ میں کبھی اپنے بچوں پر نظر ڈالتی تھی تو کبھی پرائے بچوں پر۔ مجھے دوسرے لوگوں کے بچے بھی اپنے لگ رہے تھے۔ بہرحال پورا سفر خوف کے سائے میں گزرا تھا اور پھر جہاز نے کراچی لینڈ کیا تھا لیکن جہاز ابھی پوری طرح رکنے بھی نہیں پایا تھا کہ طوفانی بارش شروع ہوگئی تھی۔ دل میں فوراً ہی اللہ کا بار بار شکر ادا کیا تھا کہ اگر جہاز دس' پانچ منٹ لیٹ ہوجاتا تو ہم پھر احمد آباد اور پھر بمبئی میں ہوتے!

میں نے بمبئی سے بہت ساری ساڑھیاں خریدی تھیں۔ یہاں پاکستان میں ایک تقریب میں انڈین ایمبیسڈر کی بیگم مسز ترپاٹھی سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے میری ساڑھی کی بہت تعریف کی تھی اور پوچھا تھا۔ ''یہ کہاں سے خریدی ہے؟''

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ''مسز ترپاٹھی' یہ میں نے وہاں سے خریدی ہے جس دیش میں گنگا بہتی ہے۔'' میرا یہ جواب سن کر وہ بہت خوش ہوگئی تھیں اور بہت محبت بھرے انداز میں میری ساڑھی کو چھو کر بھی دیکھا تھا۔ آخر وہ اُن کے دیش کی جو تھی' دیش کی محبت یہ ہی ہے۔

مسز ترپاٹھی نے محبت بھرے لہجے میں ہی کہا تھا۔ ''ہمارا انڈیا بہت ''کھوبصورت'' ہے' آپ انڈیا میں اور کہاں کہاں گئی تھیں؟ دہلی جانا ہوا تھا؟''

میں نے مسز ترپاٹھی سے کہا تھا۔ ''دکن میں ہمارے رشتے دار ہیں اس لیے وہاں زیادہ وقت دیا۔ جوبلی ہال دیکھا' سالار جنگ میوزیم دیکھا'

حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی بہت خوبصورت ہے‘ وہاں جاکر میرا جی چاہا تھا کہ کاش میں یہاں پڑھ سکتی۔“

”مسز ترپاٹھی‘ آپ کے دہلی دیکھنے والے مشورے پر میں ابھی تک عمل نہیں کرسکی ہوں یا آپ یوں کہہ لیں۔ (ہنوز دلی دوراست۔)“

سو یہ تھا ایک یادگار سفر اور اُس کی کہانی‘ اسی کہانی کے ساتھ ہماری زندگی کی کہانی رواں دواں تھی۔ اس کہانی میں زیادہ سفر کی گنجائش اس لیے نہیں رہی کہ میں بچوں کی پڑھائی پر توجہ دینا زیادہ ضروری سمجھتی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ اُس میں کہیں وقفہ نہ آئے۔

سہام جب بھی باہر دوروں پر جاتے تو اُن کے دوست مجھے بتاتے کہ بھابھی! یہ ہر جگہ صرف آپ کو یاد کرتے ہیں اور آپ کے لیے خریداری کرتے ہیں۔ ”یہ رنگ رخسانہ پر اچھا لگے گا‘ یہ سیٹ وہ پسند کرے گی۔“ ایسی باتیں سن کر ہم لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ ”ارے بھائی! اُن کو چھوڑ کر کیوں آتے ہو؟“

اس دوران میں سہام کی نوکری نیو جوبلی سے بدل کر اسٹیٹ لائف میں ہوگئی تھی باوجود اس کے کہ اُن کے مزاج میں سرکاری نوکری کرنا تھا ہی نہیں مگر مجبوری سب سے بڑا امتحان ہوتی ہے‘ سو وہ اُس نوکری کے ساتھ اپنے رسالے ”دوشیزہ“ کا کام کرتے رہے اور جب بچے سمجھدار ہوگئے تو میں نے بھی اس کام میں حصہ لینا شروع کیا۔ دوسری طرف سہام جلد از جلد ریٹائرمنٹ لے کر اپنے ذاتی کام میں لگنا چاہتے تھے۔

سہام کے ساتھ زندگی کے سفر میں وہ مقام بھی آتا ہے جو عموماً لوگ نہیں بتاتے یعنی ”سرحدی جھڑپیں“ اگر میں اپنی زندگی کے حوالے سے سب

اچھا کہوں گی تو مجھے یقین ہے‘ آپ نہیں مانیں کہ میں جو بچپن سے اتنی شریر اور ضدی تھی‘ ایک دم نیک بی بی کیسے بن گئی؟ اور میں بھی جھوٹ بولنا نہیں چاہوں گی کہ ”میں بہت ستی ساوتری تھی۔“

اس دنیا کے بے شمار میاں بیوی کی طرح میری بھی سہام سے کئی بار زندگی کے مختلف معاملات پر بہت تلخی ہوئی لیکن سہام میں برداشت کا مادہ بہت تھا اسی لیے زندگی کی گاڑی پٹڑی سے نہیں اتری۔ مجھے اَب وجہ تو یاد نہیں مگر ایک دنگل ضرور یاد ہے‘ جس میں میں نے بہت شور مچایا تھا مگر سہام ہمیشہ کی طرح چپ رہے تھے اور جب میرا غصہ کم ہوا تھا تو وہ بولے تھے۔

”رخسانہ......! میرا خیال ہے‘ ہم ساتھ نہیں رہ سکتے۔“

میں نے چمک کر کہا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔“

میری یہ بات سن کر سہام نے اپنا سوٹ کیس الماری کے اوپر سے اتارا تھا تو میں نے پوچھا تھا۔

”سوٹ کیس کیوں اتارا ہے؟“

وہ بولے تھے۔ ”اپنے کپڑے رکھوں گا۔“

”کپڑے لے جانے کی ضرورت نہیں ہے‘ واپس رکھ دو۔“ میں نے غصے میں کہا تھا۔ ”کیونکہ جو دوسرا آئے گا‘ وہ پہنے گا‘ تم بس تن کے کپڑوں سے جاؤ!“

سہام میری یہ بات سن کر ہنستے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے تھے اور مجھ سے پوچھا تھا۔ ”دوسرا ابھی آئے گا؟“

میں نے کہا تھا۔ ”ہاں!“

”اچھا ٹھیک ہے تو پھر میں ہی کیا برا ہوں؟ چلو چل کر مٹھائی خرید کر لاتے ہیں‘ بس اب صلح صفائی۔ جھگڑا ختم۔“ بس یوں جھگڑے کا اختتام ہوگیا تھا۔

میری یادوں کے اوراق میں اس طرح کے او،

بہت سے منظر محفوظ ہیں۔ ایک بار کسی بات پر ہمارا جھگڑا ہوا تھا تو سہام خاموشی سے اٹھ کر گھر سے چلے گئے تھے۔ اُن کے دوست چوہدری صفدر چیئرمین اسٹیٹ لائف‘ مجھے اپنی چھوٹی بہن کہتے تھے اور میرا مان بھی بہت رکھتے تھے۔ میں نے اُن کو فون کر کے بتایا تھا کہ ”بھائی! سہام نے مجھے یہ سب کہا ہے اور ناراض ہوکر گھر سے چلے گئے ہیں۔“ اور اب مزے کی یہ بات سنیے کہ صفدر بھائی مجھ سے فون پر اِدھر بات کررہے تھے اور دوسری طرف سہام اُن کے گھر کی گھنٹی بجارہے تھے۔ اس کے بعد چوہدری صاحب نے خاموشی سے اپنی گاڑی بھیجی تھی اور مجھے اپنے گھر بلوایا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ سہام اُن کے گھر پہنچ گئے ہیں اور نہ سہام کو پتہ کہ میں آرہی ہوں۔ جب میں وہاں پہنچی تھی تو سہام وہاں بیٹھے بڑے مزے سے چائے پی رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر فوراً بولے تھے۔ ”تو یہ میری شکایت ہوئی ہے!“

چوہدری صاحب نے فوراً ہی سہام سے کہا تھا۔ ”مرزا......! سیدھے ہوجاؤ‘ نہیں تو برا ہوگا۔ یہ میری بہن ہے اور وہ بھی چھوٹی!“ بس یہیں سہام کی مسکراہٹ کے ساتھ ہماری لڑائی ختم ہوجاتی تھی مگر اب میں یہ بات سوچتی ہوں کہ سہام نہیں‘ میں ہی بہت غلط تھی۔ یہ ہمارا المیہ ہے کہ جب وقت نکل جاتا ہے تو پھر بس پچھتاوا ہی رہ جاتا ہے مگر پھر یہ بھی سوچتی ہوں کہ یہ بھی تو زندگی کا مزا ہے‘ ہر وقت میٹھا ہی نہیں کھایا جاتا‘ نمک بھی ضروری ہوتا ہے!!

سہام کے حوالے سے میں جب بھی سوچتی ہوں‘ یہ شعر

کوئی تعویذ ہے ردبلا کا
محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے

مجھے اپنی نرم گرم زندگی کا حصہ نظر آتا ہے اور جب یہ یادوں کا حصہ بن جاتا ہے تو پھر کبھی اُن باتوں پر دل کھول کر ہنساتا ہے اور کبھی آنکھوں کو نمی دے جاتا ہے۔ یہ تو ہر سفر کا المیہ ہے‘ شاید اس لیے کہ گئے وقت کو یاد رکھا جائے اور ماضی کی غلطیوں سے اپنی اولاد کو بچایا جائے۔ یہ کہہ کر نہ چھوڑ دیا جائے کہ یہ تو ماضی تھا کیونکہ ہم جس کو ماضی کہہ کر جان چھڑانے یا بچانے کی کوشش کرتے ہیں‘ وہ پھر کبھی نہ کبھی‘ کہیں نہ کہیں حال بن کر سامنے آجاتا ہے اور اس طرح دنیا چلتی رہتی ہے‘ وہی پیدائش‘ وہی بچپن‘ جوانی‘ شادی پھر اولاد پھر کسی کا سفر تمام!......اور دوسرے اسی پٹری پر چلتے رہتے ہیں‘ کچھ نیا نہیں ہوتا اور کچھ پرانا نہیں! ارے‘ یہ میں لکھتے لکھتے کہاں سے کہاں نکل گئی؟ دوسروں کی زندگی کا فسانہ لکھنے لگی۔ ابھی تو اپنی کہانی کا ایک ”کردار“ یعنی میں خود زندہ ہوں!!

•......•......•......•

اماں بیمار ہوگئیں‘ وہ دس دن اسپتال میں رہیں اور پھر اس دارِفانی سے کوچ کرگئیں۔ یہ دُکھ اُن کے بچوں کے لیے تو تھا ہی مگر میں بھی بہت دکھی اور غم زدہ تھی۔ وہ محبت کرنے والی ساس تھیں۔ سب کا ہی دل دکھا گئیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔ (آمین!) میں نے سہام جیسے مضبوط انسان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ کتنا ہی حوصلہ مند شخص ہو مگر ماں کی ہستی ہی ایسی ہے‘ اُس کی جدائی کا غم اچھے اچھے کو رُلا دیتا ہے۔ (جب سہام کی بیماری میں آخری ایام تھے‘ میں نے پوچھا تھا۔ ”سہام......! کون یاد آتا ہے؟ ابا یا اماں؟“ سہام بولے تھے۔ ”اماں یاد آتی ہیں۔“ میں نے کہا تھا۔ ”بس وہ بھی آپ کے لیے دُعا کرتی ہوں گی۔“ اس وقت بھی سہام کی آنکھیں نم تھیں۔)

اماں کے جانے پر ڈاکٹر علی نے جو سہام کے دوست تھے‘ بڑی خوبصورت بات کہی تھی۔ وہ بولے

تھے۔ ”سہام! دنیا سے جانا تو برحق ہے مگر اماں کے جانے سے تمہارا نقصان یہ ہوا ہے کہ اَب تمہارے لیے دُعا کے لیے اٹھنے والے ہاتھ نہیں رہے۔“

ماں کی دُعا سات آسمان پار کر جاتی ہے اور سیدھی رَب کے حضور پہنچتی ہے کیونکہ اس نے کہا ہے کہ میں ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہوں‘ اِس سے ماں کے درجے کی افضلیت کا احساس ہوتا ہے مگر ہم کم عقل لوگ کسی ایک لمحے میں اِس دُکھ کو سنتے ہیں‘ محسوس کرتے ہیں اور پھر کہاں کی ماں‘ کون سی ماں؟ سب بھول جاتے ہیں۔ اللہ ہم پر رحم کرے اور ہم اِس عظیم ہستی کا مقام سمجھیں اور مانیں۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

•......•......•......•

جب ہم حیدر آباد دکن گئے تھے تو وہاں میں نے بڑے بھائی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ میں ایک بار پھر حیدر آباد آؤں گی لہٰذا جب ایک بار بچوں کی چھٹیاں ہوئیں تو پھر بڑے بھائی صاحب سے کیا گیا وعدہ پورا کرنے کا وقت نکالا۔ سہام کی دفتری مصروفیات بہت تھیں‘ سو اس دفعہ میں اور میری تینوں بیٹیاں حیدر آباد دکن روانہ ہوئے تھے اور ہم حیدر آباد دکن پہنچ گئے۔ وہاں ہماری خوب آؤ بھگت ہوئی تھی۔ سہام کی بہن کے بیٹے نور جو بڑے بھائی کے داماد بھی تھے‘ اُن کی پوسٹنگ بطور کمشنر آندھرا پردیش ہوئی تھی۔ نور اور سہام بچپن کے دوست تھے۔ وہ سہام سے پندرہ دن عمر میں بڑے تھے۔ ہمارے وہاں قیام کے دوران ہی بقرعید بھی آنے والی تھی۔ سہام ہمارے ساتھ عید منانے کے لیے دس دن کی خصوصی چھٹی لے کر آئے تھے۔ اس دوران نور قربانی کے بکرے لے آئے تھے۔ اُن کی بیگم زمانی نے ہمیں یہ بات بتائی تھی کہ نور بکرا حلال نہیں کرتے۔ بابا (بڑے بھائی صاحب) آکر یہ کام کرتے ہیں لیکن اس دفعہ تو چچا (سہام) یہ قربانی کرلیں گے۔ صبح بقرعید تھی۔ قصائی آ گیا تھا‘ سوزمانی نے کہا۔ ”چلیں چچا! آپ قربانی کروادیں۔“

یہ بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ”زمانی! سہام تو مرغی بھی حلال نہیں کرسکتے‘ تم بکرا حلال کرنے کو کہہ رہی ہو؟“ پھر بڑے بھائی صاحب کو ڈرائیور لے کر آیا تو انہوں نے یہ فریضہ انجام دیا اور بولے۔ ”سہام میاں! نور میاں! تم دونوں بزدل ہو۔“

وہ بڑی یادگار عید تھی‘ خوب بریانی کی دعوتیں ہوئیں‘ وہ مزہ آج بھی یاد ہے اور وہ محبتیں بھی یاد ہیں۔ اَب نہ بھائی صاحب دنیا میں ہیں اور نہ نور مگر بس یادیں!!

•......•......•......•

یہ سب لکھتے ہوئے بہت بار دل نے کہا کہ قلم اور کاغذ کا رشتہ توڑ دوں مگر پھر کہیں سے آواز آئی۔ ”رخسانہ......! میں تم سے ہمیشہ کہتا تھا کہ لکھو‘ تم لکھ سکتی ہو۔“ یہ آواز سہام کی ہے‘ سو میں نے پھر کاغذ وقلم سے رشتہ استوار کیا۔ ”سہام......! زندگی میں تو میں یہ نہ کرسکی مگر اَب لکھنے کا سبب تم ہی ہو اور ہمیشہ رہو گے۔ میں نے کیا لکھا؟ کیسا لکھا؟ مجھے ضرور بتانا‘ کیا یاد رہا؟ کیا بھول گئی؟ اس میں بھی میری مدد کرنا جو میں پہلے نہیں سنتی تھی‘ اَب ضرور سنوں گی‘ وعدہ ہے!!“

گزرتے وقت کے ساتھ سہام بہت مصروف ہو گئے تھے۔ ہمارے اشاعتی ادارے سے ماہنامہ ”دوشیزہ“ کے علاوہ ”شوبزنس“ ...... ”بچوں کا رسالہ“ ...... ”میڈیکل ورائٹی“ اور ”پندرھویں صدی“ کے بعد ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ نکل رہے تھے۔ ہمارا دفتر ہی بڑا نہیں تھا‘ یہ بڑے قد آور لوگوں

کا مسکن بھی تھا۔ مقبول جلیس‘ دانش دیروی‘ رعنا فاروقی‘ شمیم نوید‘ سیما غزل‘ عابدہ رؤف‘ پرویز بلگرامی‘ طارق عزیز‘ سلیم ناصر‘ سلیم فاروقی‘ نعیم حبیب‘ پروین شیروانی‘ ناصر رضا‘ یہ ہی ہمارا خاندان تھا‘ نہ کوئی کم نہ زیادہ‘ نہ کوئی مالک نہ کوئی ملازم! ہر مہینے ایک بڑا کھانا ہوتا تھا اور پھر سب ذہن تروتازہ ہوجاتے تھے۔ کام کرنے کا نیا حوصلہ اور ولولہ پیدا ہوجاتا تھا۔ کام کے درمیان کچھ وقت نکال کر ضرور ہنستے بولتے تھے اور پھر ”دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ“ کی تیاری والا کام! کارڈز کی تقسیم‘ رائٹرز کی آمد‘ اُن کے ٹھہرنے کا بندوبست‘ ایک رنگ اور نور کے میلے کا سماں ہوتا تھا۔ زندگی کے ایسے اور اتنے رنگ تھے کہ دھنک بھی شرما جائے! اس ایوارڈز تقریب کے جتنے بھی صدور آئے‘ سب اپنی اپنی جگہ محترم اور معتبر تھے۔ میں اُن میں سے ایک صدیق سالک صاحب کا ذکر یہاں ضرور کروں گی۔ ایسے خوبصورت جملے اور برجستگی کہ محفل زعفران زار ہوجائے۔ وہ جتنی دیر ہمارے درمیان موجود ہوتے‘ ہر لب پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔

میں سہام کے ساتھ اسلام آباد صدیق سالک صاحب سے ملنے گئی تھی۔ ہم اُن کے دفتر پہنچے تھے تو چوکھٹ سے میرا پاؤں ٹکرا گیا تھا۔ انہوں نے ہنس کر پوچھا تھا۔

”بھابی! کیا ہوگیا؟“

میں نے کہا تھا۔ ”بھائی! وردی میں آپ کا سراپا دیکھ کر گھبرا گئی‘ آج مجھے ایک نئے صدیق سالک نظر آئے ہیں۔“

میری بات کے جواب میں ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ بولے تھے۔ ”ٹھیک ہے بھابی! میں آئندہ آپ سے وردی میں ہی ملوں گا‘ آپ پر رعب ڈالنے کا ایک اچھا نسخہ میرے ہاتھ آ گیا ہے۔“ پھر انہوں نے سہام کو مخاطب کیا تھا۔ ”تم بھی ایک وردی سلوالو!“

سہام جواباً نے کہا تھا۔ ”سالک صاحب! مجھ سے تو یہ وردی میں بھی خوف نہیں کھائے گی‘ جعلسازی بھی کروں‘ پیسے بھی خرچ کروں مگر صدیق سالک نہ بن پاؤں‘ نہیں بھئی‘ میں ایسے ہی بھلا‘ آپ تو ہیں ناں! بس یہی بہت ہے۔“

صدیق سالک صاحب سے یہ ہماری آخری ملاقات تھی‘ بعدازاں وہ صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ہی پلین کریش میں راہِ عدم سدھارے تھے۔

•......•......•......•

سہام نے گھر کے ایک کمرے کو بھی دفتر بنا رکھا تھا۔ وہ جب شام میں گھر آتے تو اُس کمرے میں سب مل کر چائے وغیرہ پیتے‘ بہت ساری باتیں ہوتیں‘ کچھ مشورے دیئے جاتے اور کچھ لیے جاتے اور ایسے میں اگر کوئی ملنے والا آ جاتا تو وہ بھی شاملِ محفل ہوجاتا تھا۔

سہام اکثر مجھ سے کہتے تھے۔ ”رخسانہ! تم مجھ کو بہت یاد کرو گی؟“

میں ہنس کر کہتی تھی۔ ”کہیں جا رہے ہو یا ارادے کچھ اور ہیں؟“

لیکن یہ سچ ہے سہام! میں آپ کو بہت یاد کرتی ہوں اور دَمِ آخر تک یاد کروں گی۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے رویے پر نادم بھی ہوتی ہوں۔ بہت کچھ ایسا ہوا تھا جو مجھے اکثر شرمندہ کرتا ہے اور آنکھوں کو تر کر جاتا ہے مگر پھر یہ بات یاد آتی ہے کہ

”انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔“

اور یہ بات دل کو سہارا دے دیتی ہے۔

(”یادوں کے اوراق“ کی آخری قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے گا۔)

سلسلے وار کہانی/ ایک نئی دلچسپ قسط وار کہانی' جسے آپ ہر ماہ پڑھنا چاہیں گے

شازلی سعید مغل

تاشون

حزیں صدیقی کا خیال

عالمِ رنگ و تماشا سے گزر
کوئی قیمت نہیں بینائی کی

حیرت، تجسس، اسرار اور ستاروں سے جڑے بہت خاص سلسلے کی اکیسویں کڑی

خلاصہ

''تاشون''...... ایک پاکستانی نژاد مصری ہے۔ اُس کے ماں باپ اُس کی پیدائش پر مصر چلے گئے تھے۔ وہ صرف ایک ماہر ستارہ شناس یا پراسرار علوم کا مالک ہی نہیں ہے بلکہ رُوحانیت کی منازل طے کرتا روشنی کا ایک استعارہ ہے۔ اُس کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کی دُعائیں بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت پاتی ہیں اور زمین پر معجزہ بن کر واپس آتی ہیں۔ ذوالفقار صہبائی عرف زلفی' تاشون کا جگری یار ہے جس کی بیوی رانیہ طاغوتی طاقتوں کے نرغے میں پھنس جاتی ہے۔ تاشون اپنے دوست زلفی کے بلانے پر پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔ رانیہ کی کیفیت واقعی خراب ہوتی ہے۔ وہ اکثر راتوں کو محسوس کرتی ہے کہ جیسے اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر گھر سے باہر جانے کی کوشش کرتی ہے لیکن جب اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتی تو واپس رانیہ کے جسم میں آ جاتی ہے۔ صورتِ حال نہایت گمبھیر ہوتی جا رہی تھی' ایسے حملے بار بار ہو رہے تھے۔ چنانچہ تاشون اپنے دوست کی مدد کرنے کے لیے پاکستان چلا آتا ہے اور یہاں آ کر رانیہ کا پیدائشی زائچہ بناتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رانیہ ساڑھ ستی کے زیرِ اثر ہے اور ستاروں کی کچھ خاص پوزیشنز لے کر پیدا ہوئی ہے۔ اس کی پیدائش کے وقت سورج گرہن تھا جو کہ شیطانی قوتوں کے لیے نہایت سعد وقت ہوتا ہے۔ شیطانی قوتیں ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہیں جن کی پیدائش کے وقت سورج یا چاند گرہن لگا ہو۔ رانیہ کے پیچھے بھی سیل شیا نامی ایک منظم طاغوتی تنظیم کی رکن لگی ہوئی ہے جسے اپنی طاغوتی قوتوں کو بڑھانے اور اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کے لیے رانیہ کی روح درکار ہے۔ اس کے مذموم مقاصد میں سب سے اہم مقصد اس کے شیطان صفت شوہر مہانیل کی واپسی سرِفہرست ہے۔ مہانیل وہ عفریت ہے جو کہ ایک صدی سے موت کی نیند سو رہا ہے۔ اپنے اس مذموم مقصد میں کامیابی کے لیے سیل شیا ہر حد سے گزرنا چاہتی ہے' چنانچہ اس نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک صحرائی دیہاتی چندوا کے مرنے کے بعد اس کے ہم زاد کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔ جس کے ذریعے وہ فراعنہ مصر کے خزانوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ سیل شیا نہایت کڑی تپیا کے بعد ایک مرتبہ رانیہ کی روح کو اس کے جسم سے نکالنے میں کامیاب بھی ہو گئی تھی مگر تاشون نے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رحمت کے طفیل روح کو اس کے جسم میں واپس بلا لیا تھا۔ اس وجہ سے سیل شیا کی طاقتیں اس وقت کمزور پڑ گئی تھیں جب اس کا اتنا کاری وار خالی گیا تھا اور رانیہ کی روح جسم سے نکلنے کے باوجود تاشون کے علم اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے واپس رانیہ کے جسم میں چلی گئی تھی۔ اپنی اس ناکامی پر سیل شیا پاگل ہو اٹھی تھی اسے اپنے آقا شیطان کو منانے کے لیے کافی جتن کرنے پڑے تب کہیں جا کر اسے ایک بار پھر یہ اجازت ملی کہ وہ کچھ عرصے بعد یہ عمل دوبارہ کر سکتی ہے۔ ادھر تاشون' زلفی کے دوست شہباز سولنگی کے گھر آئے مہمان کے جسم سے چار ہزار سال عمر رسیدہ جن کو نکالتا ہے۔ زلفی بہت فخر محسوس کرتا ہے کہ اُس کا دوست اس کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے کام بھی آ رہا ہے۔

راحت چچا نے سیل شیا سے ایک نوجوان کامران کی ملاقات کروائی ہے جس کی بہن رقیہ کے گھر عجیب و غریب خوفناک واقعات پیش آئے ہیں۔ سیل شیا کا کہنا ہے کہ وہ مکان اس کے بتائے ہوئے شخص کو فروخت کر دیا جائے ورنہ انہیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

تاشون سے ملنے اس کے والد صاحب کے زمانے کے ایک بزرگ شاکر علی صاحب آتے ہیں جو سنگاپور میں اپنے مکان میں رہنے والے دوسرے خاندان کا ذکر کرتے ہیں جو کوئی ڈاکٹر ٹیمسن کا آسیب تھا۔ زلفی کے گھر پر وہ اپنے سنگاپور والے مکان اور مادے اور جوہر کے ان کے والد اور ان کے نظریات کی بابت ذکر کرتے ہیں۔

تاشون نے ایک نہایت دلکش سے مضافاتی مقام پر ایک نہایت خوبصورت فارم ہاؤس بنایا ہے جہاں دوستوں کو دعوت پر مدعو کیا ہے۔ یہاں اسے سیل شیا کی جانب سے ایک تحفہ موصول ہوتا ہے۔

تاشون نے اُس تحفے کے حوالے سے بتایا تھا کہ سیل شیا بدلے کے لیے ایک خاص وقت کا انتظار کر رہی ہے اور اُس رات کو ہی فارم ہاؤس پر تاشون کے ڈرائیور پیرل خان کے ایک مہمان مکھن خان کی چیخیں سنائی دی تھیں جس نے ایک روح سندوتی پر قبضہ جمانے کا چکر چلایا تھا لیکن ناکام ہو گیا تھا۔ اسے تاشون نے نجات دلائی تھی۔ ان لوگوں کی زلفی کے گھر واپسی ہوئی تھی جہاں ایک فقیر کی آمد ہوئی تھی جو کہہ رہا تھا۔ ''دولت کی

دولتیں سب دھری رہتی ہیں باتیں“ پھر اس فقیر نے اپنی کہانی سنائی تھی۔

رانیہ کے گھر میں اوپر کسی روح کی آمد ہوتی ہے۔ یہ ایک بے بس لڑکی شائلہ کی روح ہے جو اپنے بھائی کو ڈھونڈنے نکلی اور خود موت کے چکر میں پھنس گئی۔ تاشون نے اسے بتایا کہ وہ مر چکی ہے اور پھر اسے اور اس کے بھائی کو انصاف دلوایا۔ اسی دوران میں تاشون دوسری مخلوق کے محبت کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے ایک اور واقعہ بتاتا ہے۔ صنوبر کے جنگل میں ایک لڑکی عاشی پر جن زادی سوار ہو گئی تھی‘ وہ جن زادی اپنے محبوب کی قبر پر آئی تھی اور عاشی نے اس کا پیر دبا دیا تھا۔ چنانچہ تاشون‘ عاشی کا علاج کرنے آتا ہے لیکن وہ جن زادی کسی انسان کی محبت میں گرفتار ہے جو مر چکا ہے۔ اس کی روداد سن کر تاشون رنجیدہ ہو جاتا ہے۔

عاشی کو جن زادی سنہرا سے نجات دلانے کی داستان سن کر سب لوگ متحیر تھے۔ اچانک ایک دن زلفی رات گئے گھر سے باہر تھا تو تاشون کو اپنے علم کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ وہ بیماریوں کے قافلے کی زد میں آ سکتا ہے‘ چنانچہ وہ اس کے جوتے میں جلتا ہوا انگارہ ڈال کر اس کو سڑک کے ایک طرف کر دیتا ہے اور پھر وہ بیماریوں اور وباؤں کی شکلوں‘ ان کے حلیوں اور نقصانات کے بارے میں بتاتا ہے۔ اُدھر سیل شیا اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے نئے سرے سے ہتھیار بند ہو رہی ہے اور ایک مرتبہ پھر مقابلہ خیر و شر ہونے کو ہے۔

عاشی کو جن زادی سنہرا سے نجات دلانے کی داستان سن کر سب لوگ متحیر تھے۔ اچانک ایک دن زلفی رات گئے گھر سے باہر تھا تو تاشون کو اپنے علم کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ وہ بیماریوں کے قافلے کی زد میں آ سکتا ہے‘ چنانچہ وہ اس کے جوتے میں جلتا ہوا انگارہ ڈال کر اس کو سڑک کے ایک طرف کر دیتا ہے اور پھر وہ بیماریوں اور وباؤں کی شکلوں‘ ان کے حلیوں اور نقصانات کے بارے میں بتاتا ہے۔ اُدھر سیل شیا اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے نئے سرے سے ہتھیار بند ہو رہی ہے اور ایک مرتبہ پھر مقابلہ خیر و شر ہونے کو ہے۔

سیل شیا کو اپنے جس مطلوبہ وقت کا انتظار تھا‘ وہ وقت قریب تھا اور اس کی نشاندہی کر دی گئی تھی۔ ادھر رانیہ کی بیٹی ربیعہ کو خسرہ ہو گئی تھی‘ وباؤں‘ بیماریوں کی اشکال کے بارے میں تو اس نے سنا تھا لیکن یوں کسی دن اس کے اپنے گھر میں اس کی ملاقات بچوں کی بیماری خسرہ کی ظاہری شکل سے ہو گی‘ یہ اس کے سان و گمان میں نہ تھا۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

وہ سیاہ رنگ کی گاڑی گھاس سے ڈھکے ہوئے اونچے نیچے راستوں پر جھٹکے کھاتی‘ تاریکی کے سینے کو اپنی تیز روشنی سے چیرتی ہوئی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ دور تک نظر آتی ایک لہراتی پیچیدہ سی سڑک اب گاڑی کی رہنمائی کر رہی تھی کہ دور جانے کے بعد ایک چھوٹے سے گاؤں کے نشانات واضح ہوتے جا رہے تھے۔ اُس وقت گاؤں کی فضا بالکل خاموش اور سنسان تھی۔ یہاں کے لوگ اپنے گھروں میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ دن بھر کی سخت محنت کے بعد دیہاتی زندگی میں اِن سادے اور محنت کش لوگوں کے لیے نیند کی دیوی ہمیشہ مہربان رہتی ہے‘ خواہ وہ سخت اینٹوں کا پتھریلا فرش ہو یا کھری بان کی چارپائی؟ نیند کی دیوی اپنا آنچل پھیلائے اُن کی منتظر ہوتی ہے‘ چنانچہ اس وقت بھی یہاں کے لوگ اپنے اتنے نزدیک سے گزرتی ہوئی عفریت سے قطعی بے خطر اور بے خبر تھے۔ انہیں بھلا کیا معلوم تھا کہ ان کے اتنے قریب ایک پراسرار اور خوفناک جنگ چھڑنے والی ہے۔

اَب وہ پیچیدہ لہراتی ہوئی سڑک گاڑی کو قصبے یا گاؤں سے باہر ڈیڑھ میل کے فاصلے پر بنے ایک ایسے مقام پر لے گئی تھی جو ایک چھوٹی پہاڑی کا دامن تھا۔ وہ سیاہ گاڑی پہاڑی کے دامن میں رک گئی تھی۔ اُس نے گاڑی کو وہیں چھوڑا‘ پہاڑی کے دامن میں سناٹا اپنے جوبن پر تھا۔ جنگلی جھاڑیوں سے آتی جھینگروں کی آوازوں کو یکلخت

بریک سا لگ گیا تھا۔ وہ گھاس اور جھاڑیوں میں لڑکھڑاتے ہوئے اَب آگے بڑھ رہی تھی‘ جھاڑیاں ہاتھوں سے ہٹاتی اور کانٹوں سے دامن بچاتی وہ اَب اُس پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ اس کی منزل وہ قدیم عمارت تھی جو پہاڑ پر سر اٹھائے کھڑی تھی۔ نہایت مہیب گھُپ اندھیرے میں بھی اُس عمارت کے کھنڈرات واضح دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ اَب پرشکوہ عمارت کے اُن کھنڈرات کے احاطے کے پاس پہنچ چکی تھی‘ یہ احاطہ لوہے کے جنگلے کا بنا ہوا تھا۔ گزرے وقت کے ساتھ ساتھ اَب اِس جنگلے کے آثار بھی معدوم ہو چلے تھے۔

یہ ایک قدیم عبادت گاہ تھی جو پانچ سو سال پہلے اس پہاڑی پر ایستادہ تھی۔ احاطہ ختم ہونے کے بعد پتھر کے بڑے بڑے ستونوں والا طویل برآمدہ تھا جس پر اَب بھی محرابوں کے شکستہ کنگورے لٹک رہے تھے اور کہیں کہیں گری ہوئی دیواروں کے ڈھیر موجود تھے۔ وہ اُن ڈھیروں سے خود کو بچاتی‘ راستہ بناتی اُس جانب بڑھ رہی تھی جہاں دو زبردست ستونوں کے قریب ایک مرکزی محراب کے شکستہ آثار کے نیچے قدیم ترین عبادت گاہ کے نشانات اَب تک نمایاں تھے۔ وہ عبادت گاہ کیا تھی‘ ایک قربان گاہ تھی جہاں دوشیزاؤں کو شیطان کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا اور وہ تمام کافرانہ رسوم ادا کی جاتی تھیں جو شیطان پرستوں کے لیے نہایت مقدس و متبرک مانی جاتی تھیں۔

اس عمارت کے کھنڈر میں جو بات اہم تھی‘ وہ یہ کہ یہ عبادت گاہ (شیطان پرستوں کی) بڑی بڑی محرابوں پر مشتمل تھی اور ساری محرابیں ”چاند“ کی شکل میں بنائی گئی تھیں اور جگہ جگہ چاند کی شکل کے پتھروں کو استعمال کیا گیا تھا۔

وہ ان دو محرابوں کے درمیان جا کر بیٹھ گئی تھی جو کہ چاند کی شکل میں بنائی گئی تھیں۔ یہ جمعرات کی رات تھی جو کہ آخری عشرے کی پہلی رات بھی تھی۔ اس وقت تثلیث زحل و عطارد بن رہی تھی۔ اس کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ آبادی سے دور اس پانچ سو سالہ پرانی عمارت میں جس کے سارے ستونوں کو چاند کے رخ اور چاند کی محرابوں کی شکل میں ڈھالا گیا ہے‘ ابابیل کے ایک پرانے گھونسلے میں اس کے مطلوبہ بچے موجود ہیں۔ شرط یہ تھی کہ وہ ابابیل کے اُن بچوں کو خود اپنے ہاتھ سے نکالے‘ چنانچہ اس اندھیری رات میں وہ اپنے گوہرِ مقصود کو حاصل کرنے نکل پڑی تھی۔

ابابیل کے اُس گھونسلے میں اندازاً چھ‘ سات بچے ہوں گے لیکن اس کو صرف چار مطلوب تھے۔ اُس نے ایک ہی جھپٹے میں چار بچے گھونسلے سے نکال لیے تھے‘ یوں شب خون مارنے پر ابابیلوں کے گھونسلے میں ایک قیامت ہی برپا ہو گئی تھی۔ ابھی ابابیلوں کے جوڑے نے احتجاجاً اس پر حملہ کیا ہی تھا کہ اُس نے منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا کر اُن کی طرف ایک پھونک ماری تھی‘ ابابیلوں کا جوڑا وہیں پہلے فضا میں معلق اور پھر یکلخت زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اَب اُس نے گھونسلے سے نکالے ہوئے چاروں ابابیل کے بچے اپنے ساتھ لائی ہوئی ایک کوری ہنڈیا میں بند کر دیے تھے اور اَب وہ مسلسل منہ ہی منہ میں قدیم زبان کے الفاظوں پر مشتمل ایک منتر پڑھ رہی تھی پھر وہ وہاں رکی نہیں‘ تیزی سے اُس عمارت سے نکلی اور پہاڑی سے اتر کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھی اور جس راستے سے وہ آئی تھی‘ اُسی راستے سے واپس چلی جا رہی تھی۔ اَب گاؤں سے نکل کر پہلا چوراہا آ چکا تھا۔ اس نے وہاں پہلے سے تیار کیے گئے ایک گڑھے میں ابابیل کے زندہ بچے ہنڈیا سمیت دفنا دیے تھے۔ وہ تھوڑی دیر اُس گڑھے کے پاس کھڑی رہی اور پھر سیاہ رات کی سیاہی میں وہ اور اس کی سیاہ گاڑی مدغم ہو گئے۔

اس واقعے کے ٹھیک آٹھ روز بعد جب چاند کی اماوس تھی یعنی اٹھائیسویں شب' وہ ایک مرتبہ پھر اسی مقام پر آئی تھی اور چوراہے پر نشان زدہ گڑھے سے وہ مٹی کی ہنڈیا نکال لی تھی اور اُسے گھر لا کر اُس نے اپنے مخصوص کمرے میں آگ جلائی تھی اور پھر ہنڈیا کو آگ پر رکھ دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے ہنڈیا کا ڈھکن ہٹا دیا تھا۔ ابابیل کے مردہ بچے دیکھتے ہی دیکھتے راکھ میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اَب اُس نے اُس راکھ کو ایک سنہری ڈھکنے والی ڈبیہ میں محفوظ کر لیا تھا۔ اَب اس کے پاس بیش بہا قیمتی رماد ثانی آ چکا تھا۔ سیل شیا اُس پراسرار اور خوفناک جنگ کے سلسلے کا مرکزی ہتھیار حاصل کر چکی تھی' وہ سرشاری اٹھی اور اپنے اُس مخصوص کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور پھر اپنی خواب گاہ میں جا کر ایک مخمور نیند کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔

وہ ایک شوخ گلہری کی طرح ایک کھڑکی کے ذریعے سیل شیا کے مخصوص کمرے میں داخل ہوئی تھی اور رماد ثانی کے سفوف سے ایک چٹکی سفوف اپنے ساتھ لائی ڈبیہ میں ڈالا تھا اور یوں ہی زقند بھرتی شوخی کے ساتھ کھڑکی کے ذریعے واپس ہولی تھی۔ وہ سیل شیا کے مخصوص کمرے کی کھڑکی تک آتے ایک درخت کی موٹی شاخ سے جھولتی ہوئی دھم کی ہلکی آواز کے ساتھ نیچے کود گئی تھی اور کچھ دیر بعد دبے پاؤں اپنی خواب گاہ میں پہنچ گئی تھی۔

اَب پراسراریت میں ڈوبے اُس درختوں میں گھرے مکان کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں ایک نہایت پراسرار و خوفناک عمل کی شروعات ہو چکی تھی۔ سفید ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس ایک پرکشش مگر سوگوار حسن لیے سیل شیا کے برعکس اُس کے بال اس کی کمر کو چھو رہے تھے۔ اُس نے اپنے کھلے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے کیا تو یوں لگا تھا کہ بدلی سے ایک سوگوار چاند نے جھانکا ہو۔ وہ چند منٹ تک اپنی سانس روکے کچھ پڑھتی رہی تھی۔ اس کے سامنے مٹی کے تسلے میں ایک لمبے پھل والی چھری رکھی تھی پھر اس نے اپنے سامنے اپنے پاس پڑے ایک سیاہ رنگ کے تھیلے سے ایک سیاہ چمکدار بلی نکالی تھی جس میں ایک بھی بال دوسرے رنگ کا نہ تھا' وہ اس وقت نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی' اس نے نیم بے ہوش بلی کو اپنی گود میں لٹا کر پہلے تو پیار سے اس پر دو تین مرتبہ ہاتھ پھیرا تھا اور پھر یکلخت مٹی کے تسلے میں لٹا کر اس کی گردن پر تیز چھری پھیر دی تھی۔ بلی بغیر کسی مزاحمت کے ٹھنڈی ہو گئی تھی اور پھر جب گردن کٹی بلی کے جسم سے ایک ایک قطرہ خون اس مٹی کے تسلے میں جمع ہو گیا تو اس نے آہستگی سے بلی کو ایک دوسرے تسلے میں اس طرح ڈالا تھا کہ خون کا ایک قطرہ بھی باہر نہ گرا تھا پھر اس کے نازک ہاتھوں نے بلی کے سینے سے اس کے دل کو چیر نکالا تھا اور اس دل کو ہتھیلی پر رکھ کر وہ ہذیانی انداز میں ہنس دی تھی اور پھر اس نے دل کو ایک چیرا لگا کر اس میں سیل شیا کے کمرے سے لایا گیا طلسماتی سفوف رماد ثانی اور سات دانہ تخمِ ارنڈی رکھ کر سی ڈالا تھا۔ اب اس کا کام ختم ہو چکا تھا' اس نے بلی کے دل کو ایک خوبصورت ڈبے میں حفاظت سے رکھا تھا اور مٹی کے تسلے میں موجود بلی کے خون کو اپنے جسم اور ہاتھوں پر مل لیا تھا۔ اس کے بعد وہ واش روم میں گھس گئی تھی' یوں ایک ہی گھر میں دو الگ الگ مقاصد کے لیے لڑی جانے والی خوفناک جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔

•......•......•......•

مشرقی دریچے کے باہر موجود ایک درخت کی شاخوں اور پتوں سے چھن کر آتی سورج کی کپکپاتی کرنیں نومبر کی اوائلی خنکی لیے تاشون کے چہرے پر دھوپ چھاؤں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ سورج کی ان جھجکتی' کپکپاتی کرنوں کی دستک کو جب تاشون نے بار بار اپنے چہرے پر محسوس کیا تو دھیرے سے اپنی درخشانی آنکھیں کھول

دیں' تھوڑی دیر تو وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے رہا اور پھر جیسے یکلخت اسے یاد آیا کہ وہ اس وقت کہاں موجود ہے؟ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس وقت وہ اپنی رصدگاہ سے متصل دارالمطالعہ میں موجود تھا' وہاں میز پر لاتعداد کتابیں اور نسخہ جات بکھرے پڑے تھے۔ وہ پوری رات دارالمطالعہ میں موجود رہا تھا اور پھر صبحِ کاذب سے کچھ دیر پہلے فجر کی نماز کے بعد اسکی آنکھ لگ گئی تھی اور اتنی گہری لگی تھی کہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پوری رات کی گہری نیند سے بیدار ہوا ہو۔ بہر حال وہ بہت مطمئن اور مسرور تھا' گوہرِ مقصود جو ہاتھ آ گیا تھا۔

تاشون نے جلدی جلدی اپنے اردگرد پھیلی کتابیں اور نسخہ جات کو واپس ہشت پہلو شیلف میں پہنچایا تھا اور پھر ایک دو اہم فون کرنے کے بعد تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر پہنچ گیا تھا۔ وہ اوائل نومبر کے پہلے ہفتے کی صبح تھی' ہر شئے پر جیسے ایک سرخوشی و سکون سا چھایا ہوا تھا۔ موسم کوئی بھی ہو' دل یا باہر کا' اس کی خوبصورتی میں ایک عجیب سی پراسراریت ہوتی ہے کہ شروع شروع میں ایک سرخوشی اور سکون بھری طمانیت کا احساس رگ و پے میں سما سا جاتا ہے پھر جیسے جیسے یہی موسم شدتیں اختیار کرتا ہے تو کمزور طبیعت بندے جی چھوڑ دیتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ تاشون کا پسندیدہ موسم شروع ہو چکا تھا۔ اسے بچپن سے ہی کڑکتے جاڑوں کا انتظار رہتا تھا۔ عملیات کی دنیا میں آ جانے کے بعد بھی اس انتظار میں کوئی کمی نہ آئی تھی' وہ اب بھی اپنی تمام تر مصروفیت کے ساتھ جاڑوں کے اس گلابی موسم کو جس حد تک ممکن ہوتا' انجوائے کرتا تھا۔ یہی وہ پر شوق تھی جس کی بنا پر وہ پوری رات جاگنے کے باوجود فریش اور مطمئن تھا۔ اس وقت ناشتے کی ٹیبل پر رانیہ' زلفی اور مونگا سب موجود تھے اور سب نے بڑے خوشگوار ماحول میں ناشتہ کیا تھا۔

''آپ لوگ آج سہ پہر کو مجھ سے مل سکتے ہیں؟'' تاشون نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھے کچھ ضروری باتیں ڈسکس کرنی ہیں!''

''خیریت ہے نا؟'' زلفی کو پریشانی سی لاحق ہوئی تھی۔

''ہاں' بالکل خیریت ہے' ڈونٹ وری!'' تاشون نے مسکراتے ہوئے کہا تھا لیکن رانیہ کی چھٹی حس جیسے بیدار ہو گئی تھی' اس کے دماغ کو اب جس طریقے سے سوچنے کی عادت پڑ گئی تھی' اس کو دور کرنا آسان بات نہ تھی' تشویش کی لکیریں اس کے چہرے پر واضح ہو چکی تھیں جنہیں تاشون نے صاف محسوس کیا تھا لیکن اُس وقت وہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

•......•......•......•

''جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں' ان کی مثال مکڑی کی مانند ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور بلاشبہ مکڑی کا گھر' سب گھروں سے زیادہ کمزور ہوتا ہے۔ کاش' یہ لوگ اس حقیقت کا علم رکھتے کہ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو بھی پکارتے ہیں' بے شک اللہ اسے خوب جانتا ہے اور وہ بڑا زبردست ہے اور بڑا حکمت والا ہے۔''

(سورۃ العنکبوت' پارہ نمبر ۲۹' ترجمہ آیات ۴۱-۴۲)

وہ ایک گھنے نیم کے درخت کے نیچے بان کی چارپائی پر بیٹھے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو نہایت جذب کے عالم میں قرآنِ پاک کا درس دے رہے تھے۔ سورۃ العنکبوت کی آیات پر اُن کے آج کے درس کا اختتام ہوا جا رہا تھا کہ صحن سے متصل دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ استادِ محترم کے اشارے پر ایک بچے نے اٹھ کر دروازہ

کھولا تو تاشون اندر داخل ہوگیا تھا۔

''آ گئے تم؟ آؤ' ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔'' بزرگ نے مسکراتے ہوئے تاشون کا استقبال کیا تھا۔

تاشون نے نہایت گرم جوشی اور پرمسرت انداز میں اُن سے مصافحہ کیا تھا' اس کی کیفیت حیرت وخوشی سے عبارت تھی۔

''ارے' تم لوگ گئے نہیں؟'' بزرگ نے بچوں کی جانب مڑتے ہوئے کہا تھا جو اس اثناء میں تاشون کے گرد جمع ہوگئے تھے اور تجسس وحیرت سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے تاشون کے گرد باقاعدہ گھیرا ڈال رکھا تھا۔ استاد محترم کی آواز پر بچوں نے وہاں سے جانا شروع کردیا تھا مگر وہ سب مڑ مڑ کر تاشون کو دیکھے چلے جارہے تھے۔

''بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں' چاہے وہ کسی کے بھی ہوں؟ کیوں تاشون؟'' بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''برا مت ماننا' وہ تمہیں چھو بھی رہے تھے۔''

''ارے نہیں بزرگوار!'' تاشون نے خوش دلی سے کہا تھا۔ ''اور مجھے تو معلوم ہی نہ ہوسکا کہ آپ یہاں ہیں ورنہ میں آپ سے بہت پہلے ہی مل چکا ہوتا۔'' تاشون کے لہجے میں ایک افسوس سا نمایاں تھا۔

''ارے نہیں بھئی' تم کچھ محسوس نہ کرو' ہم نے تو دو چار دن پہلے ہی ڈیرا لگایا ہے' آؤ بیٹھو!'' بزرگ نے اپنے سامنے رکھی دوسری چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

ململ کے سفید کرتے اور دھوتی میں ملبوس سر پر ہاتھ کی سلی ہوئی ٹوپی جمائے' خوبصورت آنکھوں والے' سفید برف سی رنگت لیے' وہ باریش بزرگ اب ایک جھاڑو لے کر صحن میں لگے نیم کے سوکھے پتوں کا کچرا اسمیٹ رہے تھے۔ تاشون کو ایک لمحے کے لیے خیال آیا تھا کہ وہ بزرگ سے جھاڑو لے کر خود کچرا سمیٹنے میں ان کی مدد کرے۔

''نہیں تاشون......! جس کا کام اسی کو ساجھے' صفائی میرا کام ہے۔'' یہ کہتے ہوئے بزرگ زیر لب مسکرائے تھے۔ ''تم یہ ننھے پھل چکھو' دیکھو تو ساری گرمیوں کی تمازت برداشت کر کے کتنے میٹھے ہوگئے ہیں۔'' بزرگ نے نیم کی پکی ہوئی نمکولیاں طشتری میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ تاشون نے ایک نمکولی منہ میں ڈال لی تھی۔ وہ بھلا ان کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔

''آپ یہاں اچانک کیسے؟'' تاشون نے سوال کیا تھا۔

''تمہارے بابا جان کے لاڈو پیار میں!'' بزرگ مسکرائے تھے۔ ''بس بھگائے بھگائے پھر رہا ہے' ہمیں ایک کام سے بھیجا ہے' تمہیں نہیں بتایا اس نے؟'' انہوں نے تاشون کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''جی' کل رات انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا تھا لیکن صرف آپ کے آنے کی اطلاع دی تھی اور ملنے کا کہا تھا۔''

''پدرانہ محبت!'' بزرگ دھیرے سے مسکرائے تھے۔ ''تم اَب جس جنگ کا آغاز کرنے والے ہو تاشون! اس میں تمہیں اپنے والد گرامی کی رُوحانی مدد درکار ہوگی۔ وہ عالمِ ارواح سے تمہاری مدد کو آنا چاہتے تھے بلکہ ہیں مگر اَب جب صفائی کا کام ہمارا ہوا تو پھر اُن کو کیوں تکلیف دیں؟'' وہ بزرگ صحن کی جھاڑو دینے کے بعد اَب پودوں کی کیاریوں کو درست کررہے تھے' مرجھائے سوکھے پتے چُن رہے تھے' خودرو گھاس نکال رہے تھے' اُن کی ہر بات میں ایک رمز تھا' اشارہ تھا۔

''یہ دیکھو' مکڑی کا گھر!'' انہوں نے ایک پودے پر تنے مکڑی کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ ''کتنا کمزور مکان ہے اس کا مگر بظاہر خوفناک' تمہارے مد مقابل جو قوتیں ہیں' ان کا جال بھی یہی ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنانے والوں کا حال مکڑی کے اس مکان جیسا ہے' یہ دیکھو۔'' انہوں نے ایک لکڑی سے مکڑی کا جالا اتار دیا تھا۔ ''صفائی میرا کام ہے' تم جاؤ اور مطمئن رہو لیکن تم نے میرے کہنے پر ایک کام ضرور کرنا ہے!''

''وہ کیا؟'' تاشون نے کچھ تجسس سے پوچھا تھا۔

''اس کم نصیب کو واپسی کا راستہ دکھاؤ' بہت دیر ہوچکی ہے اسے بھٹکتے ہوئے' تڑپتے ہوئے' تم میری بات سمجھ گئے ناں؟'' یہ کہہ کر بزرگ زیر لب مسکرائے تھے۔

''بہت بہتر جناب!'' تاشون جان چکا تھا' وہ بزرگ کس طرف اشارہ کررہے ہیں پھر وہ مصافحہ کر کے واپس ہولیا تھا۔

تاشون سہ پہر تقریباً چار بجے گھر میں داخل ہوا تھا تو سب ہی اُس کا انتظار کررہے تھے۔ زلفی بھی اس کے کہنے پر جلدی آ گیا تھا اور بڑی بے صبری سے تاشون کا منتظر تھا۔ تاشون نے انہیں وہیں لاؤنج میں رکنے کے لیے کہا تھا اور خود بھی ذرا دیر میں فریش ہوکر اُن کے درمیان آ بیٹھا تھا' اسی دوران رانیہ نے ملکیا کو چائے تیار کرنے کا کہا تھا۔ اس نے کچھ اسنیکس بھی بنا لیے تھے۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ سب لاؤنج میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے تھے۔

''میں آپ سب سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا تھا اس لیے آپ لوگوں کو آج سہ پہر کا ٹائم دیا تھا۔'' یہ کہہ کر تاشون نے خاص طور پر رانیہ کو دیکھا تھا۔

''یہ بات مجھ سے متعلق ہے' میں یہ جانتی ہوں۔'' رانیہ نے تجسس بھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ پراعتماد تو نظر آرہی تھی مگر اداس!

''بھابھی' ہمیں آپ کے حوصلے کی بدرجہ اتم ضرورت ہے' بس آپ یہ یاد رکھیں' کامیابی یقیناً ہمارے قدم چومے گی۔''

''مجھے یقین ہے رانیہ بہت حوصلے اور ہمت سے کام لے گی۔'' زلفی نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''میں آپ لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ چند دن بعد مکمل طور پر سورج گرہن ہوگا اس لیے ہمیں تیاری کرلینی چاہیے۔''

''آسمانوں پر ایک شادی زمین والوں پر کتنی بھاری پڑتی ہے؟'' رانیہ نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ آسمانوں پر شادی سے موسوم کیا ہے؟'' مونگا نے حیرت سے رانیہ کو دیکھا تھا۔

''ہاں' جب بھی ہم سورج گرہن یا چاند گرہن کی بات سنتے تھے تو میرے دادا یہ بات کہتے تھے۔''

''پرانے بڑے بوڑھوں کی بات کچھ اور ہی تھی۔'' تاشون نے تعریفی انداز میں کہا تھا۔ ''انہیں ایسی باتوں کا کافی علم ہوتا تھا اور مشکلات سے بچانا علم ہی کا کام ہے' آج جو بات مغربی فلاسفر کہتے ہیں' وہ ہمارے بزرگ بھی کہتے آئے ہیں جبکہ آج کے لوگ کم علم ہیں' فطرت کے بارے میں کچھ جانتے نہیں اور جاننا بھی نہیں چاہتے۔''

''یہ شادی......اور چاند' سورج؟'' زلفی کو یہ بات کچھ جچی نہیں تھی۔

"اس میں اچنبھے کی بات کم علمی کی ہی وجہ سے ہے۔ رانیہ نے جوبات کی درست ہے مغربی فلاسفر بھی کہتے ہیں کہ سورج گرہن یا چاند گرہن آسمانوں پر ایک شادی ہوتی ہے شمس قوتِ مردانہ سے تعلق رکھتا ہے اور قمر (چاند) قوتِ نسوانی سے ان کا قران ایک مجلس تمل قائم کرتا ہے علم نجوم کی رو سے اور اس کی اصطلاح میں دو برج جب ایک جگہ جمع ہو کر ایک مجلس قائم کرتے ہیں تو وہ ملاپ یا قران کہلاتا ہے۔ قدرت کے کارخانے میں سب سے پہلی تقسیم دو کی ہے جس میں دن رات سرد گرم کی بے شمار تقسیمیں مثبت و منفی کردار ادا کرتی ہیں سورج مثبت اور چاند منفی ہے سورج کی تاثیر گرم اور چاند کی ٹھنڈی ہے سورج میں قوتِ انعکاس ہے اور چاند میں قوتِ جاذبہ ہے اور جب یہ ایک نقطے پر آجاتے ہیں ایک مجلس قائم کرتے ہیں تو نتیجے میں ایک کا عکس دوسرے پر پڑتا ہے اور اس کی تاثیر تمام دنیا میں پھیل جاتی ہے اور یہ اتنی موثر ہوتی ہے کہ حاملہ عورت اس وقت قینچی سے کچھ کاٹے اور ذرا بھی دھیان پیٹ کی طرف چلا گیا ہو تو بچے کا کوئی عضو متاثر ضرور ہو گا اگر اس وقت وہ اپنی پیشانی پر کوئی نشان بنائے گی تو بچے کی پیشانی پر بھی وہی نشان ظاہر ہو گا۔ اگر کسی کے گھر میں کیڑے وغیرہ ہوں مثلاً لال بیگ وغیرہ تو گرہن کے وقت ایک پیالے میں چند لال بیگ ڈال کر مکان سے باہر پھینک دیں اور کہا جائے کہ پھر نہ آنا تو اس مکان سے کیڑے نکل جائیں گے اور پھر نہیں پیدا ہوں گے۔ دو عظیم قوتوں کے ملنے سے ایک تاثیر پیدا ہوتی ہے جو زمین کو بے حد متاثر کرتی ہے یہ گرم اور سرد مادی تاثیر ایک زبردست روحانیت میں بدل جاتی ہے مقناطیسی لہروں کا زور باہر کی طرف ہو جاتا ہے ذرا سی تاثیر ہزار گنا بڑھ جاتی ہے اور نیا کام کر دکھاتی ہے اور جو عمل گرہن کے وقت کیے جاتے ہیں اس کے اثرات فوری طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔"

"بھائی صاحب......! میں ایسے موقع پر آپ کے کسی بھی عمل کا حصہ بننے کے لیے تیار ہوں۔" رانیہ نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا تھا۔ "میں اپنا حوصلہ برقرار رکھوں گی اور اس سلسلے میں آپ سے پورا تعاون کروں گی۔"

"گریٹ! یہ ہوئی نا بات مجھے صرف آپ کا ہی حوصلہ درکار ہے بھابھی!" تاشون نے نہایت مطمئن انداز میں کہا۔ اُس وقت عصر کی اذان ہو چکی تھی اور تاشون نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

•......•......•......•

نماز کے بعد جب تاشون اپنے کمرے میں واپس آیا تو "وہ" موجود تھی اور اس کے بیڈ پر بیٹھی سسک رہی تھی۔

"تم!" تاشون قدرے ناگواریت سے کہا تھا۔ اس نے اپنی مخمور آنکھیں اٹھائی تھیں جن سے وفاؤں کا آبشار بہہ رہا تھا۔

تاشون ابھی اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسے آج کی بابا جی سے کی گئی ملاقات یاد آ گئی تھی اور ان کے الفاظ تاشون کے کانوں میں گونجے تھے۔ "اس کم نصیب کو واپسی کا راستہ دکھاؤ۔" راشانیہ کے حوالے سے کی گئی گفتگو یاد آتے ہی تاشون کے اعصاب پرسکون ہو گئے تھے۔ وہ خاموشی سے اس کو دیکھتا رہا تھا۔

آج اس کی چھب ہی نرالی تھی فراعنہ مصر کے زمانے کے تمام زیورات اس کے جسم پر سجے ہوئے تھے اور ایک عظیم الشان تاج اس کے سر پر جگمگا رہا تھا وہ ایک عظیم الشان شہزادی تھی لیکن محبت نے اسے کائنات کا فقیر بنا دیا تھا وہ بھٹک رہی تھی لیکن آج صرف اس کی آنکھیں ہی جل تھل تھیں جبکہ چہرے پر ایک انوکھی نور و سکون تھا۔

دودھ کی مٹھاس

دودھ میں ایک خاص قسم کی مٹھاس پائی جاتی ہے جس کی پھٹکری کی طرح قلمیں بھی بن سکتی ہیں۔ مٹھاس کا یہ عنصر Lactose کہلاتا ہے۔ بعض لوگوں میں اسے ہضم کرنے کی صلاحیت یا تو سرے سے ہوتی ہی نہیں یا بہت کم ہوتی ہے۔ ایسے لوگ دودھ پیتے ہیں تو انہیں الٹی، دست یا پیٹ میں شدید درد شروع ہو جاتا ہے۔ ڈبے کا دودھ پینے والے بعض بچوں کو جب یہی عارضہ لاحق ہوتا ہے تو ان کا دودھ تبدیل کر کے ایسے برانڈ کا دودھ دیا جاتا ہے جس میں Lactose نہیں ہوتے۔ بہت سے لوگ کافی عرصے تک اس بات کو سمجھ نہیں پاتے کہ ان کے پیٹ میں کبھی کبھار جو شدید درد اٹھتا ہے اس کی وجہ دودھ یا کوئی اور ایسا مشروب ہوتا ہے جس میں Lactose موجود ہوتے ہیں۔

یہ دیکھ کر تاشون کو حیرت ضرور ہوئی تھی۔ وہ آج گڑگڑائی تھی اور نہ ہی اس نے اپنی محبت کی دہائی دی تھی بلکہ وہ اٹھ کر آہستگی سے اس کے قریب آئی تھی اور مسکرا دی تھی۔

"میرے محبوب...... آپ حیران نہ ہوں میں آج آپ کی تمام حیرانیاں دور کر دوں گی میں آج آپ کو ستاؤں گی نہیں اور نہ ہی دہائیاں دوں گی۔ میرے محبوب میں ہزار ہا سال سے تنہا اس آتش المرگ کی جلن میں جل رہی ہوں مگر میں محبت کے بھید کو پا نہ سکی آپ کے اقرار کے لیے در در بھٹکتی رہی مجھے کیا حاصل ہوا؟ کچھ نہیں میں ہمیشہ آئی آپ کے آس پاس رہتی اور پھر آپ کی ناراضگی ایک نیا درد بن کر میرے دل میری روح میں ایک نیا شگاف ڈال دیتی مجھے آپ سے محبت تو کیا ملتی میری اپنی محبت آپ کے قدموں میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی جس پر آپ اپنے قدم رکھ کر گزر جاتے...... لیکن مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں میں بہت خوش ہوں کہ آپ میرے محبوب ہیں میرے جانے کے بعد اگر کبھی آپ کو میری یاد آئی ایک مرتبہ ہی سہی تو میں سمجھوں گی کہ میری ہزار ہا سال سے بھٹکتی محبت کامیاب ہو گئی۔ علم، عمل اور عشق یہ تین راہیں ہیں زندگی کے جن میں سے آپ نے علم و عمل کو چنا اور میں نے عشق کو آپ کو اس فضا کی خاموشیوں اور تنہائیوں کا سامنا ہے ناہموار زمینوں اور دشوار گھاٹیوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے جبکہ مجھے دریاؤں اور طوفانی سمندروں کے اُس پار جانا ہے۔ میرا علم بھی آپ ہیں عمل بھی اور عشق بھی لیکن مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تین راہوں کی منزل ایک ہی ہے یعنی خدا کا گھر! میں اب جانا چاہتی ہوں میرے محبوب مجھے رخصت کر دیجیے۔" اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو موتیوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔

تاشون محبت کے اس عظیم معجزے پر واقعی انگشت بدنداں تھا۔ محبت کے اسرار بڑے بڑے عالم و زاہد نہ پا سکے جو محبوب سے ملا کر مالک تک جانے کا راستہ بتاتی ہے۔ محبوب تو ایک میڈیم ہے کل سے ملنے کا...... تاشون کو خوشی تھی کہ وہ ایک ہزار ہا سال سے بھٹکتی پیاسی روح کو ابدی سکون پہنچانے والا ہے جو بات وہ ہمیشہ راشانیہ کو سمجھاتا تھا اس کا اثر یوں ہو گا اور اتنی خوبصورتی سے ہو گا!! اسے پتہ تھا اس سے محبت کا دعویٰ کرنے والی ہستی کوئی عمولی نہیں ہو سکتی۔

حیرت اسرار تجسس اور علم و آگہی
سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی
آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' ایک مفید معلوماتی اور مستقل سلسلہ ہے۔ یہ کالم خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے ساتھ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے استفادہ کیا اور ہزاروں لوگوں نے اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ حاصل ہوتا رہا اسی تناسب سے ہر ماہ وصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ گزشتہ کئی برسوں میں ان خطوط کی تعداد اتنی تجاوز کرگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں جواب دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے اپنے جواب کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیونکہ پرچے کے صفحات بہرحال محدود ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس رہا ہے کہ لوگوں کے مسائل اور مشکلات بہت زیادہ اور عموماً فوری حل طلب ہوتی ہیں۔ ان کے لیے طویل انتظار ایک اذیت ناک کام ہے۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جواب براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا' ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے اور مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ میری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی' قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے اور بس۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور اس سے زیادہ قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ صاحبِ استطاعت حضرات اور خواتین سے درخواست ہے کہ وہ ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں' وہ اپنی بساط کے مطابق اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں بسنے والی اُن خواتین کے جوابات بھی سپردِ ڈاک ہو جائیں گے جو کسی مجبوری کی بنا پر ڈاک خانے تک نہیں جاسکتیں اور =/300 روپے کا منی آرڈر نہیں کر سکتیں۔ یہ ایسی نیکی ہوگی جس کا اجر اس دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔ اب تک صرف ممالکِ غیر میں مقیم حضرات نے از خود تعاون کیا ہے۔ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو قارئین کے خطوط اور میرے جوابات کو فوری سپردِ ڈاک کرنے کا ریکارڈ مرتب کرنے اور دیگر متعلقہ امور کو سرانجام دینے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں تو برائے کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ لفافے میں بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ کا نمبر ضرور تحریر کریں۔ وہ تمام خطوط جو =/300 روپے ٹوکن منی اور جوابی لفافے کے بغیر موصول ہوں گے اُن کے جوابات حسبِ سابق پرچے میں شائع ہوتے رہیں گے۔ خط ارسال کرنے سے پہلے درج ذیل ہدایات نوٹ فرمالیں۔

(۱) براہِ راست جواب درکار ہو یا کالم کے ذریعے' دونوں صورتوں میں اپنا اور اپنی والدہ کا اصل نام تحریر کریں۔ کالم میں اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو اصلی نام کے ساتھ کوئی فرضی نام بھی تحریر کریں تاکہ مسئلہ اُسی نام سے شائع کیا جائے۔ جان بوجھ کر گمنام اور فرضی ناموں کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ اپنے مسائل پوری سچائی کے ساتھ پیش کریں۔ غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ اس سے فائدے کی بجائے' نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ (۲) منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ صرف ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔ (۳) اپنا مسئلہ مختصر' واضح اور کاغذ کی ایک جانب لکھیں۔ ایک خط میں دو سے زائد مسائل تحریر نہ کریں۔ (۴) کوئی عمل یا وظیفہ کریں تو نماز کی پابندی کا عہد کریں اور اپنے لیے دُعا کرنے سے پہلے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے دُعائے خیر کریں۔ (۵) صرف خصوصی وظائف کی اجازت درکار ہوگی۔ لفافے کو بند کرنے کے لیے زیادہ گوند نہ لگائیں' اس طرح خط پھٹ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط ہم تک نہیں پہنچتے لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ خط رجسٹری ڈاک سے بھیجے جائیں۔ جوابی لفافے پر مکمل پتا واضح اور خوشخط لکھا جائے۔ فوری جواب کے لیے اپنی ڈاک اس پتے پر روانہ کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110۔ آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ۔ کراچی۔

ماہِ ذوالقعدۃ

عزیزو......!

ذوالقعدۃ کا مہینہ بھی حرمت والے مہینوں میں سے ہے کہ جن میں جدال و قتال حرام ہے لیکن اسلام کے نام پر قائم کیے گئے اِس پاک وطن میں آج کیا ہو رہا ہے؟

عزیزو......! اپنے لیے اور اپنے تمام جاننے والوں کے لیے بلکہ تمام انسانیت کے لیے دُعا کریں۔

اللہ ہم سب کو اپنی اَمان میں رکھے۔ دل دکھ سے بھرا ہوا ہے۔ یقیناً وہ لوگ بہت خوش نصیب تھے جو اپنے پیاروں اور اپنی زمین کو خون میں رنگا نہ دیکھ سکے۔ میری نازک اور رحمتوں والی بچیاں بھی اب خون میں نہا رہی ہیں۔ یہ بہت کڑا اور امتحان کا وقت ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔ (آمین!)

☐ سلیم احمد۔ حیدر آباد۔

○ بابا جی! السلامُ علیکم! ماہنامہ "سچی کہانیاں" میں آپ کا کالم پڑھا' جس طرح آپ دُکھی انسانوں کی خدمت کرتے ہیں' اللہ آپ کو اس کا اَجر دے۔ (آمین!) بابا جی! میں چھوٹا سا کاروبار کرتا ہوں۔ مجھے مسلسل نقصان ہو رہا ہے۔ میری روزی میں رکاوٹ ہے یا کسی نے بندش کروائی ہے؟ آپ استخارہ کر کے بتائیں اور جو بھی وظیفہ دیں' اس کے پڑھنے کی تعداد کم ہو جو میں آسانی کے ساتھ پڑھ سکوں۔ اس سلسلے میں اگر تعویذ کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا دیں کہ تعویذ کس طرح منگواؤں؟ بابا جی! وظیفہ زیادہ بڑا نہ ہو' اتنا ہو کہ میں آسانی کے ساتھ پڑھ سکوں۔ میری روزی کے دروازے چاروں طرف سے کھل جائیں تاکہ میں اپنے والدین کو حج پر بھیج سکوں۔ (آمین!)

☆ بیٹے سلیم! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے! تعویذ منگوانے کے لیے تفصیل درکار ہوتی ہے۔ تم مجھے اپنا مکمل نام مع والدہ اِرسال کرو۔ جوابی لفافے پر واضح پتا لکھو تاکہ تمہیں تفصیل اِرسال کی جاسکے۔

☐ صائمہ۔ کراچی۔

○ السلام علیکم! بابا جی! اِس سے پہلے بھی میں نے خط لکھے اور آپ نے میرے مسائل کو حل کیا۔ بابا جی! میری عمر 40 سال ہے' اچانک میرے منہ پر داڑھی اور مونچھوں والی جگہ بال نکل رہے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے بال مستقل ختم کرنے کا نسخہ بتائیں تاکہ میں اس پر عمل کروں۔

☆ بیٹی صائمہ! تمہارا مسئلہ شدید نوعیت کا نہیں۔ کسی اچھے پارلر سے رابطہ کرو۔ اِس مسئلے کے لیے خواتین گرم ویکس استعمال کرتی ہیں مگر تجربے کار خاتون سے ہی رجوع کرو۔

☐ ناہید خان۔ گجرات۔

○ بابا جی! السلامُ علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی! میری عمر 18 سال ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کو چاہتی ہوں' وہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی اور کو چاہتا ہے اور میں اس کی چاہت میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ اس لڑکے پہ اس کی چاچی نے کافی جادو تعویذ وغیرہ کیے ہیں اور وہ اسی کی باتوں پر عمل کرتا ہے۔ بابا جی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو میں چاہوں تو میری شادی اس کے ساتھ ہو جائے۔ میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتی رہوں گی۔

☆ بیٹی ناہید ......! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بہ کثرت پہلے کلمے کا وِرد کرو۔

☐ سلمٰی۔ لاہور۔

○ محترم بابا جی! اَلسلامُ علیکم! میرا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ میری شادی کو 12 سال ہو گئے ہیں اور میں اولاد کی نعمت سے اَب تک محروم ہوں۔ ہم میاں بیوی تمام ٹیسٹ کروا چکے ہیں۔ میں اپنی جگہ ٹھیک ہوں' خرابی میرے شوہر میں ہے۔ انہوں نے کافی علاج کرایا لیکن بات نہیں بنی۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں' میں اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی ہوں اور اُن کو الزام نہیں دیتی' بس صبر کرتی ہوں۔ میرے شوہر بھی اِس بات پر بہت پریشان ہیں۔ اتنی ٹینشن ہے کہ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر جیسے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ میں اُن کی وجہ سے بھی بہت پریشان ہوں۔ آپ کے بارے میں پڑھ چکی ہوں کہ آپ خلقِ خدا کی خدمت کرتے ہیں' سو اپنا مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی اچھا سا وظیفہ اِرسال کر دیں۔ زندگی بھر دُعاؤں میں یاد رکھوں گی۔ میرے اور میرے شوہر کے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازے۔ (آمین!)

☆ بیٹی سلمٰی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ جو شخص اللہ کو راضی کر لیتا ہے' وہ کامیاب رہتا ہے۔ بیٹی! اولاد کے لیے تعویذ دیتا ہوں' تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو' میں تفصیل اِرسال کر دوں گا۔

☐ ایمن۔ کراچی۔

☆ بیٹی ایمن! تم نے جو اپنی کیفیت لکھی ہے' وہ معدے کی خرابی کی وجہ سے ہے۔ پانی بہت پیا کرو۔ کچی سبزیاں اور پھل بہ کثرت استعمال کرو۔ بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھ کر پانی پر دَم کر دیا کرو اور یہ پانی دن بھر استعمال کرو۔ استخارہ کاشف والدہ ثریا کے حق میں ہے۔

☐ صفیہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی صفیہ! اللہ تمہاری والدہ کو اولاد کا سُکھ نصیب کرے۔ بیٹی! تمہیں براہِ راست بھی خط لکھا ہے مگر تم خط پر پتا نامکمل لکھتی ہو۔ شہر کا نام نہیں ہو گا تو خط کیسے پہنچے گا؟ بہرحال بیٹی! سورۃ اَحزاب فجر کے بعد پڑھو اور بعد عشاء پڑھو' انشاء اللہ' ضرور کرم ہو گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☐ امبر۔ کراچی۔

☆ بیٹی امبر! آیت الکرسی پڑھتی رہو۔ اول و آخر دُرود شریف 3 - 3 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 روز ہے۔

☐ سائرہ۔ نواب شاہ۔

☆ بیٹی سائرہ! تمہارے حالات جان کر بہت دُکھ ہوا۔ ہمت اور صبر سے حالات کا مقابلہ کرو۔ تمہیں اَب اپنی اولاد کی خاطر ڈٹ کر کھڑا رہنا ہے۔ سب سے پہلے نماز کی پابندی رکھو اور جس قدر ممکن ہو' یَااللّٰہ یَارحمٰن کا وِرد کیا کرو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو۔ بہ روزِ جمعہ بعد نمازِ ظہر ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ مدت 41 روز ہے۔

☐ گلناز۔ لاہور۔

☆ بیٹی گلناز! اللہ تمہیں بے شمار خوشیاں دکھائے۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو اور بہ کثرت یَامجیبُ کا وِرد کیا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ مدثر پڑھو اور حاجات ایک ایک کر کے بیان کرو۔ یہی وظیفہ بعد نمازِ عشاء کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

☐ الماس۔ حیدر آباد۔

☆ بیٹی الماس! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ بیٹی! نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ دن میں کم از کم 5 بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دَم کر لیا کرو یعنی ہر نماز کے بعد ضرور آیت الکرسی پڑھو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

☐ رضیہ۔ ٹنڈو آدم۔

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے کا تعویذ تم احتیاط سے رکھو' وِرد جاری رکھو۔ بیٹے سے کوئی بات باہر جانے کے بارے میں مت کرو۔ بیٹے تیمور کا تعویذ تلف کر دو کیونکہ وہ ضعیف ہو چکا ہے۔ صدقہ خیرات خوب کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

☐ عذرا۔ پنڈی۔

☆ بیٹی عذرا! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! تمہارے گھریلو حالات جان کر بہت دُکھ ہوا۔

میری دُعا ہے کہ اللہ سب کو اپنی ذمے داریاں بخیر وخوبی پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دُرود شریف خوب پڑھو پھر حاجت بیان کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ سیما۔ کوہاٹ۔

o باباجی! میں آپ کی بہت بدنصیب بیٹی ہوں۔ 32 سال کی زندگی میں اتنے دکھ دیکھے ہیں کہ اَب زندگی سے خوف آنے لگا ہے۔ اللہ نے مجھے 4 بچے دیئے ہیں۔ مجھے اپنی اولاد سے بہت محبت ہے مگر باباجی! مالی حالات اتنے خراب ہیں کہ میں اور بچے اکثر بھوکے ہی رہتے ہیں۔ شوہر میرا سال بھر پہلے حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ اس کی زندگی میں تو روکھی سوکھی مل ہی جاتی تھی مگر اَب تو حالات بہت خراب ہیں۔ میں اَن پڑھ عورت ہوں' رشتے دار بھی میرے جیسے ہی غریب ہیں۔ چار بچے کون پال سکتا ہے؟ باباجی! میری ماں کہتی تھی' اللہ کی دنیا بہت بڑی ہے اور یہ اچھے لوگوں کی وجہ سے ہی چل رہی ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ سب اچھے لوگ میری ماں کے ساتھ ہی مر گئے۔ اب صرف برے لوگ ہی زندہ ہیں کیونکہ میں جس کے پاس بھی گئی مدد مانگنے' سب نے منع کر دیا۔ میں یہ خط کسی سے لکھوا رہی ہوں۔ اللہ کرے' آپ کو میری بات سمجھ آ جائے۔ مجھے کوئی ایسی دُعا بتائیں جس کے پڑھنے سے اللہ مجھ سے راضی ہو جائے اور میرے بچے بھی سب کے بچوں کی طرح پیٹ بھر کر روٹی کھا سکیں۔

☆ بیٹی سیما! اللہ تمہاری مشکلات دور فرمائے۔ بیٹی! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اللہ تم سے راضی نہیں؟ اللہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ بیوہ اور یتیم کا خیال یقیناً وہی لوگ رکھتے ہیں جو جنت میں گھر بنانا چاہتے ہیں۔ یقین رکھو' دنیا میں بہت اچھے لوگ موجود ہیں' اِسی لیے یہ دنیا قائم بھی ہے۔ مایوس مت ہو' کڑا وقت سدا نہیں رہتا۔ صبر اور مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 33-33 بار اَلحمد شریف پڑھو اور دُعا کرو۔ میں تمہارے لیے خصوصی دُعا کا اہتمام کروا رہا ہوں۔ اپنا مکمل پتا مجھے اِرسال کرو۔

□ عاصم۔ کوئٹہ۔

o باباجی! میں ایف۔ اے میں پڑھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ بہت تعلیم حاصل کروں مگر جو بھی پڑھتا ہوں' بھول جاتا ہوں۔ ٹیچر کے سوال کا جواب بھی نہیں دے پاتا حالانکہ جواب آتا ہے۔ بہت جلدی گھبرا جاتا ہوں اور پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں۔ لڑکے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ باباجی! اگر یہی حالات رہے تو میں کیسے پڑھ سکوں گا؟ شاید میرا مسئلہ آپ کو بہت اہم نہ لگے مگر میرے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ خدا کے لیے' میری مدد کریں۔

☆ بیٹے عاصم......! میں جانتا ہوں کہ تمہارا مسئلہ بہت اہم ہے کیونکہ اِس پر تمہارے مستقبل کا دارومدار ہے۔ تم سب سے پہلے تو اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ اگر دن میں 4 گھنٹے پڑھتے ہو تو اَب 8 گھنٹے پڑھو یعنی دوگنا وقت دو۔ نماز پابندی کے ساتھ اَدا کیا کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیو۔ نہار منہ 4-3 بادام اچھی طرح چبا کر کھا لیا کرو۔

نَصرٌ مِنَ اللّٰہِ فَتحٌ قَرِیب کا بہت وِرد کیا کرو۔

□ گڑیا۔ کراچی۔

☆ بیٹی گڑیا! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ خصوصاً نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 101-101 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ نعیمہ۔ صادق آباد۔

☆ بیٹی نعیمہ! نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دَم کرو۔ والدہ سے کہو' خوب صدقہ خیرات کیا کریں۔ تم اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ بھی بنا استخارہ کیے مت کرنا۔ خواب پریشان کن ہیں۔ ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر رکھنا۔ سورۃ الناس بکثرت پڑھا کرو۔

□ عزیزہ جان۔ پشاور۔

☆ بیٹی عزیزہ! تمہارے دونوں خط مجھے ملے مگر پھٹے ہوئے۔ میں نے دونوں خطوط کے جواب بھی دیئے مگر مجھے محسوس ہوا کہ تمہارا پتا بھی مکمل تحریر نہیں ہوتا۔ آئندہ خط لکھو تو مکمل پتا ضرور لکھا کرو۔ شہر کا نام واضح لکھو۔ مکان نمبر اور گلی نمبر بھی صاف لکھا کرو۔

□ ثناء۔ گدو۔

☆ بیٹی ثناء! جو حالات تم نے تحریر کیے ہیں' وہ بدترین ہونے والے ہیں لہٰذا جتنی جلد ممکن ہو' مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تعویذ کے لیے جوابی لفافہ ضرور اِرسال کرو۔

□ عارفین۔ کوٹ لکھپت۔

o باباجان! میری بیوی نے آپ سے میری نوکری کے لیے تعویذ لیا تھا۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ 3 سال بعد مجھے اپنی پسندیدہ جگہ پر نوکری مل گئی۔ فی الحال تنخواہ کم ہے مگر میں مطمئن ہوں۔ یہاں ترقی کے بہت مواقع ہیں۔ باباجان! میرا ایک اور مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ میری کچھ زمین اِدھر ڈیرہ میں ہے جو میں بیچنا چاہتا ہوں مگر مناسب قیمت نہیں لگتی۔ کوئی وظیفہ عنایت کیجیے جس کی برکت سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ میرے رشتے کے چچا یہ زمین مارکیٹ ویلیو سے کچھ کم پر خریدنا چاہتے ہیں مگر وہ یہ رقم دو اقساط میں ادا کریں گے۔ اب آپ مشورہ دیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سودے بازی کا ہمارے آپس کے تعلقات پر برا اثر پڑے۔ آپ کے جواب کا منتظر۔

☆ بیٹے عارفین! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں ہمیشہ یہ بات سمجھاتا ہوں کہ جو لوگ اللہ سے پورے یقین کے ساتھ مدد مانگتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا شکر اَدا کرو کہ اس نے تم پر اپنا کرم فرمایا۔ نماز پابندی سے اَدا کیا کرو۔ دُرود شریف پڑھ کر حاجت بیان کرو۔ یہی عمل بعد نمازِ عشاء بھی کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بس خیال رہے' حاجت پوری ہوتے ہی حسبِ استطاعت رقم اللہ کی راہ میں دو گے۔

□ ثمرین۔ سمرسٹہ۔

☆ بیٹی ثمرین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ رات کو ایک گلاس گرم دُودھ اور چوتھائی چمچہ گڑ کھا لیا کرو۔ یہ عمل ہر ماہ 7 دن کرو پھر ترک کر دو۔ بکثرت یَاشافِیُ کا وِرد کیا کرو۔ اللہ مکمل شفا عطا فرمائے گا۔

□ عارفہ۔ گجرات۔

☆ بیٹی عارفہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ کچھ معاملات بڑوں کے طے کرنے کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چاہتے ہوئے بھی اُس میں نہیں بول سکتے۔ تم اللہ سے اچھے حالات کی دُعا کرتی رہو' وہ ضرور سنے گا۔ والدہ سے کہو' اپنے تمام بچوں پر چاروں قُل اور الحمد شریف پڑھ کر ضرور دَم کیا کریں۔ اپنی بھاوج سے کہو' بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ انعام ضرور پڑھیں۔ مدت 41 دن ہے۔

□ علینہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی علینہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ امتحان شروع ہونے سے قبل خط لکھا

کرو تا کہ وظیفہ کرنے کا ٹائم بھی ہو۔ بہر حال یَا رحیمُ کا بہت ورد کیا کرو۔ آرٹس کے مضمون تمہارے لیے بہتر ہیں۔ اپنی توجہ دوسری چیزوں سے ہٹا کر صرف پڑھائی پر مبذول رکھو' کامیابی ہوگی' انشاءاللہ!

□ نبیلہ۔لاہور۔

٥ پیارے بابا جی! السلام علیکم! سلام کے بعد عرض یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی آپ سے کئی بار رابطہ کیا مگر پتا نہیں' کیوں آپ جواب نہیں دیتے؟ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر میں ایک عجیب سی تکلیف ہے۔ میرا تمام سر کسی عجیب سی قوت میں جکڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف میرا دماغ جکڑا ہوا ہے بلکہ سننے اور سمجھنے کی قوت بھی کم ہے۔ اس بیماری کا بہت علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا تو کسی عالم سے استخارہ کروایا تو اس نے بتایا کہ میں جب بالکل چھوٹی تھی تو ایک دن میرے اوپر سے جن اور پریوں کا گزر ہوا تھا اور اس وقت ایک پری کے پروں کی مٹی ٹائپ کوئی چیز میرے سر پہ آ گری تھی جس کی وجہ سے یہ تکلیف ہوئی ہے۔ بابا جی! بات کچھ بھی ہو' پر میرے ساتھ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں' یہاں تک میں کیسے پہنچی' یہ تو مجھے ہی پتا ہے۔ میں بہت پڑھنا چاہتی ہوں لیکن اس تکلیف نے میرا سارا کیریئر ہی تباہ کر دیا ہے۔ میں دو سالوں سے مسلسل دُرود شریف پڑھتی آ رہی ہوں۔ اس سے بس اتنا افاقہ ہوا ہے کہ میری نظر کی کمزوری کچھ دور ہوئی ہے اور کچھ سمجھنے میں بھی افاقہ ہوا ہے لیکن اب تو دن بہ دن پڑھائی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اگر کلاس میں دُرود شریف کی طرف دھیان دیتی ہوں تو لیکچر سمجھ میں نہیں آتا اور اگر دُرود شریف چھوڑ دیتی ہوں تو تکلیف ویسی کی ویسی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو میرا دل کرتا ہے' خودکشی کر لوں لیکن اللہ تعالیٰ پہ یقین کر کے آگے بڑھتی ہوں کہ شاید کسی دن وہ مجھ پہ رحم کرے اور مجھے اس عجیب و غریب بیماری سے چھٹکارہ حاصل ہو جائے۔ بابا جی! خدا کے لیے' مجھے اس تکلیف سے چھٹکارہ دلائیں۔ میں دن رات روتی رہتی ہوں۔ میں اپنی تعلیم میں بہت آگے جانا چاہتی ہوں۔ بابا جی! اپریل میں میرے امتحان ہیں اور میں سخت پریشان ہوں۔ آپ جو کہیں' میں کرنے کو تیار ہوں۔ میرے لیے اجتماعی دُعا کریں۔ میں کسی بھی مشکل وظیفے یا تعویذ تجویز کے لیے تیار ہوں۔ خدا کے لیے' میرے لیے کوئی راستہ نکالیں۔

☆ بیٹی نبیلہ! تمہیں میں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تعویذ کے لیے مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ کرن۔حیدر آباد۔

☆ بیٹی کرن! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! تم نمازِ عشاء کے بعد 7 تسبیح پڑھو۔ یَاحَیُّ یَا قَیُّومُ بِرَحمَتِکَ اَستَغِیثُ اول و آخر دُرود شریف پھر دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ محمد عدنان۔مقام نامعلوم۔

السلامُ علیکم! میرے سر میں زخم اور خشکی کے کھرنڈ بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے گندہ پانی بھی رِستا ہے۔ آپ جو دوائی اور تیل دَم کر کے دیتے ہیں' اس کے بھیجنے کا طریقہ اور ہدیہ بھی بتا دیں۔ کوئی وظیفہ ساتھ نہ دیجیے گا کیونکہ اس کے لیے پورے یقین اور اعتقاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ بیٹے عدنان......! تم skin کے ڈاکٹر سے رجوع کرو۔ پیپ کا زخم میں پڑنا مناسب نہیں۔



عصر حاضر کے جدید لب ولہجہ کے خوبصورت شاعر شہزاد نیر کے مجموعہ کلام ''برفاب'' پر ایک تجزیاتی نوٹ

عکاشہ سحر

شہزاد نیر کا شمار ہمارے عہد کے سنجیدہ شاعروں میں ہوتا ہے.....غزل، نظم، نثر، گیت، تنقید......انہوں نے تمام اصناف سخن میں نمایاں کام کیا ہے۔ پاکستان میں جدید غزل اور نظم کی تاریخ اُن کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ ''برفاب'' شہزاد نیر کا نظمیہ شاعری پر مشتمل مجموعہ کلام ہے۔ جسے سانجھ پبلی کیشن لاہور نے شائع کیا ہے۔

PEN ایوارڈ یافتہ اس مجموعہ کلام کا مطالعہ مجھے اساطیری فضا میں لے گیا ہے۔ جہاں برف کا کفن اوڑھے کتنی سانسیں منجمد ہیں۔ ''برفاب'' میں شامل شہزاد نیر کی نظم کے دو پہلو بہت اہم اور نمایاں ہیں۔ اول جنگ، دوم، حقیقی زندگی کا تلخ منظر نامہ ''برفاب'' میں ''واراسٹیٹمنٹ'' بہت نمایاں ہے۔ معاصر اور قدیم معانی میں توازن رکھ کر امیجز کو استعاراتی وسعت کے ساتھ نظم میں ڈھالنا اور اُن کو ایک اچھوتے انداز میں ڈھالنا شہزاد نیر کا کمال ہے۔ ''برفاب'' کی نظموں میں اُن کا رجحان خارجیت کی طرف ہے۔ وہ ذات سے نکل کر پورے معاشرے میں منقلب ہوتے نظر آتے ہیں۔

''برفاب'' کی نظموں میں داخلی علامتوں کا استعمال، لب ولہجہ کی شدت، تمثالوں کا سر یلسٹک استعمال اور اپنے عہد کی صورت حال کا ادراک ملتا ہے۔ اِن نظموں میں اضطراب اور شدت بنیادی لہجے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ''برفاب'' کی نظمیں اپنے اندر انفرادیت سمیٹے ہوئے ہیں۔ ہر نظم ایک الگ رنگ اور مزاج میں ہے۔ گویائی کے وفور لہجے کے تیقن کو ہر نظم میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ''برفاب'' کی تمام نظمیں بلند آہنگ سے سجی ہوئی ہیں۔ اعترافیہ کی چند لائنیں ملاحظہ ہوں۔

ہمارا دیکھنا کیا ہے
نظر ٹکنے نہیں پاتی
کہ ہر منظر بدلتا ہے
اگر منظر ٹھہر جائے تو آنکھیں وہ نہیں رہتیں
نگاہیں ریت ہیں
آنکھوں کی مٹھی سے پھسلتی ہیں
ہمیں دیکھو
قدیمی فلسفوں کے دشت میں خود سے بچھڑ کر
واہموں میں ڈھونڈتے
ہر دم بھٹکتے ہیں
دماغ اک میز پر رکھا ہے
آنکھیں فائلوں کے ڈھیر میں گم ہیں
جہاں......پوروں میں کٹتے ہیں
مگر ہم بٹ رہے ہیں

☆......☆

عہدِ جدید کی مصروف ترین زندگی کا نوحہ...... کشمکش نا آسودگی......بے وقتی......ماضی سے محرومی، فنی محاسن، جدید اسلوب اور زبان کے اسٹرکچر میں تبدیلی ''اعترافیہ'' میں منکشف ہوتی نظر آتی ہے۔ خوب صورت اور جدید علامتیں جہاں ہمارے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتی ہیں وہاں عصری حالات اور اُن میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تغیرات کی بھی مصوری کرتی ہیں۔

کہیں جانا نہیں پھر بھی بہت لمبی مسافت ہے
مناظر دور تک ہیں اور مجھے چلنا نہیں آتا

قلم ہے اُنگلیوں میں اور مجھے لکھنا نہیں آتا!
اور اَب نظم کے اختتام کی چند لائنیں
گردش میں ٹوٹے خواب ہیں
خوابوں کی بکھری کرچیاں ہیں
کرچیوں کی تیز دھاروں پر
مجھے لکھنا نہیں آتا!
دُعائے استقامت ہو
میں لفظوں کی لگن لے کر چلا ہوں
اور زمانے میں چلن تو ہندسوں کا ہے

☆......☆

ہمارے ہاں شاعری کی اکثر بحثیں شاعری کی مختلف اصناف کو مخصوص موضوعات اور عموماً مروجہ مخصوص لفظیات کے پس منظر میں دیکھنے سے پیدا ہوئی ہیں اور پھر ایسا بھی ہوا کہ جن لکھنے والوں نے ایک صنف کے لیے طے شدہ موضوعات اور دوسرے لوازم کی جتنی کڑی پابندی کی' اُن کو اس صنف کا اتنا ہی بڑا EXPONENT مانا گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ اُردو نظم کو اُردو غزل سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا غزل کے تمام موضوعات نظم کے لیے غیر موزوں قرار پائے اور یہ رویہ بڑی حد تک آج بھی برقرار ہے۔ حالانکہ جدید اردو شاعری اور جدید نظم کی بحث ایک ہی ہے۔ ان بحثوں کے باوجود آج کی شاعری میں موضوعات کے اعتبار سے غزل اور نظم کا فرق تقریباً مٹا ہوا نظر آتا ہے۔

اردو شاعری ادب کی دوسری اصناف اور تمام فنون پر تبدیلی کے گہرے اثرات اس وقت مرتب ہوئے جب دوسری تہذیبوں خصوصاً مغرب کے علوم وفنون سے ہماری آشنائی ہوئی۔ غیر ملکی ادب کے ترجمے اور بعد ازاں اصل کی صورت میں جب ہمارے تخلیق کاروں تک پہنچے تو تخلیق کا کینوس یکسر بدل گیا اور یہ بات بھی بہت واضح ہے کہ ایسا ہونے سے پہلے ہماری شاعری کی روایت میں غزل کی حیثیت بنیادی تھی۔ فارسی غزل کے اتباع میں اردو غزل کے موضوعات بھی محدود اور طے شدہ تھے۔ جب ادب اور ساتھ ساتھ شاعری کا کینوس پھیلا تو عمومی طور پر محسوس کیا گیا کہ نئے موضوعات شاعری کی کسی اور صنف میں تو ادا کیے جاسکتے ہیں لیکن غزل میں ایسا ممکن نہیں۔ ایسے تمام نئے موضوعات نظم کے موضوعات بنا دیئے گئے جبکہ غزل اپنے روایتی موضوعات پر قائم رہی لیکن تخلیقی سطح پر یہ درجہ بندی لمبے عرصے کے لیے ممکن نہ تھی حالانکہ تنقیدی رویوں نے بہت دیر تک بلکہ آج تک یہی رویہ اپنائے رکھا کہ خارج کی شاعری نظم کا حصہ ہے اور غزل صرف بازناں گفتن تک محدود ہے۔ اسی تنقیدی رویے کی وجہ سے پہلے میراجی اور راشد کو باغی کہا گیا اور بعد میں مجید امجد، جو بیسویں صدی کا بڑا شاعر ہے کے تخلیقی شعور اور اُس کی شاعری کے دوررس اثرات کو نظر انداز کیا گیا جن لوگوں نے انگریزی، جرمن، فرنچ اور دوسرے ممالک کے ادب کا مطالعہ کیا ہے' اُن کو بخوبی اندازہ ہوگا کہ شیکسپیئر کی نظم ''مصرا'' سے لے کر جاپانی ہائیکو تک کسی بھی صنف کے لیے موضوعاتی اعتبار سے کبھی کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔ جان ڈن کی RHYMED نظموں اور ملارمے کی آزاد شاعری FREE VERSE دونوں میں ہر طرح کے موضوعات شاعرانہ طور پر تخلیق کیے گئے ہیں۔ جبکہ اُردو شاعری میں پہلی بار مجید امجد نے شاعری کے کینوس کو اتنا پھیلایا کہ داخلیت اور خارجیت کی بحث مکمل طور پر بے معنی ہو کر رہ گئی۔ جبکہ اب انسانی شعور وہاں پر ہے جہاں EXTERENAL PROPS سے بڑھ کر خالص شاعرانہ احساس کے ساتھ انفرادی، اجتماعی، معاشرتی، نفسیاتی اور کائناتی مسائل کا احاطہ کرتی ہوئی شاعری ہی درخور اعتناء ٹھہرتی ہے اور یہ وہ منظر نامہ ہے جس میں ایسی شاعری تخلیق ہو رہی ہے اور شہزاد نیر اس منظر نامے کا ایک معتبر نام ہیں۔

نئے موضوعات، زبان اور لفظیات کا خوب صورت استعمال اگرچہ کہیں کہیں مروجہ رویوں اور ٹریٹمنٹ پر کچھ اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن بنیادی شعری حسیت شہزاد نیر کے ہاں آ کر تبدیل ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہیت، شعریات، لفظیات اور

برتاؤ کا ایک جہان تازہ آشکار ہوتا ہے۔ اعترافیہ کی مزید چند لائنیں ملاحظہ ہوں۔

یہاں ہر نقش عمر یک نفس تک ہے
لپکتی آنکھ کے چھونے سے پہلے
کس جگہ روپوش ہوتا ہے
نگہ کو فرصتیں کب ہیں!
حقیقت اس قدر ہے
درحقیقت کچھ نہیں
باقی فسانہ ہے
فسانہ جو کسی دل پر
مجھے لکھنا نہیں آتا!

چار صفحات پر مشتمل یہ اعترافیہ ہمارے عہد کی زندگی کا بھرپور احاطہ کیے ہوئے ہے

بخیہ گری کے شوق میں مجھ سے بڑی خطا ہوئی
چاک جنوں کے ساتھ ہی چاک خرد بھی سل گیا

☆......☆

''برفاب'' کی نظموں میں تمام کیفیات کا رچاؤ شامل ہے۔ جذب واثر سے معمور یہ نظمیں جمالیاتی اور فکری تاثرات سے مالا مال ہیں۔ جدت خیال اور جدت اظہار سے بھرپور...... شہزاد نیر کے انداز بیان میں جزیات نگاری، محاکات اور علامتوں سے جو کام لیا گیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

''برفاب'' میں شامل نظموں کی تخلیق جدید سائنسی علوم، فلسفیانہ فکر اور معاشرتی آگہی کے پس منظر میں ہوئی ہے۔ زبان وخیال کی شناخت کے ساتھ ساتھ ایک بھرپور ڈکشن سامنے آتی ہے جو ہمیں زبان کے ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلیوں سے آشنا کرتی ہے۔ پرانے لفظوں کے نئے سیاق وسباق، ترکیبوں کی بے شمار جہتیں!!

شہزاد نیر کی شاعری میں ذاتی تجربہ واردات نظم میں کمال کے ساتھ تخلیق ہوتا ہے اگر دوسری ثقافتوں میں شاعری کی مختلف اصناف کے ارتقاء کو دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اصناف بدلتی رہتی ہیں، اِس تبدیلی کے پیچھے معاشرتی قدروں اور انسانی شعور کا ارتقاء کارفرما ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مغربی معاشروں میں تفریح کا بہت بڑا ذریعہ قصہ گوئی اور اساطیری شاعری ہوا کرتی تھی۔ اُس زمانے میں جب بیانیے سے بھرپور کتابوں پر محیط BALLADS اور نظمیں لکھی گئیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ سولھویں صدی میں تھیٹر کا دور دورہ تھا تو اُس زمانے کی اہم ترین شاعری ہمیں ڈراموں میں ملتی ہے۔ اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی تک RHYMED VERSE، کی مختلف شکلوں (جس میں سانیٹ بھی شامل ہے) میں اکثر شاعری ہوئی۔ اسی عرصے میں شعری فن پاروں کے حجم میں بتدریج کمی ہوتی گئی پھر بات آزاد شاعری تک پہنچی اور پھر نسبتاً مختصر کلام تخلیق ہونے لگا۔ حتیٰ کہ 1930ء کے لگ بھگ کہہ دیا گیا کہ ''دی لونگ پوئم از ڈیڈ'' (طویل نظم کی موت واقع ہو چکی ہے) اسی قسم کی تبدیلیاں نہ صرف دوسری اصناف سخن بلکہ دوسرے علوم میں بھی واقع ہو رہی تھیں جو انسان ایک زمانے میں تاریخ اور دیومالائی VERIFICATION کو شاعری مانتا تھا۔ وہ وقت کے ساتھ تقاضا کرنے لگا کہ اس کے معاشرتی اور نفسیاتی مسائل بھی شاعری کا حصہ بنیں۔ پہلے جہاں اس کی شعری حسیات کی تشفی خارجی مظاہر یعنی قافیہ بندی، بیانیے کے لیے استعمال کی جانے والی تمثیل اور صوتی تلازموں وغیرہ سے ہو جاتی تھی، اب صرف ان چیزوں سے ممکن نہ رہا اب انسانی ذہن بہت آگے ہے۔ ''برفاب'' کی نظموں میں شہزاد نیر نے اپنے تخلیقی تجربے میں اضافہ کر کے زندگی کے تازہ تجربات کا ایک نیا منظر نامہ پیش کیا ہے ''اگر یہ سچ ہے'' کی چند لائنیں

اسیر ساعت یہ پوچھتا ہے
کہ وقت کی قید کب تلک ہے
زماں کو یہ اختیار کیوں ہو
کوئی بھی لمحہ
کسی کی بے وقت زندگی کو
گھڑی کی رسی سے باندھ ڈالے

اور اک میرا دست وقت میں دے کے
دوسرا بخت کو تھما دے
دم اسیری تبیل کیا ہو
کہ اب مکاں بھی
زماں کی پھیلی گرفت میں ہے

☆......☆

''برفاب'' کی نظموں میں شہزاد نیر کا تخلیقی سبھاؤ اور بہاؤ بہت انفرادیت اور خوب صورتی لیے ہوئے ہے۔ انہوں نے نئی نظم کی بوطیقا میں مختلف پہلوؤں کی فارمولیشن کی ہے اور وہ جدید نظم کے منظر نامے پر ایک نظریہ ساز کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ شہزاد نیر کی نظموں میں اپنی ذات سے اوپر اُٹھ کر نظارگی موجودات کا حوصلہ عرفان ذات سے وابستہ نظر آتا ہے۔

''چاہے جانے کی آرزو''
وہاں نادیدہ منظر کی بہت ویران آنکھیں تھیں
ڈھلانی پھول کھلتے تھے
مگر حیرت کی بارش کو ترستے سوکھ جاتے تھے
ہوا کا لمس، بادل کی نگہ کافی نہیں ہوتی!
(یہ سارے منظر کسی کی اک نظر کے منتظر ہیں)
کبھی چڑیوں کی بوندیں گر پڑیں
تو منظروں کی سوکھتی آنکھوں نے
رنگوں کا ذخیرہ کر لیا
چشم تماشا کون لائے گا
(کیا خوب صورت اور بھرپور لائن ہے)
کسی کی آنکھ میں آئے بنا ہوتے چلے جانا
بڑی بھاری اذیت ہے
(دیکھیے اس نظم کا کینوس کس قدر وسیع ہے)
ہائبرنیشن
میں صدیوں سے تنہا
گھٹن میں گندھے حبس تاریک میں
سانس روکے پڑا ہوں
بدن کے غلیظ اور سیلن زدہ بل میں
بے حس وحرکت
نم آلود مٹی میں لتھڑا ہوا ہوں
نہ جانے میں زندہ ہوں
اک تنگ وتاریک مسکن میں ساکن
مرے سرد سینے میں آدھا نفس
نہ پتلی میں حرکت
نہ آنکھیں ہی روشن
بدن کے اسی غار میں نیم مردہ
مری ذات ہے
لمبے عرصے کی قیدی!

جب ہم ''برفاب'' کی نظموں کی فارم اور بُنت کی طرف آتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ تقریباً ہر ایک کی ایک الگ DISTINCT ہیت ہے جو اس فن پارے کے مجموعی تاثر کا جزولاینفک ہے۔ شہزاد نیر کے ہاں کسی بھی مضمون کا شاعرانہ اور جمالیاتی تاثر استعاروں یا تلمیحات کو EXTERNAL PROPS کے طور پر استعمال کرنے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ اور دوسرے محاسن نظم کی بنت کا بنیادی حصہ بنتے ہیں۔ یہی حال آہنگ کا ہے

''ہم فراموش ہیں''
زندگی یاد کر!
ہم وہی ہیں
تری مرمریں پوروں سے
جو کھنکتی ہوئی خاک کی لوح پر
ایسی کچی سیاہی سے لکھے گئے
آپ مٹتے گئے
زندگی یاد کر
ہم وہ بے پیرہن
جن کے کورے بدن سے
اشارے سے ملبوس چھینے گئے
ننگے پیروں جنہیں حکم ہجرت ہوا
اشک توشہ ہوئے
درد ورثہ ہوا
سانس پائی تھی صرف ندامت ہوئی
رینگنے کی سزا زیب قامت ہوئی

ہاتھ باندھے گئے
دائمی ہجرتیں زیب پا کی گئیں
دشت خواہش میں بے راہ چھوڑا گیا
ہم جوتن کی تپش میں سلگتے رہے

"برفاب" میں شامل شہزاد نیر کی نظموں کا خمیر تاریخ کی زندہ روایتوں اور اٹل حقیقتوں سے اُٹھا ہے۔ سماج کی بھرپور عکاسی کرتی یہ نظمیں جدید فلسفہ حیات اور جدت طرازی سے مزین ہیں۔

"ہم اپنی ذات کے عاشق"
یہ مانا کچھ نہیں باقی
نگاہوں میں دل آرائی
نہ باتوں میں جبیں سائی
جو سانسیں باندھ رکھتی تھی!
جنون آبلہ پائی
یہ کیسا موڑ ہے
اُن منزلوں کا عکس بھی
اب پُتلیوں پر پھیل جاتا ہے
جنہیں ہم زندگی سمجھے

"برفاب" میں شامل شہزاد نیر کی نظمیں ان کی زندگی کے مختلف النوع تجربات سے گزرتے ہوئے ادوار کی ترجمانی کرتی ہیں۔ "برفاب" میں شامل ان کی طویل نظم "خاک" اُن کے نظمیہ ارتقاء کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ نظم نگاری میں اُن کے مقام کے تعین میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ شہزاد نیر کے تخیل میں خواب دیئے کی طرح جگمگاتے ہیں۔ ذرے سے صحرا تک کا سفر ان کی مسلسل فنی ریاضت کی دلیل ہے۔

"برفاب" میں شامل نظموں میں تیزی سے بدلتا ہوا منظر نامہ، بے مراد معاشرہ، تنہائی، بیگانگی، جبر، جنگ ایک نئے کرب کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ معاشرے میں فرد کے داخلی تضادات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ذات آشوب سے، شہر آشوب تک کا سفر جس اذیت میں شہزاد نیر نے کہا ہے وہ "برفاب" کی نظموں میں جابجا نظر آتا ہے۔

ایک اور بات شیئر کرتی چلوں کہ "برفاب" کی نظموں کی تفہیم میں عام قاری کو ذرا دقت محسوس ہوگی لیکن جو اہل قلم جدید نظم کی روانی اور بہاؤ میں رہنے اور بہنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ "برفاب" کا مطالعہ اُن کے لیے خاصا خوشگوار ہوگا۔ زندگی کی حقیقتوں کو عیاں کرتی یہ نظمیں کبھی ہمیں سیاچن اور کارگل کے محاذ پر لے جاتی ہیں۔ کبھی اساطیری ماحول میں اور کبھی عہد جدید میں اور رومانوی رنگ ان نظموں میں بہت کم نظر آتا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقتوں سے جڑی ہوئی نظمیں ہیں اور حقیقت بہرحال تلخ ہوتی ہے۔

"کبھی سورج بھی نکلے گا" مزدور طبقے کے مسائل کو اجاگر کرتی ایک نظم ہے۔ آخری چند لائنیں ملاحظہ ہوں۔ دُکھ درد کی کیسی کیفیت ہے۔

اُمیدیں اور سگریٹ ختم ہو جائیں
تو سب بے جان ہاتھوں سے
شکن اندر شکن لپٹی گزشتہ شام کھاتے ہیں
اور آنکھوں میں یہ دُکھ لے کر
گھروں کو لوٹ جاتے ہیں
کہ اُن کا کوئی بھی آقا
نوید بندگی لے کر نہیں آیا!

"سیاچن" اُفق کے پار جانے والے آنسو، کارگل، عذاب آنکھیں، پتھروں کے درمیان، رستہ سہل نہیں ہے......غزالہ......غائب......ٹھہری ہوئی ساعت، گریزاں......نشہ، دھرتی یکساں کانپ رہی تھی جس تن لاگے......سالگرہ کے دن دائرہ...... یہ سب نظمیں انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔ آخر میں ایک طویل نظم "خاک" ہے......اس نظم کا سفر کہیں اندر دل کے رستے سے طے ہوا ہے۔

جدید ادب کی اعلیٰ اور خوب صورت ترین نظم "خاک" اپنے اندر گہری رمزیت لیے ہوئے ہے۔ اس سے پہلے طویل نظموں میں ن م راشد کی حسنِ کوزہ گر اور ڈاکٹر وزیر آغا کی......آدھی صدی کے بعد اور "اک کتھا انوکھی" قابل ذکر ہیں۔ "آدھی صدی کے بعد" ڈاکٹر وزیر آغا کی منظوم آپ بیتی ہے جبکہ "اک کتھا انوکھی" منظوم جگ بیتی ہے جبکہ شہزاد نیر کی "خاک" کا موضوع یکسر جدا ہے۔ گرتی ہوئی برف، گہری کھائیاں، ٹنوں کے حساب سے پڑی ہوئی برف......صدیوں سے پڑے ہوئے چٹانوں کے ٹکڑے، سیلن زدہ خوراک کے ڈبے، فائرنگ، شیلنگ، برف کا کفن، پی ایم اے میں بار بار دہرایا جانے والا سبق......آخری آدمی، آخری گولی، برف کی قبر......انسانی آوازوں اور خوشبو سے محرومی......خاک میں لپٹا ہوا ملگجا جنگل۔ ایک بدلا ہوا سحر آثار منظر، ایک ایسی کہانی جس سے قرنوں کے رخ جھلس گئے۔ لامتناہی دشت ہجر تشنہ نگاہیں۔ حقیقت سراب، غم ہجراں، ہجر ملال آبلہ پائی، تنہائی اور برف درد برف، یہ ہے طویل نظم "خاک" کا موضوع جس کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔ "خاک" ایک مطالعہ کے عنوان سے "برفاب" کے آخری صفحات پر شاہد شیدائی صاحب کا ایک خوب صورت اور بھرپور مضمون شامل ہے۔ اُس کے چند اقتباسات دیکھئے۔

"نظم خاک میں جو کہانی بیان ہوئی ہے وہ مختصراً کچھ یوں ہے کہ ایک بلند و بالا برفاب پہاڑی علاقے میں جہاں دو قدیمی ممالک جنگیں لڑتے رہے۔ کچھ لوگوں کو صدیوں پرانی ایک انسانی لاش ملتی ہے جو برف میں لپٹی ہوئی ہے۔ شاعر نے ایک ماہر فنکار کی طرح اُس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ وہ ایک عسکری تھا جو جنگ کے زمانے میں اپنے ساتھیوں سے یوں جُدا ہو گیا تھا کہ اُس سمیت چار عسکری رسے کے سہارے ایک محاذ پر روانہ ہوئے۔ مرکزی کردار سب سے آگے تھا۔ موسم کی یلغار کے باعث پچھلے تینوں عسکریوں نے مناسب سمجھا کہ آگے چلنے والے ساتھی کی رسی کو کاٹ دیا جائے ورنہ وہ سب لقمہ اجل بن جائیں گے۔ چنانچہ رسی کے کٹ جانے سے یہ عسکری ایک گہری کھائی میں جا گرا۔ پھر کسی وقت اُس کے ساتھیوں نے نیچے ایک رسا لٹکایا اور اُسے آواز دے کر کہا کہ اُسے تھام لے۔ یہاں اجل کے فرشتے کی آواز سنائی دیتی ہے یہ رسا تو چھوٹا ہے جس تک اُس کے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے۔ برف بنا وہ عسکری ایک مُردہ انسان ہے اور دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود انہیں اپنی پوری داستان سُنا رہا ہے کہ اُس کے ساتھ کیا بیتی۔ وہ رسے تک رسائی حاصل نہ کر سکنے پر ساتھیوں کو اپنی وصیت بتاتا ہے کہ اُس کے گھر والوں کو اُس کا آخری سلام اور پیام پہنچا دیں۔

اُس کی ماں اور بہنیں اس کی آنکھوں میں بین کر رہی ہیں اور وہ جوف دریا پر بیٹھا زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے

موت......سردی
حرارت......حیات آفریں
اے اجل سُن ذرا
برف کے روپ میں چار جانب کھڑی
بے مروت اجل، سُن ذرا!
میں نے جی بھر کے بچوں کو دیکھا نہیں
گھر کو سینچا نہیں
عسکری زندگی
ہجر، مجبوریوں، دوریوں اور تنہائیوں کا
نفس در نفس پھیلتا سلسلہ
کرب آمیز ایام کے

"برفاب" پچھلے ایک سال سے زیر مطالعہ ہے۔ بہت دل چاہا اس پر کچھ لکھوں لیکن کبھی لفظ ساتھ نہیں دیتے تھے اور کبھی تخیل......اب اگر اس پر کچھ لکھا بھی ہے تو مطمئن نہیں ہوں کہ جیسا لکھا جانا چاہیے تھا ویسا لکھا نہیں۔ "قلم ہے انگلیوں میں اور مجھے لکھنا نہیں آتا" خدائے لم یزل "برفاب" کے خالق کے قلم کی روانی اور جولانی کو قائم و دائم رکھے، آمین!!

ملتا نہیں ہے گوہرِ نام و نشانِ خاک
مقدور بھر تو چھان چکا ہوں جہانِ خاک

......☆☆......

خیال آرائی — سچی کہانیاں کے قارئین اور لکھاریوں کی سوچ اور خیال کا عکس بصورت تحریر

جنات ایک حقیقت

صائمہ سحر

جس طرح اس جہان میں انسان موجود ہیں' اسی طرح جنات کا وجود بھی ایک حقیقت ہے۔ انسان مٹی سے بنایا گیا ہے جبکہ جنات آتش یعنی آگ سے بنائے گئے ہیں۔ بعض لوگ جنات کے وجود کا یقین نہیں کرتے' ان کے لیے قرآن کریم کی سورۃ جن سب سے بڑی دلیل ہے۔ جنات کی اپنی دنیا ہوتی ہے لیکن وہ انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ان کی عمر تین سال میں صرف ایک سال بڑھتی ہے۔ یہ ہزاروں سال تک اس دنیا میں رہتے ہیں۔ جنات انسان کے جسم پر نا صرف قبضہ کر سکتے ہیں بلکہ ان کے خون میں سرایت کر جاتے ہیں۔ ان میں مسلم بھی ہوتے ہیں اور غیر مسلم بھی جبکہ بعض بہت شریر ہوتے ہیں' شریر جنات' انسانوں کو تنگ کرتے ہیں اور ان کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ یہ اپنا انتقام لینا کبھی نہیں بھولتے۔ اگر انسانوں سے انجانے میں غلطی ہو جاتی ہے' اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ یہ روپ بدلنے میں قادر ہوتے ہیں۔

میں رشوت کہاں سے دوں؟

عبدالعزیز جی آ' چکوال

26 جنوری 2009ء کو میں نے نیا گھر تعمیر کیا تو گیس کنکشن کے حصول کے لیے سوئی گیس آفس چکوال میں درخواست جمع کرائی۔ طوالت کے ڈر سے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ آج تین سال آٹھ ماہ ہو چکے ہیں مگر مجھے گیس کنکشن نہیں دیا گیا حالانکہ گیس لائن میرے گھر کے پاس سے گزر رہی ہے۔ میرے بعد ایک شخص نے گھر تعمیر کیا جو تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ہمارے گھر سے مشرق کی طرف ہے۔ اسے پچھلے سال میرے گھر کو کراس کر کے (جو فرنٹ مین گلی کے کارنر پر ہے۔) گیس لائن دے کر اس کا میٹر لگا دیا گیا ہے اور مجھے نت نئے بہانوں سے ساڑھے تین سال سے ٹالا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں' گلی کا کراس پڑتا ہے پھر سننے میں آیا کہ آپ کا کیس اسلام آباد جائے گا۔ وہاں سے فزیبلٹی رپورٹ آئی تو آپ کو کنکشن دیں گے۔ دو سال تک یہ من گھڑت کہانی سنی۔ تیسرے سال ہمیں ڈیمانڈ نوٹس اشو کر کے فوراً واپس لے لیا گیا کہ کمپیوٹر نمبر لگنے آپ کا کیس لاہور بھیجا جائے گا۔ یہ پچھلے نومبر کی بات ہے' اب 2012ء کا بھی آدھا سے زائد سال گزر چکا ہے اور میں ہنوز گیس کنکشن سے محروم ہوں۔

سوچتا ہوں' کہاں جاؤں' کس سے فریاد کروں' کون سنتا ہے؟

حدیث پاک میں ارشاد ہے۔ ''رشوت دینے اور لینے والا دونوں جہنمی ہیں۔''

ان مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے' ان کے ضمیر مردہ کیوں ہو چکے ہیں؟ یہ سچ ہے' میں حرام نہیں کماتا' رشوت کہاں سے دوں جبکہ رشوت کے بغیر آج کل کوئی کام نہیں ہوتا۔

ماں اور ساس

سدرہ انور علی' جھنگ صدر

ماں کا خیال آتے ہی ذہن میں بے لوث محبت' چاہت اور شفقت کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ ماں محبت کا سرچشمہ ہوتی ہے' محبتیں بانٹتی' لٹاتی' اپنا تن من دھن نچھاور کرتی ہوئی ہر دکھ' درد اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے ماں رب کائنات کی ایک خوبصورت تخلیق ہے۔ جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ عورت کا ایک حسین روپ ماں ہے۔ کسی

بھی خطے کی عورت جب ماں بنتی ہے تو اس کے احساسات و جذبات یکساں ہوتے ہیں۔ ایک انگریز گوری بھی ماں' کالی حبشی بھی ماں' چینی اور جاپانی بھی ماں' عربی اور عجمی بھی ماں' غریب اور امیر بھی ماں' سب میں چھپی ممتا کی تڑپ ایک جیسی ہوتی ہے۔ ماں وہ ہستی ہے جسے اللہ رب العالمین کی رحمتوں سے رحمت کا ایک حصہ ملا ہے۔ ماں کی محبت اپنی اولاد کے لیے بے لوث ہوتی ہے۔ ہر انسان کی محبت میں کوئی نہ کوئی مفاد چھپا ہوتا ہے لیکن ماں کی محبت بے لوث اور خالص ہوتی ہے اسی لیے ماں کا مقام بہت اونچا ہے۔ ماں ریشم کی طرح نرم ہوتی ہے مگر اولاد کے معاملے میں فولاد کی طرح سخت ہو جاتی ہے لیکن نجانے کیوں' جب یہی ماں ساس بنتی ہے تو اس کے انداز و اطوار بدل جاتے ہیں؟ وہی ماں جو محبت اور چاہت کا پیکر ہوتی ہے' ساس بنتے ہی سراپا نفرت بن جاتی ہے۔ وہی گھر جو ماں کی محبتوں' شفقتوں اور قربانیوں سے جنت نظیر بن جاتا ہے' ساس کی ناچاقیوں اور لڑائیوں سے جہنم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ماں جب بولتی ہے تو لہجے میں ٹھنڈک اور چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ ساس بنتے ہی چہرے کے زاویے بدل جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک' لہجے میں بجلی کی کڑک' آواز میں بادلوں جیسی گرج ہے۔ ہر بات پر روک ٹوک' نکتہ چینی' طنز کے تیر اور بال کی کھال اتارنے میں ماہر ہو جاتی ہے۔ جب ماں تھی تو سراپا رحمت اور ٹھنڈی چھاؤں تھی' جب ساس بنی تو رحمت سے زحمت اور چھاؤں سے دھوپ میں بدل گئی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ساس کے روپ میں وہ اپنی بہو سے وہی محبت کیوں نہیں کرتی جو اولاد سے کرتی ہے؟ آخر کو بہو بھی تو بیٹی ہوتی ہے۔ ماں کو چاہیے کہ اپنی بہو کو بھی اپنی بیٹی سمجھے تاکہ اس کی بیٹی کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو۔ اُن تمام ماؤں کو میرا ایک پیغام ہے جو ساس بن چکی ہیں' خدارا' اپنی بہو کے ساتھ اچھا سلوک کریں' اسے ماں جیسی محبت دیں' وہی شفقت' وہی پیار دیں جو اپنی بیٹی کو دیتی ہیں تو پھر دیکھنا آپ کی اپنی بیٹی اپنے سسرال میں کتنی خوش اور سکھی رہے گی۔

اپنے دیس میں اجنبی

عائشہ خورشید انور

میرے وطن' تیری جنت میں آئیں گے اک دن اور وہ دن بھی آیا جب میرے بھاگ جاگے اور میں نے اپنی فیملی کے ساتھ وادیٔ کشمیر جنت نظیر میں قدم رکھ دیا مگر افسوس کہ اپنے دیس میں ہمارے ساتھ غیروں کا سا سلوک ہوا اور ہمیں بارڈر سے آگے جانے کی اجازت نہ مل سکی۔ آزاد کشمیر کے بارڈر پر کھڑے ہو کر ہم نے جموں کشمیر کو بڑی حسرت سے دیکھا' اس کے حسن کو آنکھوں میں بھرا اور دوبارہ یہاں آنے کی تمنا کر کے واپسی کی راہ لی۔ اپنے ہی ملک میں غیروں جیسے سلوک پہ دل بہت دکھا مگر اپنے حسین ملک کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور اللہ کی قدرت پر آنکھیں بھر آئیں۔ اتنا حسن بھرا ہے قدرت نے ہمارے دیس میں' اس کا یقین دیکھنے کے بعد آیا اور بے اختیار اس وقت میرے منہ سے یہ شعر نکلا۔

کوئی اور بھلا کہیں کیوں جائے؟
جب حسن سمایا ہو گھر میں

عورت کی آزادی

محمد شعیب وفا' بکن' کرم ایجنسی

عورت کی آزادی تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ عورت آج اکیسویں صدی میں خوش ہے کہ اسے حقوق مل رہے ہیں' وہ مردوں کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے ملازمت کر رہی ہے مگر اسے ادراک نہیں کہ مرد نے اسے

جانوروں کی طرح استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ وہ اپنے فطری فرائض سے دور ہوتی چلی جارہی ہے۔ مردوں کی تفریح کے لیے عورت کو سینما کے پردے پر آنا پڑا۔ مرد کی دلبستگی کا سامان مہیا کرنے اور ان کی ہوس پوری کرنے کے لیے عورت کو کلب اور ناچ گھروں میں تھرکنا پڑا' حد تو یہ ہے کہ مرد کی شہوت پرستی کی تسکین کے لیے عورت کو عریاں ہونا پڑا مگر عورت یہی سمجھ رہی ہے کہ مردوں کی غلامی سے اسے نجات مل گئی۔ دوسری طرف مرد بھی نہیں سوچتا کہ عورت کی اس نام نہاد آزادی سے معاشرہ کس نہج پر پہنچ رہا ہے' کتنی شریف زادیاں شوبز کی دنیا میں نمائش کی چیز بن گئی ہیں' کتنے شریفوں کی بہو بیٹیاں گھر سے نکل گئیں اور کتنی پاک دامن عورتوں کی عصمت رسوا ہو رہی ہے' کالج' یونیورسٹی میں مخلوط نظامِ تعلیم میں جو کچھ ہو رہا ہے' اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام نے عورت کی قدم قدم پر رہنمائی کی ہے۔

بے جذبہ جنوں تو......

فرید عالم نقشبندی' کریم آباد' کراچی

ہم کہاں کھڑے ہیں' کیا کر رہے ہیں' یہ تو کل کا پاکستان نہیں ہے' جدھر دیکھو افراتفری' نفسانفسی' لوٹ مار' چور بازاری' کرپشن' ملاوٹ' مہنگائی' قتل و غارت گری' دہشت گردی' اغوا' فائرنگ' جلاؤ گھیراؤ' ٹریفک جام' لوڈشیڈنگ کا عذاب' ہر دن' ہر لمحہ دعائیں مانگتے ہوئے گزرتا ہے۔ دلوں میں یہ ڈر و خوف کہ اب جانے کیا ہوگا؟ کوئی پوچھنے' روکنے اور پکارنے والا نہیں' سب اپنی اپنی مستی میں مست ہیں۔ ہمیں مسائل کے انبار تلے دبا کے الجھا دیا گیا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے کہ پاکستان کو خوشنما اور جنت نظیر بنانے کے لیے ہم سب کو تمام گلے شکوے بھلا کے ایک ہونا ہوگا جیسے تسبیح کے دانے۔ ہمیں متحد ہو کر پاکستان کی حفاظت کرنی ہے' ہم سب کو ٹیپو کی آواز' خالد کی للکار اور ان جیسے دوسرے بہادر لوگوں کی طرح ڈر و خوف کو اپنے دل سے نکالنا ہوگا۔ ہم سب کو اتحاد' ایمان' نظم و ضبط' محنت' لگن' محبت' صبر و ہمت سے آگے بڑھ کر دشمنوں پر ایسی کاری ضرب لگانی ہوگی کہ وہ بلبلا اٹھیں اور دشمنوں کی آنے والی اگلی نسلیں بھی یاد رکھیں اور آئندہ پاکستان کو نقصان پہنچانے اور ٹیڑھی نظر سے دیکھنے سے پہلے کئی بار سوچیں۔ اپنا انجام دیکھ کر کانپ اٹھیں اور توبہ توبہ کریں۔ مجھے امید واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا اور عنقریب ناقابلِ تسخیر قوت پاکستان کی صورت اُفق پر چمکے' دمکے گا اور آنے والی قومیں ہماری عظمتوں کے گن گائیں گی اور ہم تاریخ میں زندہ و جاوید رہیں گے۔ انشاء اللہ!

وہ ہمارے بھائی ہیں

تنویر خالد

آج ہمارا ملک نامساعد حالات کا شکار ہے' دھماکے ہو رہے ہیں' ہر طرف بدامنی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ یہ سب القاعدہ یا طالبان کر رہے ہیں۔ ہم سب ہی جانتے ہیں کہ مسجد میں مسلمان نماز پڑھتے ہیں پھر ایک مسلمان یہ کیوں چاہے گا کہ وہ مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے اپنے نمازی بھائیوں کو بم سے اڑا دے؟ جب بھی کوئی بم دھماکہ یا تخریبی کارروائی ہوتی ہے تو میڈیا پر بنا کسی ثبوت کے کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں طالبان تنظیم نے دھماکے کی ذمہ داری قبول کرلی' کبھی کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا جاتا جس سے پتا چلے کہ یہ طالبان نے کروایا ہے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو حقیقی مسلمان طالبان اور القاعدہ والے ہیں۔ ہم تو بس نام کے مسلمان ہیں' کون سی بات ہے ہم میں مسلمانوں والی؟ چوری ہم کرتے ہیں' غیبت ہم کرتے ہیں' زنا ہم کرتے ہیں۔ نماز' روزے کے قریب نہیں جاتے اور وہ لوگ کسی بھی حال میں نماز' روزہ نہیں چھوڑتے۔ اُن کے اصول کچھ سخت ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت

سر ڈھانپ کے رکھے تو اس میں کیا غلط ہے؟ اسلام بھی تو یہی کہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹی وی' فلموں' ڈراموں کو ختم کیا جائے تو یہ بھی کوئی غلط بات نہیں۔ اکثر ہم مووی دیکھ رہے ہوتے ہیں اور مسجد میں اذان ہو رہی ہوتی ہے اور ہم کو پتا بھی نہیں چلتا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ دھماکے صرف مسجدوں اور مزاروں پر ہی کیوں ہوتے ہیں؟ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کوئی دھماکہ کسی مندر یا پھر کسی چرچ میں ہوا ہو۔ دنیا کہتی ہے کہ طالبان اور القاعدہ والے دھماکے کروا رہے ہیں تو تخریبی کارروائیاں مندروں اور چرچوں وغیرہ میں ہوتیں نا کہ مسجدوں اور مزاروں پر۔ عالمی اوباش امریکہ جو ہمارے وطن میں ڈرون حملے کرکے چلا جاتا ہے' اس نے حکومت کو طالبان کے خلاف آپریشن پر مجبور کردیا۔ ادھر اگر پاک آرمی' طالبان کو مارتی ہے' تب بھی مسلمان مرتے ہیں اور اگر طالبان' آرمی کے نوجوانوں کو مارتے ہیں' تب بھی مسلمان ہی مرتے ہیں۔ یہودیوں کی یہ چال کامیاب رہی ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑوا کر ختم کیا جائے۔ ذرا سوچیے' طالبان بھی ہمارے بھائی ہیں' بس ذرا نالاں ہیں ہم سے مگر کیا ہم اپنے ناراض بھائیوں کو منا نہیں سکتے؟ مسلمان ہونے کے ناتے ہم اور وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور جب ایک بھائی ناراض ہو تو دوسرے بھائی کو چاہیے کہ وہ اپنے ناراض بھائی کو راضی کرلے۔

میں کیا ہوں......!

محمد آصف ریاض' ناصر کالونی' جھنگ

میں بھی کیسا عجیب شخص ہوں' میں تو ''میں'' کی وضاحت بھی نہ کرسکا۔ اکثر میرے اندر کا شخص اس قسم کے فقرے یا لفظ بولتا رہتا ہے جیسے شاید' ہاں' نہیں' کیوں' کس لیے' آرزو کیا ہے؟ ہم سکتے ہیں کیوں؟ بھٹکتے ہیں' تڑپتے ہیں' تنہا ہیں' آس کوئی نہیں' پاس کوئی نہیں' ریت اڑ رہی ہے' شہر سنسان ہیں' لوگ کیا ہیں؟ ایسے ہی کئی بے معنی فقرے میرے ذہن میں ابلتے رہتے ہیں۔ میں کس چیز سے دور بھاگتا ہوں' وہ کیا شئے ہے جو مجھے جم کر کھڑا نہیں ہونے دیتی؟ وہ کیا چیز ہے جو مجھے اندر ہی اندر کاٹ رہی ہے؟ ایک کرب کا درخت ہے' جس کے نیچے دل کی بستی' بستی ہے۔ میں سمجھ نہیں سکا' شاید میں چیزوں کی وضاحت چاہتا ہوں کہ وہ ایسی کیوں ہیں جیسی وہ نظر آتی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہوگیا ہے؟ میں کس بھنور میں پھنس گیا ہوں؟ اندھیرے میں ہوں یا شاید زندگی سے ضد کر رہا ہوں۔ مجھے سچائی کی تلاش ہے۔ اس کی حدود کیا ہیں' اس کے اوصاف کیا ہیں' اسے برائی سے کیسے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ آیا سچ کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں؟ کیا سچ محدود ہے؟ ذہن کیا ہے' روح کیا ہے' کیا وہ سچائی ہے یا سچ کی پیداوار ہے؟ ایک وقت تھا مجھے انسانوں سے خوف آتا تھا۔ لوگ میری طرف دیکھتے تو مجھے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ لگتا تھا' ان کی نظریں میرے جسم میں' میرے دماغ میں چھید کر رہی ہیں۔ میں روشنی سے ڈرتا' میں دن کو بہت کم باہر نکلتا' رات کے اندھیرے میں باہر جاتا' لوگوں سے چھپتا مگر اب وہ کیفیت نہیں ہے۔ اب میں کسی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر سمجھ نہیں سکا کہ کیا کہنا چاہتا ہوں۔ ذہن صاف نہیں ہے' ہر چیز غیر مبہم سی' غیر واضح سی نظر آتی ہے۔ میں اظہار کرنا چاہتا ہوں تو ذہن بند سا ہونے لگتا ہے۔ لگتا ہے جیسے ایک دم دیواریں بلند ہوگئی ہیں اور اندھیرا چھا گیا ہے یا کسی منزل پر پہنچے بغیر ختم ہوگیا ہے۔ جب زیادہ کوشش کرتا ہوں تو دیواریں تڑخنے لگتی ہیں' ریت اڑنے لگتی ہے' وحشت ہونے لگتی ہے پھر جی میں آتا ہے کہ ہر چیز کو آگ لگا دی جائے اور پھر راکھ سے پھول اگائے جائیں' سرخ' نیلے' پیلے پھول' گلابی' شہابی' عنابی پھول' ہنستے پھول' مسکراتے پھول' ہر طرف ہری ہری گھاس لگائی جائے' ہر آدمی کے ماتھے پر خوشی کا پھول اگا ہو' بہاروں کی چلمل ہو' سفید چٹی چٹی برف ہو' ٹھنڈی خنک ہوا ہو' پودے جھوم رہے ہوں' آسمان پر دھنک کے رنگ بکھرے ہوں' سمندر آنکھیں' دو جہاں مگر پھر کیا ہو؟

پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار' ادبی ذوق کے آئینہ دار

ڈاکٹر علامہ اقبال' ڈاکٹر حنا عبدالقیوم خان' میر پور خاص
کھلی جس کے نفس سے میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ دان مجھ کو
وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

احمد ندیم قاسمی...... صفیہ تجل شاہ' لاہور
میں مہک بن کے قفس میں بھی پرفشاں ہی رہا
رنگ بن کے مجھے محبوس نہ ہونا آیا

شوکت راز...... فلک خان' کراچی
گو غم زندگی کے مارے ہیں
پر چمکتے ہوئے ستارے ہیں
میری جھولی میں جتنے پتھر ہیں
سب کے سب دوستوں نے مارے ہیں

قتیل شفائی...... ام عادل' کراچی
وہ معجزات کی حد تک پہنچ گیا ہے قتیل
حروف کوئی بھی لکھوں' اُسی کا اسم بنے

ساجد رضا خان...... عائشہ خان' جھنگ
کہیں تو اب نظر آ جا مجھے بھی
تری آواز پر چلتا رہا ہوں

ازور شیرازی...... نور العین' اسلام آباد
تمہیں دیکھا تھا پہلی بار جس دن
مجھے کیا ہو گیا تھا' جانتے ہو؟؟

راؤ افضل گوہر...... مصباح فاطمہ' لاہور
کہیں بھی چوٹ لگے' مضمحل نہیں ہوتے
کہ پتھروں کے تو سینوں میں دل نہیں ہوتے
ہمارے ساتھ ہمارے گھروں میں رہتے ہیں
وہ سانپ جن کے کہیں اپنے بل نہیں ہوتے

حجاب عباسی...... راحت خان' حیدر آباد
اِک آفت میرے پیچھے پڑ گئی ہے
سو حیرت میرے پیچھے پڑ گئی ہے
حصارِ چشم میں رقصاں مسلسل
وہ صورت میرے پیچھے پڑ گئی ہے

کاشی چوہان...... وفا علی' جہلم
میں کسی کو برا نہیں لگتا
برا لگتا ہے بولنا میرا
آپ کا ساتھ مل گیا مجھ کو
وقت اچھا گزر گیا میرا
یاد رکھنا مجھے دُعاؤں میں
بھول جانا مگر پتا میرا

قمر جلالوی...... شہزاد شاہ' کھاریاں
قمر ذرا بھی نہیں تم کو خوفِ رسوائی
چلے ہو چاندنی شب میں انہیں بلانے کو

ساجد رضا خان...... نور خان' جھنگ
میں بھی اک امید لگائے بیٹھا ہوں
پتھر سے انسان بنائے بیٹھا ہوں

ضیاء شاہد...... احمد کمال' گجرات
کوئی مخلص نہیں کسی کے لیے
سب ہیں تیار دشمنی کے لیے
وہ بھی دن آئے کہ لوگ اپنے
گھر جلائیں گے روشنی کے لیے

رسا چغتائی...... عاصم خان نیازی' میانوالی
نام جو بھی ہو' نسب جو بھی ہو
تھا وہ اک شخص عجب جو بھی ہو
رقص جاری رہے' تاروں سے کہو
معرکہ آخرِ شب جو بھی ہو

علی زبیر...... شعبان کھوسہ' کوئٹہ
مری شکست ہی ممکن نہیں حقیقت میں
مری بساط ہے تیرے خیال پر جاناں

عارف شفیق...... ام حبیبہ' اسلام آباد
یہ میرا ظرف کہ ہر بات ہے قبول مجھے
تمہارا شیوہ ہے الزام برملا رکھنا

وصی شاہ...... نعیم اکبر' قصور
آج تو محفلِ یاراں میں پر ہو مغرور بہت
جب کبھی ٹوٹ کے بکھرو گے تو یاد آؤں گا

نوشی گیلانی...... عائشہ نزاکت' ڈسکہ
آنگن میں گھنے پیڑ کے نیچے تری یادیں
میلہ سا لگا دیتی ہیں' اچھا نہیں کرتیں

ناصر کاظمی...... فرحت جہاں' کھوکی
غیرتِ عشق کو قبول نہیں
کہ تجھے بے وفا کہے کوئی

رسا چغتائی...... مسلم خان' باغ
کیا کوئی خواب سجائے میرے
دھوپ میری ہے نہ سائے میرے
وادیٔ خواب میں بسنے والے
خواب تک دیکھ نہ پائے میرے

سحر تاب رومانی...... فردوس علی' شیخو پورہ
رات میری ذات میں کچھ اس قدر تحلیل ہے
دن کے آئینے میں اکثر دیکھتا ہوں رات کو
میرے اندر جاگتی ہے جستجو کی ایک کرن
میں کہاں ہوں اے زمانے' سوچتا ہوں رات کو

احمد فراز...... عمران خان' گلگت
اُس جفا جُو کو دُعا دو کہ اگر وہ نہ رہا
پھر کسی سے ستم ایجاد نہیں ہونے کے

عارف شفیق...... تنویر فاطمہ' کراچی
پھر کسی سے تعلقات بڑھے
پھر کوئی حادثہ نیا ہو گا

ساحر لدھیانوی...... بنتِ عالم شاہ' ایبٹ آباد
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ

بشیر بدر...... جمیلہ وہاب' مظفر گڑھ
یہاں لباس کی قیمت ہے' آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے' شراب کم کر دے

وصی شاہ...... کرن شہزادی' راولپنڈی
یہ اور بات کہ گل کی طرح مہکتے رہے
وگرنہ رکھتے تھے ہم بھی مزاج کانٹوں کا

شکیل بدایونی...... عظمیٰ یونس' میلسی
غیر لوگوں نے کیا ہے میرے سچ کا اعتراف
اپنے لوگوں نے سرِ بازار ہے جھٹلایا مجھے

ضیاء شاہد...... عدنان عبدالرشید' کراچی
کس سے پوچھنے جاؤں میں آخر
وطن میں کیا تماشے ہو رہے ہیں
ستم مہنگائی کے کیا تھے ہم پر
جو اب ہر جا دھماکے ہو رہے ہیں

رسا چغتائی...... جام علی' سبی
کوئی صورت ہو' بدل جاتی ہے
کوئی نشہ ہو' اتر جاتا ہے
دل سے آگے کوئی صحرا ہے نہ باغ
تو دبے پاؤں کدھر جاتا ہے؟

عارف شفیق...... نگہت منیر' اوکاڑہ
پونچھتا ہے آنکھ سے آنسو کوئی بارات میں
اور وہ غمگین سی بیٹھی ہوئی ڈولی میں ہے

فرحت عباس شاہ...... بشرا احمد' راولاکوٹ
ویرانے بھی ہم نے دیکھے چلتے پھرتے
خاموشی بھی باتیں کرتی دیکھی ہے

پروین شاکر...... ثریا فراست' چکوال
نیند آ جائے تو کیا محفلیں برپا دیکھوں
آنکھ کھل جائے تو تنہائی کا صحرا دیکھوں

وصی شاہ...... مقصود بلوچ' دادو
میں سارا دن بہت مصروف رہتا ہوں مگر جونہی
قدم چوکھٹ پر رکھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

منیر نیازی...... سلمان عمرانی' ٹھٹھہ
لائی ہے اب اڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رُت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

غالب...... سید فرحان احمد' کراچی
جان بھی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔ شاعر کے نام کے بغیر شعر شاملِ اشاعت نہیں کیا جائے گا۔
(انچارج) پسند اپنی اپنی

آپ کی خبر

......سفرِ آخرت......

◆ ادبی دنیا کی معروف و معتبر افسانہ نگار حاجرہ مسرور بھی آخرت کی جانب عازمِ سفر ہوگئیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ اُن کے لیے دُعائے مغفرت کریں۔ ہماری بھی دُعا ہے کہ اللہ ربُ العزت انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین!)

◆ معروف شاعر سعد اللہ شاہ اور ثناء اللہ شاہ کی والدہ ماجدہ گزشتہ ماہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

◆ معروف شاعر راشد ترین کی کزن بھی گزشتہ ماہ زمین کا رزق ہوئیں۔ ادارہ اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دُعا کے ساتھ اُن کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

◆ ہماری دوست لکھاری سدرہ انور علی کے کزن عامر شہزاد فاروقی جن کی عمر صرف 25 سال تھی، قضائے الٰہی سے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔ لواحقین میں تین چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو چھوڑ گئے۔ سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف اور پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ اُن کے لیے مغفرت کی دُعا کریں۔

◆ ہماری مستقل قاری کوثر سعید کی کزن گزشتہ ماہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اللہ پاک اُن کے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین!)

◆ ہمارے دوست لکھاری رانا محمد شاہد کی چند دن کی بھانجی 8 اگست کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ ادارہ اُن کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

◆ بچوں کے معروف ادیب اور شعبۂ تعلیم سے وابستہ جانی پہچانی شخصیت پروفیسر ظریف خان گزشتہ دنوں زمین کا رزق ہوئے۔ ادارہ اہلِ خانہ کے لیے صبر کی تلقین کے ساتھ اُن کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دُعا گو ہے۔

......بس دُعا چاہیے......

◆ ہماری دوست لکھاری نزہت جبیں ضیاء کے شوہر پچھلے دنوں اچانک آنتوں کی بیماری کا شکار ہوگئے۔ ہم اُن کی صحت کے لیے دُعا گو ہیں اور قارئین سے ضیاء صاحب کی صحت کی اپیل کی جاتی ہے۔

✡......مبارک سلامت......✡

☆......ہمارے ہردلعزیز لکھاری اور ادارے کے دیرینہ ساتھی اختر شہاب نے ماہِ ستمبر میں اپنی شادی کی سلور جوبلی منائی۔ ادارہ اختر بھائی اور اُن کی فیملی کی صحت، توانائی اور درازیٔ عمر کے لیے دُعا گو ہے۔

☆......ہمارے دوست شاعر اور عشق زاد جیسی اعلیٰ شاعری کے مجموعہ کے خالق ضیاء شاہد کی سالگرہ ۱۴ اگست کو منائی گئی۔ ادارہ ضیاء شاہد کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے دُعا گو ہے۔

......سالگرہ کا دن آیا ہے......

☆......ہمارے دوست لکھاری اور مستقل قاری ایم سعید انور سعید کے بیٹے حافظ عمر فاروق سعید کو 23 اکتوبر اور بیٹی اقصیٰ سعید 26 اکتوبر کو سالگرہ کی بہت بہت مبارک باد۔ اللہ پاک ان کی زندگی میں بہت زیادہ خوشیاں اور کامیابیاں دے۔ (آمین!)

☆......ہماری ہردلعزیز ساتھی رضوانہ کوثر کے بیٹے حسن جمال کو 14 اکتوبر سالگرہ اور شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔ ادارہ حسن کی درازیٔ عمر اور صحت کے لیے دعا گو ہے۔

......اعزاز......

☆......سچی کہانیاں کے قلم کار ارباب قربان علی ایری کو معروف تنظیم پاکستان چلڈرن رائٹرز گائیڈ کی جانب سے اُن کی ادبی، صحافتی، سماجی اور بچوں کے ادب کے فروغ کے لیے خدمات پر ایوارڈ اور سرٹیفکیٹ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ادارہ اس کامیابی پر قربان علی ایری کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

......کتاب خبر......

☆......ہمارے دوست شاعر خالد معین کی خوبصورت شاعری سے سجا چوتھا مجموعۂ کلام ''ناگہاں'' کے نام سے شائع ہو کر ادب کی دنیا میں داد و تحسین سمیٹ رہا ہے۔ ادارہ خالد معین کو اُن کی کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

......مشکل کی گھڑی......

◆ ہماری بہت پیاری رائٹر اور ہمارے ادارے کی دیرینہ ساتھی صفیہ سلطانہ مغل ان دنوں شدید مشکلات کا شکار ہیں۔ حالیہ بارشوں اور سیلاب نے سندھ کے دوسرے شہروں کی طرح جیکب آباد میں بھی تباہی مچائی ہے اور ہزاروں افراد اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ صفیہ بھی ان متاثرین میں شامل ہیں۔ طوفانی بارش نے اُن کے گھر کو شدید نقصان پہنچایا ہے اور وہ نقل مکانی کر کے کراچی آنے پر مجبور ہوگئی ہیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ آزمائش کی اس گھڑی میں خدا اُن کا حامی و ناصر ہو اور جلد از جلد انہیں اس مشکل سے نجات عطا فرمائے۔ (آمین!)

''آپ کی خبر'' کا حصہ بننے کے لیے تمام رائٹرز اور قارئین بلا جھجک اپنی خبریں ادارے کو بھیج سکتے ہیں۔



عذاب

اور جب عذاب خداوندی نازل ہوتا ہے تو گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ بے شمار بے گناہ بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ یہ سیلاب 'عذاب' ہی تو تھا۔ یہ قہر خداوندی کی ایک ہلکی سی جھلک تھی کہ ہم سب راہ راست پر آجائیں لیکن کیا ہم راہ راست پر آگئے؟ کیا ہماری قوم نے برائیوں سے توبہ کرلی؟ کیا ہم نے علاقائی تعصب' رشوت ستانی' جھوٹ' سفارش' ملاوٹ' چور بازاری اور اقربا پروری چھوڑ دی ہے؟ صد حیف کہ ایسا نہیں ہوا۔ ہم تو اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ دوسروں کی تباہی اور بربادی سے بھی اپنے مفاد کی کوئی راہ نکال لیتے ہیں۔ ہم نے سیلاب کو بھی اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ پچھلے دنوں اخبارات میں کچھ ایسی خبریں بھی شائع ہوئیں کہ کچھ بے ضمیر اور بے حس لوگ ''امدادی فنڈ'' بھی اپنی ذات کی تعمیر نو اور اپنے خاندانوں کی ''فلاح و بہبود'' کے لیے استعمال کر رہے ہیں' سیاست کی دکان چمکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ صرف حکومت کا ہی نہیں' ہم سب کا فریضہ ہے کہ امانت میں خیانت نہ ہونے دیں۔ لٹے پٹے اور خانماں برباد لوگوں کی آہ' اللہ تعالیٰ کے عرش کو ہلا دیتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ قہر خداوندی ہمیں نیست و نابود کردے۔ ہم سب کی یہی کوشش ہونا چاہیے کہ اس سیلاب کو تباہ حال لوگوں کے لیے ''عذاب'' میں تبدیل نہ کریں اور حق داروں تک ان کا حق دیانتداری اور ذمے داری کے ساتھ پہنچائیں۔

سہام مرزا مرحوم نے یہ اداریہ سچی کہانیاں میں نومبر 1992ء میں لکھا؟ غور کریں یہ اداریہ موجودہ دور کا عکاس نہیں؟